UNIVERSAL LIBRARY
OU_224357
UNIVERSAL LIBRARY

چناقلی ایکی عسکر

شاہراہ دہلی

(زندگی میں ادب کا حامی)

● مدیر
محمد یوسف
● پرنٹر
منشی عبدالقدیر
● پریس
جید پریس
● سالانہ چندہ
دس روپے

طنز و مزاح نمبر

(عرف راتوں کی نیند حرام کر دینے والا)

فکر تونسوی
(مدیر نہیں مرتب)

قیمت
ع۔ سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت کیا ہے ـــــــ صرف تین روپے

شاہراہ
دلی

طنز و مزاح نمبر کے بعد

اور آگے بڑھتا ہے

افسانہ نمبر

ہندو پاک کے چوٹی کے فن کاروں کی کہانیاں —
— بیس بلند پایہ غیر ملکی افسانے

اور جسے
ملک کے مشہور افسانہ نگار انور عظیم مرتب کرینگے
۲ر نومبر کو آپ کے ہاتھوں میں ہوگا

صفحات ڈھائی صد — قیمت تین روپے

دو اور

عظیم الشان

نمبر

اردو نمبر

جو اردو زبان کی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھے گا. اردو کی نہ مٹنے والی ہستی کا ٹھوس اور بھرپور ثبوت اس نمبر کے مطالعہ سے ملے گا.
وہ نمبر جو کئی نسلوں کی آوازِ پا سنائے گا اور جسے ملک کے مشہور فن کار سردار جعفری مرتب کریں گے۔

۲ر فروری کو ہر بک سٹال سے ملے گا

صفحات ساڑھے پانچ صد — قیمت پانچ روپے

مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی

ترتیب

اور مرتب نے کہا	مُرتب	۵
چند حسینوں کے خطوط	محبوبانِ کرام	۷
گڑ کا مینار	مخمور جالندھری	۹
گائے گھاس چر رہی ہے	ایک تصویر	۱۵

افسانے، خاکے، مضامین:

انقلاب پرستوں کیلئے	برنارڈ شا	۱۶
طنز خطرناک مشغلہ ہے	رشید احمد صدیقی	۱۹
ریڈیو کیلئے کس طرح لکھا ہو	کنھیالال کپور	۲۱
عقل کی ہجرت	ظہور نظر، محمد خالد اختر چغتائی اور.....	۲۵
مالک مکان کا قتل	لی کاک	۳۶
بی آزادی کی کہانی	اودھ پنچ	۳۹
قلم گھسیٹ	اُپیندر ناتھ اشک	۴۱
دانتوں کا بیمہ	زوشنکی	۴۷
ادب کی مارکیٹ	موھن راکیش	۴۹
غزل ہوئی ہے	کاہ ٹوات	۶۰
صحبتِ ناجنس	امجد حسین	۶۱
ماڈرن آرٹ	دیوبند راسّر	۶۵
باادب تبسم	لطیفے	۷۱
پہیل والے	مجید لاہوری	۷۲
معلوماتی قاعدہ	محمد خالد اختر	۷۵
دیوتا کا دان	رحیم بخش	۸۲
صحرا میں شگوفے	میرزا عصمت اللہ بیگ	۸۵
اُستاد بنئے	بلدیو کرشن وید	۸۹
غیر ملکی لطیفے	(انتخاب)	۹۲
ضلع جگت	عصمت اللہ بیگ	۹۵
اک باپ کے دو بیٹے	ژاں پال سارترے	۹۷
دکھیا سب سنسار	پرکاش پنڈت	۱۱۵
ذرا عہد رفتہ	حافظ علی بہادر	۱۱۸
چچا چھکن نے تصویر ٹانگی	قدسیہ زیدی	۱۲۲
گاؤں کی سیر	اے حمید	۱۳۱
پیارے غیر ملکی ادیب	کیدار ناتھ	۱۳۸
نفسی اور بکری	فکر تونسوی	۱۴۱

یکے از سامعین	نعیمہ شوکت	۱۴۸
وہ زمانے لد گئے	ھری چند اختر	۱۵۲
سادھی بھائی رام سنگھ	بھیشم ساھنی	۱۵۵
فنڈ مطلوب ہیں	فرقت کاکوروی	۱۶۱
پالیسی کا فیصلہ	جگدیش چندر	۱۶۵
خدا چھٹی پہ	دیویندر سنگھ	۱۷۰
خطائے بزرگاں	(منتخبات)	۱۷۲

● نظمیں، غزلیں

فراق کی رباعیاں	فراق گورکھپوری	۱۷۵
اے کراچی	سید محمد جعفری	۱۷۷
سوچنے کی بات	شاد عارفی	۱۷۹
تاثر نظلہ	نذیر بنارسی	۱۸۰
غالب کی غزل (پیروڈی)	زبیر قریشی	۱۸۱
شام عمل	سلام مچھلی شہری	۱۸۲
نیویارک جانے والے	مجید لاہوری	۱۸۴
مسدس حالی	افضل پرویز	۱۸۶
انتخابی تقریر	افضل پرویز	۱۸۷
عرش فرش	سید ضمیر جعفری	۱۸۸
ادب برائے فحاشی	قیصر زیدی	۱۸۹
گداگر	تاجو رساھری	۱۹۰
نوکری کا کانسٹی ٹیوشن	مرزا عصمت اللہ بیگ	۱۹۱
افلاک	اظہار ملیح آبادی	۱۹۲
عاشق کی فریاد	پریم وار برٹنی	۱۹۴
بڑا اندھیر ہے	قتیل کاشی پوری	۱۹۶
ملاحظہ ہو	فرقت کاکوروی	۱۹۵
ارے دیکھ اماں دیکھ	نیاز حیدر	۱۹۷
آئی لو اردو	اشک امرتسری	۱۹۹
بانگ درا	سرشار صدیقی	۲۰۰
کافی ہاؤس	حمایت علی شاعر	۲۰۰
کہ اکبر نام لیتا ہے	(منتخبات اکبر)	۲۰۱
شعر آشوب	ظریف لکھنوی	۲۰۳
غزل	〃	۲۰۶
غزل	احمق پھپھوندوی	۲۰۷
اودھ پنچ کی غزل نمک پارے		۲۰۸
طنز کا کردار	شکیل الرحمان	۲۰۹
فرحت اللہ بیگ	متین سروش	۲۱۷
فرحت اپنے گھر میں	علی احمد	۲۲۶
طنز کیا ہے	رفیع اللہ خاں عنایتی	۲۲۹
اودھ پنچ	وزیر آغا	۲۳۲
اردو ادب میں طنز	شجاعت علی سندیلوی	۲۳۴

● انتظاریہ

سومناتھ کا دربار	نمک پاش	۲۳۶
دو المناک حادثے	مدیر	۲۳۷

اشتہارات ـــــ ۲۳۸ تا ۲۴۴

اور مرتّب نے کہا!

چند رسمی فقرے

شاہراہ کا طنز و مزاح نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اچھا ہے یا بُرا۔ مرتّب اس کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہے۔ قارئین ہی سب سے بڑی کسوٹی ہیں۔ ورنہ من آنم کہ من دانم۔ ہم نے اپنی طرف سے تو ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اسے طنزیہ ادب کا ایک حسین اور معیاری گلدستہ بنانے کی کوشش کی۔ اگر یہ کوشش کامیاب ہوئی ہے۔ تو اس کا سہرا نمبر میں شمولیت فرمانے والے فن کاروں کے سر پہ ہے۔ مرتّب کے سر پہ نہیں۔ اور اگر یہ کوشش ناکامیاب ہے تو اس کا الزام نمبر مرتب کرنے والے کے سر پہ ہے۔ فن کاروں کے سر پہ نہیں (ویسے قارئین جس کے سر پہ چاہیں، رکھ دیں وہ سب سے بڑی کسوٹی ہیں)

بہر کیف مرتب عرض کرنا چاہتا ہے کہ ع۔ گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

چند سنجیدہ فقرے

جن دنوں مشہور ادبی ماہنامہ "ساقی" دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اُن دنوں برادرم شاہد احمد صاحب مدیر "ساقی" نے یہ روایت قائم کر دی تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً "ساقی" کا "طنز و مزاح نمبر" نکالا کرتے تھے تقسیم ہند کے بعد جب "ساقی" کراچی چلا گیا۔ تو یہ بہترین ادبی روایت بے کسی کا شکار ہوگئی یہاں تک کہ خود شاہد صاحب نے بھی اپنی اس "تخلیقی روایت" کا ساتھ چھوڑ دیا۔

میں اس روایت کو ایک بار پھر دہلی کے ادبی قبرستان میں سے اٹھا کر زندہ کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ شاہراہ کے مالک اور مدیر جناب محمد یوسف اور میں نے ایک دن یہ فیصلہ کر لیا کہ شاہراہ کا طنز و مزاح نمبر نکالا ہی جائے گا۔

چنانچہ میں نے اپنے محترم اور مخلص ساتھی مخمور جالندھری کے مشوروں کے ساتھ ایک پلان مرتّب کیا اور کام کا آغاز کر دیا گیا۔ یہ آغاز جوں جوں انجام کی طرف بڑھتا گیا مجھ میں اپنے پلان کی "فلک بوسی" پر ندامت کا احساس بڑھتا گیا۔ اس ندامت کی وجہ نہیں تھی بلکہ وجوہ تھیں۔ ایک تو، دو زبان کا ماہنامہ، اس پر ادبی ماہنامہ، اس پر ترقی پسند ادبی ماہنامہ اور ان سب کے نہلے پہ دہلا یہ کہ طنز و مزاح نمبر ــــ ؟ مئی جون کی جھلسا دینے والی تو اور تپش اور جلن سے تو سارے پلان کے پسینے ہی چھوٹ گئے اور میں نے مالک "شاہراہ" کو مشورہ دیا کہ طنز و مزاح نمبر کی بجائے کیوں نہ "جاسوسی پنجہ نمبر" نکالا جائے (اور ایک مرتبہ تو مالک شاہراہ واقعی آمادہ بھی ہو گئے تھے)

ادیبوں کی معاشی اور اقتصادی تنگدستی کوئی نیا انکشاف نہیں ہے اور نہ اُردو کے ادبی ماہناموں کی بے چارگی کسی حیرت میں ڈالتی ہے لیکن یہ دونوں ٹھوس حقیقتیں بھی ہیں اور گذشتہ دو تین سالوں سے تو ادبی تحریک میں بحُران اور جمود کی ایک اور ٹھوس حقیقت بھی شریک بزم ہوگئی ہے۔ اہل حوصلہ و ہمت کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ان تینوں مشکلات کو پامردی سے عبور کرنا ہے۔ مگر مجھے اس لفظ "پامردی" پہ تھوڑا سا شک ہے کیونکہ اب تو یہ لفظ "تکلف محض بن کر رہ گیا ہے اور اس میں وہ حرکت و حرارت نہیں رہی، جو اس کا کردار تھا۔ اور ویسے بھی حرکت و حرارت الفاظ میں نہیں ہوتی بلکہ الفاظ کے استعمال میں ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ملک بھر میں کسی ادبی تحریک کا وجود نہیں ملتا۔ وجود تو ایک طرف ابھی کسی آنے والی تحریک کے خد و خال تک واضح نہیں۔ ایسے عالم میں نہ تو ادیبوں کی اقتصادی تنگ دستی کو کوئی راہِ فرار مل سکتی ہے اور نہ ادبی ماہناموں کا رونا دھونا ختم ہو سکتا ہے۔

اور انہی حالات میں یہ طنز و مزاح نمبر پیش کیا جا رہا ہے۔ شاید یہ پیش کش بذاتِ خود ان حالات پر ایک طنز کی شکل ثابت ہو مجھے ان ادیب ساتھیوں سے کوئی شکوہ نہیں جو بیمار تھے، فلم بنا رہے تھے، فلم میں گھاٹا اٹھا چکے تھے۔ کالجوں کے نوٹس لکھنے اور پرچے دیکھنے میں مصروف تھے، اخبارات کی چکی میں پس رہے تھے، ریڈیو کے لئے لکھنے پر مامور تھے، بیکاری کا لقمہ بنے ہوئے تھے، سرکاری دفتروں کی فائلوں میں دھنسے ہوئے تھے، کلچرل ڈیلی گیشنوں میں جا رہے تھے اور ان پرچوں کے لئے لکھنے پر مجبور ہو رہے تھے جو اُن کی تھوڑی بہت اقتصادی پریشانیوں کو دُور کرنے میں تعاون دے رہے تھے۔ ہم متوسط طبقے کے ادیبوں کے لئے روٹی کی جدوجہد اتنی سخت اور کربناک ہو گئی ہے کہ وہ بھی اسی وسیع کڑی جدوجہد کا ایک واضح حصّہ بن گئی ہے جو ملک بھر کے عوام اپنی اقتصادی بہبودی کے لئے کر رہے ہیں ـــــ اس لئے شکوہ کرنا صرف جذباتیت کو تسکین دینا ہے۔

مگر اس کے باوجود شاہراہ کے طنز و مزاح نمبر کے لئے کئی ادیب ساتھیوں نے تعاون دیا۔ روٹی کی جدوجہد کے سنگین اور حوصلہ شکن لمحوں میں سے سر اُبھار کر انھوں نے نمبر کے لئے اپنی چیزیں لکھیں۔ اور میں اُن سب ادیب دوستوں کا ممنون ہوں جنھوں نے اس ادبی فریضہ کی تکمیل میں ہاتھ بڑایا۔ اور مجھے اس قابل بنایا کہ اڑھائی صد صفحات کا ایک ضخیم اور خوبصورت اور جامع نمبر پیش کر سکوں۔

چند اور سنجیدہ فقرے اس نمبر کی ترتیب کے سلسلہ میں ایک چیز مجھے بار بار کھٹکتی رہی کہ ہمارے فن کاروں نے طنز و مزاح کی سماجی ضرورت اور ادبی اہمیت سے قدرے بے اعتنائی برتنے کا موڈ اختیار کیا ہوا ہے ایک باقاعدہ ادبی صنف کے طور پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اودھ پنچ سکول نے اسے باقاعدہ تحریک بنا دیا تھا۔ اس کے بعد تین بہت بڑے نام فرحت اللہ بیگ اور عظیم بیگ چغتائی، رشید احمد صدیقی کے نظر آتے ہیں، پطرس بخاری تو بس ایک قاتل کٹار قسم کی جھلک دکھا کر سیاسیات میں کھو گئے۔ لے دے کے کنہیا لال کپور کا دم غنیمت ہے جو اپنی بوجھل گرہستی زندگی کے نیچے دبا رہنے کے باوجود کبھی کبھی ایسی چیزیں لکھ دیتا ہے جو چونکا دیتی ہیں اور اس کے بعد نئی پود کے طنز نگار ہیں (مزاح نگار کم ہیں) جو اپنے بزرگوں کی روایات کی روشنی اور اپنے جدید تجربوں اور نئے لب و لہجہ کی چنگاریوں کے ساتھ میدان میں آ رہے ہیں۔ ان چنگاریوں کو شعلہ بننے کے لئے جن آندھیوں کی ضرورت ہے۔ ان کا ابھی انتظار ہے۔ لیکن یہ نمبر مرتب کرتے وقت مجھے اکثر یہ محسوس ہوا کہ نئے طنز نگاروں میں ایک تڑپ اور خلش تو موجود ہے مگر طنز کی صنف کو ایک سماجی اور ادبی ضرورت کی تحریک بنانے کے لئے کوئی باقاعدہ (یا بے قاعدہ ہی سہی) کوشش نہیں کی جا رہی۔ اس سلسلہ میں بڑے طنز نگاروں اور ادبی نقادوں پر آسانی سے الزام لگایا جا سکتا ہے جو طنز و مزاح کو واقعی ایک مضبوط اور موثر سماجی ہتھیار سمجھتے ہیں۔ اس بے اعتنائی کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے طنز اور مزاح نگار اپنے موضوع کے انتخاب میں ایک چھوٹے سے خول میں سمٹتے جا رہے ہیں۔ مثلاً عام طور پر میں دیکھتا ہوں کہ وہ اپنا موضوع صرف ادبی مسائل کے مضحکہ خیز پہلوؤں میں سے ڈھونڈتے ہیں۔ حالانکہ سماج ایک وسیع اور بھرپور ادارہ ہے اور ادبی مسائل کے ستاروں سے آگے بھی کچھ جہاں بستے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصل جہاں تو آگے ہی بستے ہیں۔ طنز و مزاح کو اگر واقعی ایک موثر سماجی ہتھیار بنانا ہے تو اس کے موضوع سماج کے گوناگوں مسائل میں سے ہی تلاش کرنے چاہئیں اور صرف ادبی مسائل کو طنز کا نشانہ بنانے کی "تن آسانی" سے آگے بڑھنا چاہیئے۔ (اپدیش ناگوار ہے مگر مجبوری ہے)

ـــــ فکر تونسوی

چند حسینوں کے خطوط

حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

مطمئن رہو

پیارے فکر بے فکر رہو۔ تمھارے لئے مضمون ضرور لکھوں گا۔ نفسِ مضمون سوچ رکھا ہے۔ نفسِ امارہ سے فرصت ملے تو لغا نفسی کے عالم میں بھی لکھ ڈالوں اور بقول شاعر کہہ ڈالوں۔

میں گذشتہ دنوں دلی میں ہی نہیں تھا۔ نہ بمبئی میں۔ لکھنؤ گیا ہوا تھا۔ اب ۱۰ ر کو ایک روز کے لئے علی گڈھ جاؤں گا۔ پھر ۱۶ ر سے ۲۰ ر تک آگرہ۔ مطمئن رہو۔ مضمون ضرور لکھا جائے گا اور ذرا محنت سے سنوارا جائے گا۔

تمھارا :۔ کرشن چندر

مضامینِ غیب

برادم فکر صاحب، آداب

گرامی نامہ ملا۔ شاہراہ کے طنز و مزاح نمبر کے لئے جون کے اواخر تک میں یقیناً کچھ لکھ بھیجوں گا۔ میں نے اپنے دوستوں سے وعدہ کیا تھا۔ ہر مہینے کچھ نہ کچھ لکھا کروں گا لیکن "گرم کوٹ" کی کمرشل ناکامیابی نے میرا سارا پروگرام تحس نحس کر دیا ہے۔ کچھ پیسے ہو جاتے تو اچھی تصویر دینے کے علاوہ تھوڑا سا سکون حاصل ہو جاتا اور میں پورے زور سے ادب کی طرف رجوع کرتا۔ بہرحال ناساعد حالات سے نبرد آزما ہوں۔

آپ خوب لکھ رہے ہیں۔ میں نے آپ کی بہت سی چیزیں پڑھی ہیں۔ اس طنز و مزاح کو سنبھالے رہیئے۔ وہی بے فکرا انداز وہی 'دھونسوی' اسٹائل۔ مجھے اور میرے دوستوں کو بہت پسند ہے۔ میری رہنمائی میں انھوں نے آپ کا نام بے فکر دھونسوی رکھنے کی جسارت کی ہے۔

اُمید ہے اس کا آپ بُرا نہیں منائیں گے۔ سیدھے سیدھے کسی کا نام یاد نہیں رہتا۔ میرے دوستوں کو اس لئے یہ جوڑ توڑ کرنا پڑتا ہے تاکہ یاد رہے اور بوقت ضرورت کام بھی آئے۔ مثلاً کیفی اعظمی کتنا مشکل نام ہے۔ میرے ایک دوست کو یاد نہیں رہتا تھا۔ اس لئے میں نے اس سے کہا کہ تم کچھ اس طریقے سے نام یاد رکھا کرو "کیفی اعظمی" کے لئے "کافی آدمی"، "کرشن چندر" کا نام "کرشچن سالٹ" کی مناسبت سے۔ وعلیٰ ہذالقیاس۔ کہیئے تو اس موضوع پر خامہ فرسائی کروں۔ ورنہ "غیب" بھی بہت ہے اور "مضامین" بھی بہت!

آپ کا :۔ راجندر سنگھ بیدی

انفرادی جمود

مجی فکر صاحب۔ تسلیم۔

دو خط ملے۔ اگر محض بہانے اور واقعہ میں فرق ہو تو واقعہ یہ ہے کہ میری صحت خراب ہے اور مجھ سے لکھنے کا کام بالکل نہیں ہو رہا ہے ورنہ آپ کا کام سر آنکھوں سے بجا لاتا۔ میں مدت سے معدے کی تکالیف کا شکار ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جس کا معدہ خراب ہو وہ دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا اور کچھ کرتا ہے

کچھ عجیب عالم ہے۔ کم سے کم میں تو اس قدر کاہل اور بددل رہتا ہوں کہ لکھنا سب سے بڑی اذیت معلوم ہوتا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ادھر دو سال کے وقفے کے بعد چار چھ مضامین ادھر ادھر لکھے، کچھ بے کار ہیں کچھ کے۔ لئے محنت کی تو اندازہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لئے خاموش رہنا چاہئے۔ یہ جمود انفرادی ہے اس کا ادب کی رفتار سے کوئی تعلق نہیں۔ مخلص:۔ احتشام حسین

نمبر کب چھپے گا؟

برادرم تسلیم!

آپ کا ۱۶ر مارچ کا لکھا ہوا خط ملا۔ 'شاہراہ' کا طنز و مزاح نمبر کب نکال رہے ہیں؟ میں پچھلے دو تین مہینوں سے متواتر دورے پر رہا ہوں۔ ان دنوں دورے پر اکٹھے کئے ہوئے NOTES پر کام کر رہا ہوں: دفتری کام)

اگر اس نمبر کی اشاعت میں کچھ دیر ہے تو ضرور کوئی مزاحیہ چیز بھیجوں گا۔ ابھی تین چار ہفتے تو کلرکی میں گزاریں گے۔ اس کے بعد لکھنا شروع کروں گا۔ آپ یہ ضرور تحریر فرمایئے کہ نمبر کب چھپے گا۔ شفیق الرحمٰن

ہم غریب یونیورسٹی والے

فکر صاحب! بھئی آپ تو عورتوں کی سی باتیں کرتے ہیں یعنی میری سنتے نہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ حضرت جس طرح ڈاکٹر وبائی امراض میں، مولوی اور پنڈت شادیوں میں اور لیڈر لوگ افتتاح۔ نمائش اور جشن و جلوس میں گرفتار رہتے ہیں۔ اسی طرح کبھی کبھی ہم غریب یونیورسٹی والے امتحانات کی کاپیوں کے عذاب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سے چھٹکارا ملے تو کوئی کام کی بات سوجھے۔ مضمون تو لکھوں گا لیکن مئی میں نہیں بلکہ جون میں۔ اگر طنز و ظرافت نمبر میں نہ نکل سکا تو مرثیہ نمبر میں سہی۔ بہر حال کہیں نہ کہیں کھپ ہی جائے گا۔ کیوں بھئی کیوں کر مضمون کیوں نہ رہے۔ آل احمد سرور

انکار ممکن نہیں

تمہارا خط ملا۔ تم سے انکار تو ممکن نہیں۔ لہٰذا جلد کوشش کروں گا۔ فی الحال بیمار ہوں۔ تین چار دن تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔

طنز کی نوعیت کیا ہو۔ سوال نمبر کا وضاحت کرتے تو بات تھی۔ تم تو روایتی باتیں لے بیٹھے۔ اب تمہیں عقل کیسے سکھاؤں۔ یہاں نہ سکھا سکا وہاں کیسے سکھاؤں۔ میں وہی ممتاز ہوں۔ وہی خادم وہی کڑواہٹ وہی مٹھاس۔ جو تم جانتے ہو۔ تمہارا:۔ ممتاز مفتی

یاد دہانی کرا دینا

بھائی فکر! تمہارا خط بہت دن بعد ملا۔ تمہارے لئے ایک نہیں دو مضمون لکھوں گا۔ شاہراہ میں یہ نوٹ پڑھ کر کہ تم اس کا خاص نمبر مرتب کرو گے میں نے یہ خود بخود طے کر لیا تھا۔ اب ایک بار تم یاد دہانی ضرور کرا دینا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے بات بھول جائے گی بلکہ اس لئے کہ فوری تحریک کے لئے یہ ضروری ہے۔ میں نے ابھی مضمون کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تمہارا:۔ ابن انشا

قیامت کی گرمی

برادرم فکر صاحب! آپ کا گرامی نامہ ملا۔ میں بہت شرمندہ ہوں کہ اب تک آپ کے لئے مضمون نہ لکھ سکا۔ پچھلے دنوں طبیعت کچھ اچاٹ سی رہی۔ لکھنے پڑھنے کے کاموں میں جی نہیں لگتا۔ یہ بات بھی مجھے یاد نہیں رہی کہ کس موضوع پر آپ کے لئے مضمون لکھنا تھا۔ غالباً آپ نے اردو طنز و مزاح کی ارتقائی کیفیت کا جائزہ لینے کے لئے کہا تھا۔ بھائی یہ موضوع بہت طویل ہے۔ اگر اس قیامت کی گرمی میں اسی موضوع پر میں نے لکھنا شروع کیا تو میرا "وصال" ہو جائے گا۔ اس موضوع کو محدود کر دیجئے یعنی اگر میں صرف طنز و مزاح کے جدید دور پر لکھ دوں تو مناسب ہے آپ مجھے اس سلسلے میں اپنی رائے سے فوراً مطلع فرمایئے۔

عبادت بریلوی

شریفانہ معاہدہ

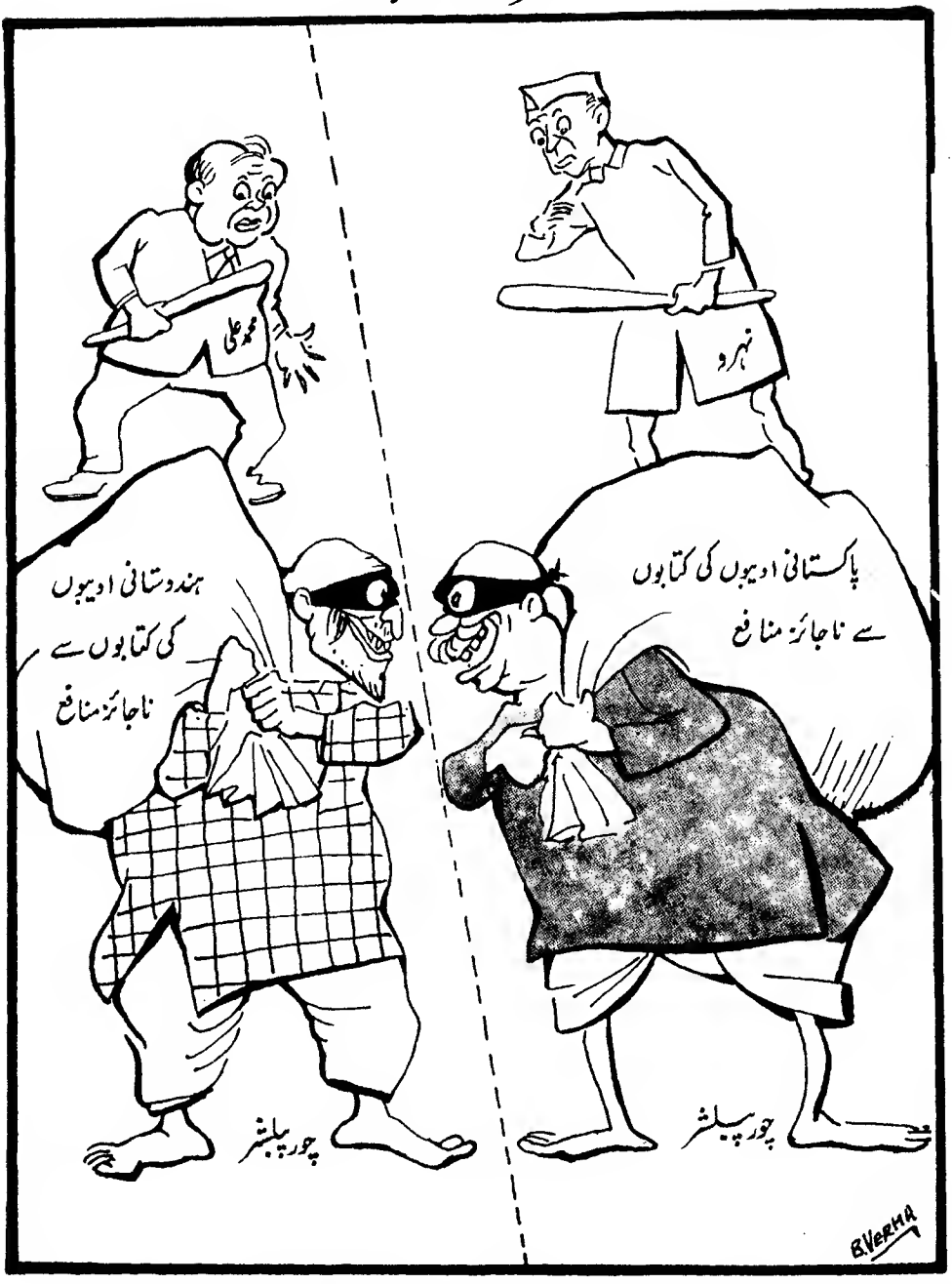

آج کل ہندوستان اور پاکستان کے بعض پبلشرز دونوں ممالک کے ادیبوں کی کتابیں بغیر رائلٹی دیئے چھاپ رہے ہیں

ادب برائے حکومت

حکومت ہند اپنے سرکاری مقاصد کے لئے "ادب برائے حکومت" کی ایک نئی تحریک کو پروان چڑھا رہی ہے۔

ایک پیروڈی

سردار جعفری

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی
آدمی بھی محنت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
روح و دل کی تنہائی
اک طویل سناٹا
جیسے سانپ لہرائے
ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں

جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گزر جائے

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رَو سُبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریخیں
روز و شب کی راہوں پر
ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے
زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں

مخمور جالندھری

گڑ کا مینار

کیا بتاؤں ہنڈیا ہے
یا کوئی کڑھائی ہے
دال ہے کہ ترکاری
سوجھتا نہیں کچھ بھی
مغز بھی ہیں پائے بھی
پیاز بھی ہے ہلدی بھی
خادمہ کے ہاتھوں میں
لہسن اور آلو بھی
پھر بھی اک تذبذب ہے
گول گول ہنڈیا میں
ایک حشر برپا ہے
جیسے دیو بھنّائے
چند اُبال آتے ہیں
یا کے جن کی بُو، بِل سے
چیونٹیاں نکلتی ہیں
جیسے میلی گودڑ میں
کچھ جوئیں ٹہلتی ہیں۔

بلبلے ہیں ہنڈیا کے
سینہ کوبِ دیوانے
گلتی دال کے دانے
بے صدا سے گھنگرو ہیں
چیونٹیوں کے گچھے ہیں
فرش کے کناروں پر
ننھی منی آنکھوں سے
ڈھونڈتی ہیں شیرینی
اور گڑ نہیں ملتا
میٹھی میٹھی سب اشیاء

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سسکتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
پھر بھی اک اندھیرا ہے
جیسے ریت میں گر کر
بوند جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سینکڑوں خراشیں ہیں

پتھروں کی دیواریں
بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
ان کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا!

پتھروں کی دیواریں
بھوک کا بھیانک دیپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر

بند ہیں کنستر میں
دیگچی کے ڈھکن سے
بھاپ سرسراتی ہے
آگ ہے کہ چولھے میں
حور مسکراتی ہے
شوربہ گرجتا ہے
دال گنگناتی ہے
دیگچی کے پیندے سے
زرد جھاگ رستی ہے
جانے اس پہ بھی کیوں ہے
خامشی رسوئی میں
جیسے دُم کٹا چوہا
بل میں جھٹ دبک جائے
فرش کے پپوٹوں پر
خامشی کی بلی نے
اپنے پنجے گاڑے ہیں ا
آہ گڑ کے مینارے
اور پہاڑ چینی کے
بند ہیں جو ڈبوں میں
دلبران کافر ہیں
چیونٹیوں سے عاشق کو
روز و شب ستاتے ہیں
ان کی خوئے دلسوزی
اب بدل نہیں سکتی!
آہ گڑ کے مینارے
خون ہیں تمنا کا
بند ڈبے چینی کے
جن کے قبر سے منہ پر
تالا ہے کہ بچھو ہے
شیلف جس پہ رکھے ہیں
مرگ ناگہانی ہے
کھائے تو کوئی کیا کھائے

شاہراہ

مفلسی برستی ہے
سبزیوں کے زخموں سے

پیپ سی ٹپکتی ہے
پتھروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی زنجیریں
بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی
نیم جان قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں پر
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں
ان کے سخت چہرے پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پہ صرف

بے حسی کی مہریں ہیں
پتھروں کی دیواریں

پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں

دال اپنی رنگت سے
چھپکلی دو مونہی ہے
شوربہ میں مرچیں ہیں
رستے چھالے خواہش کے
آہ گڑھ کے مینارے
چیونٹیاں تڑپتی ہیں
ان کے دکھ کے نقشوں میں
اضطراب کی تہہ ہے
جب لگی رسوئی میں
آرزوؤں کی گڑیا
پٹتی ہے سر اپنا
گڑھ کے بند ڈبوں میں
دل کشی و زیبائی
اونچی اونچی شلیفوں پہ
نغمگی و رعنائی
نارسائی کے منہ سے
رال سی ٹپکتی ہے
احتمال ناکان
ہڈیاں نچوڑے ہے!
آہ گڑھ کے مینارے
بند ہیں جو ڈبوں میں
آہ گڑھ کے یہ ڈبے
جو کھلے نہیں رہتے
جو کبھی نہیں گرتے
جن کی چپٹی صورت پر
زہر خند رہتا ہے
ان کے تیرے منہ پر
بچھو جیسے تالے ہیں
آہ گڑھ کے یہ ڈبے
ٹین ہی کا ڈھکن ہے
ٹین ہی کا پیندہ ہے
ٹین ہی کا سب پیکر

شاہراہ

پتھروں کی پیشانی
پتھروں کی آنکھیں ہیں
پتھروں کے دروازے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجوں میں
آہنی سلاخیں ہیں
اور ان سلاخوں میں
حسرتیں، تمنائیں
آرزوئیں، امیدیں
خواب اور تعبیریں
اشک پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں
دھوپ کی سنہری زلف
بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں

اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پلتا ہے!
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے سے
سرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کے اندھیرے میں
جیسے شمع جلتی ہے
انگلیاں فروزاں ہیں
بارکوں کے کونے سے
سازشیں نکلتی ہیں
خامشی کی نبضوں میں

ٹین ہی کا ظاہر ہے
ٹین ہی کا باطن ہے
ٹین ہی کی شریانیں
ٹین ہی کا معدہ ہے
ٹین ہی کی مٹھی میں
جرمنی کا تالا ہے!
جرمنی کے تالے ہیں
برفی اور شکرپارے
لڈو، پیٹھا اور پیڑے
کھیر، حلوہ، فیرینی
کیک، پیسٹری، کلفی
یعنی ہر مٹھائی کے
شوق سے بنانے کا
سارا ساماں رکھا ہے
یعنی موٹے تالے میں
چند مور اُمنگوں کے
جوڑے کچھ مرادوں کے
ذبح ہوتے رہتے ہیں
چپ لگی رسوئی میں
غم فزا فضاؤں میں
ساگ پات پکتا ہے!
دیگچی کے پیندے میں
چوبی چمچہ چلتا ہے
چیونٹیوں میں ہلچل ہے
اُن کے پر نکلتے ہیں
ان کے پر ہیں طیارے
بجلیاں سی رقصاں ہیں
چیونٹیاں لپکتی ہیں
شیلف تک پہنچنے کے
آہنی ارادے ہیں
چپ لگی رسوئی میں
طبلِ جنگ بجتا ہے!

شاہراہ

گھنٹیاں سی بجتی ہیں
جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
جگمگاتے ماتھوں پر
خون کی لکیریں ہیں
اشک آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقش پا بغاوت کے
جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنا دکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے
زہر اور چڑھتا ہے
ظالموں کی شدت پر
ظلم چیخ اٹھتا ہے
ان کے لب نہیں ہلتے
ان کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
"انقلاب زندہ باد!"
خاک پاک کے بیٹے

جانے کون سے بل کی
چیونٹیاں ہیں پروردہ
ان کے منہ میں چھالے ہیں
ہڈی ہے نہ پسلی ہے
دھان پان جسموں پر
گرد کے لبادے ہیں
ان کے ننھے ماتھوں پر
داغ ہیں کہ انگارے
چال تیز جھکڑ ہے
ان کے دل کی دھڑکن میں
گولیوں کی تڑتڑ ہے
ان کے ننھے پیروں میں
گوبر اور کوڑا ہے
ان کی چندھی آنکھوں میں
مشعلیں شقاوت کی!

جتنی بار گرتی ہیں
اتنی بار چڑھتی ہیں
جتنی زک اٹھاتی ہیں
اور تلملاتی ہیں
طیش اور آتا ہے
غیظ سر اٹھاتا ہے
اور گڑ کی ڈلی پر
نالہ دل سے اٹھتا ہے
پھر بھی سعی جاری ہے
شیلف تک پہنچنے کی
لیکن آگ پر ہنڈیا
نعرہ اک لگاتی ہے
"دال بھات زندہ باد!"
بیٹیاں بلوں کی ہیں

کھیتیوں کے بھولے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہپر
کوہسار کے شاہیں
پتھروں کی گودوں پہ
آندھیوں کی راہوں پہ
بجلیوں کی بارش میں
گولیوں کے طوفاں میں
سر اٹھائے بیٹھے ہیں

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظام زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیاری
جشنِ عام جمہوری
اقتدار مزدوری
غرقِ آتش و آہن
بے بسی و مجبوری
مفلسی و ناداری
تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آ جائے!

ننھی چیونٹیاں ساری
میٹھا میٹھا کھاتی ہیں
کڑوا کڑوا یہ اپنے
منہ سے کب لگاتی ہیں
بو مٹھاس کی پا کر
ہر طرف سے آتی ہیں
چیونٹیوں کی فطرت ہے
حرص لوبھ اور دھوکا
بس اگر چلے ان کا
سب مٹھاس کھا جائیں

جبل و کمر سوزاں ہے
اب رسولی کا ماحول
جاں بلب ہے دنیا میں
شیطنت کی عیاری
جلوہ طور کا بن کر
آ رہی ہے بیداری
مشرقِ تجلی سے
جنتِ ادب ساری
بھاگ گئے ٹگ بگ ٹٹ
کینہ و دز عیاری
دوستوں سے مکاری
ہمدموں سے غداری
فکر و فن کے سینے پر
نشتروں کی یورش ہے
غیظ میں سخنور ہیں
ہر طرف اجالا ہے
اور اس اجالے میں
اب یہ ہو نہیں سکتا
چیونٹیوں کی یہ ٹولی
گرد تو پھر رہی شئے ہر
دال بھات کھا جائے!"

ایک مشہور یورپین مصوّر کی تصویر

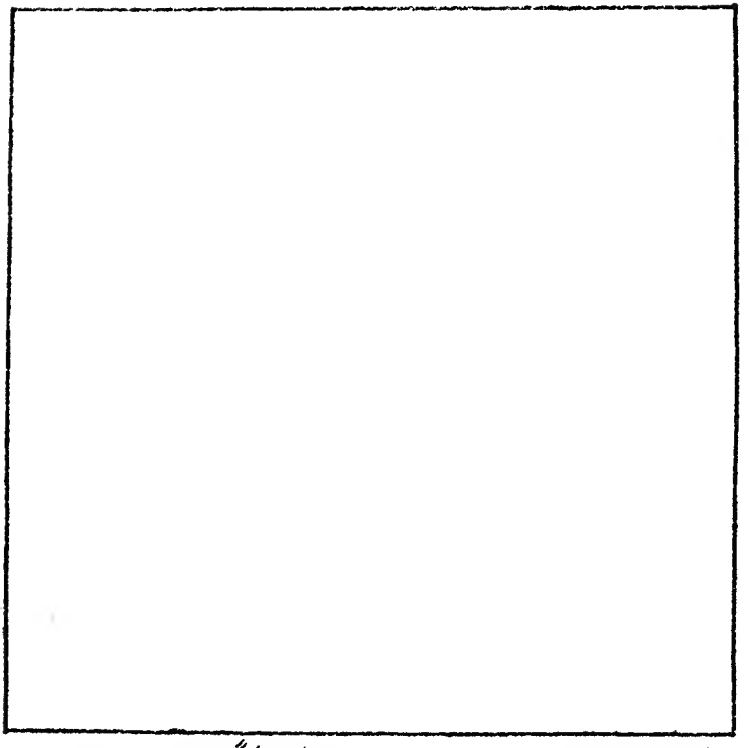

تصویر کا عنوان : _____ گائے گھاس چر رہی ہے

اوپر کی تصویر یورپ کے ایک مشہور و معروف مصور کی ہے۔ یہ مصوّر صاحب مصوری میں سوریئلزم کے بلند پایہ نمائندے ہیں۔ یہ تصویر انھوں نے ایک نمائش میں رکھی تو ایک تماشائی نے پوچھا: "مگر صاحب! اس تصویر میں گھاس کہاں ہے؟"

مصور نے جواب دیا: "اسے تو گائے چر گئی۔"

تماشائی نے پھر پوچھا: "اور گائے کہاں ہے؟"

مصور بولا: "گھاس چر کر چلی گئی۔ یہاں کیا کرتی؟"

_____ اس سلسلہ میں دیوندر آسر کا ایک طنزیہ اندر کے صفحات میں ملاحظہ فرمایئے _____

"انقلاب پرستوں" کے لئے

برنارڈ شا ● زرّیں اقوال

——— یہ برنارڈ شا ہے۔ دنیا بھر کا جانا پہچانا۔ وہ جس کے طنز کا وار کبھی اوچھا نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس کا ذہن دانائے راز ہے اس "لغات" میں وہ "انقلاب پرستوں" کے لئے کچھ زریں اقوال پیش کرتا ہے۔ دشمن پر طنز کرنا ہر ایک کے لئے آسان ہے مگر دوست کو نشانہ بنانا صرف شا کا کام ہے ———

سنہری اُصول!

ترغیب کی کبھی مزاحمت نہ کرو۔ ہر چیز کو ثابت کرو، اچھی چیز سے چمٹ جاؤ۔
جتنی تمھیں اپنے سے محبت ہے اتنی اپنے پڑوسی سے محبت نہ کرو۔ اگر تمہاری خود اپنے ساتھ گہری چھنتی ہے تو یہ لاتعلقی ہے اور اگر تمہاری خود اپنے ساتھ نہیں بنتی تو یہ بدسلوکی ہے۔
سُنہری اصول یہی ہے کہ کوئی سنہری اصول نہیں۔

بُت پرستی!

حکومت کا فن بُت پرستی کی تنظیم ہے۔
عوام الناس نوکر شاہی کو نہیں سمجھ سکتے۔ وہ تو قومی بتوں کی پرستش ہی کر سکتے ہیں!
وحشی انسان لکڑی اور پتھروں کے بتوں کے آگے سر جھکاتا ہے اور مہذب انسان گوشت اور خون کے بتوں کے آگے۔
وہ جو بادشاہ کو قتل کرتا ہے اور وہ جو بادشاہ کے لئے جان دے دیتا ہے دونوں بُت پرست ہیں۔

بادشاہت

دربار بادشاہ کی غلام گردش ہے۔
بادشاہ میں یہودہ پن قوم کی اکثریت کو پھسلاتا ہے۔

جمہوریت

جمہوری ریپبلکیں قومی بتوں سے اُسی قدر دامن نہیں چھڑا سکتیں جس قدر بادشاہتیں پبلک کے منصب داروں سے
حکومت صرف ایک ہی مسئلہ پیش کرتی ہے، علم الانسان کے ایک معتبر طریق کار کی دریافت۔

سامراج

تنگ ظرفی کی کثرت ایک برطانوی کو سامراجی بنا دیتی ہے۔

آزادی اور مساوات

کوئی چیز بھی غیر مشروط نہیں ہو سکتی، نتیجتہً کوئی چیز آزاد نہیں ہو سکتی۔
آزادی کا مطلب ذمہ داری ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے آدمی اس سے خوف کھاتے ہیں۔
برتر انسان کے کمتر انسان کے ساتھ رشتہ میں اچھے طور و اطوار شامل نہیں ہوتے۔

تعلیم

اچھی طرح پرورش پائے ہوئے بچے وہ ہیں جنھوں نے اپنے والدین کو اصلی رنگ میں دیکھا ہے۔ ریاکاری والدین کا پہلا فرض نہیں۔
مذموم ترین حمل گرانے والا وہ ہے جو کسی بچہ کے کردار کو ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔
جو آدمی کچھ کر سکتا ہے کچھ کرتا ہے اور جو آدمی کچھ نہیں کر سکتا پڑھاتا ہے۔ ایک عالم و فاضل شخص سست و کاہل ہوتا ہے جو مطالعہ میں وقت ضائع کرتا ہے اس کے بھوٹے علم و دانش سے خبردار رہو یہ لاعلمی سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔
سرگرمی ہی علم و دانش کو جا ملنے والا رستہ ہے۔
جس آدمی کو اپنی زبان پر کامل عبور حاصل ہے وہ دوسری زبان پر کبھی دسترس حاصل نہیں کرتا

شادی

شادی اس لئے مقبول ہے کیونکہ یہ تحریص کی انتہا کو موقع کی انتہا سے ملاتی ہے۔

جرم و سزا

مجرم قانون کے ہاتھوں نہیں مرتے۔ وہ دوسرے آدمیوں کے ہاتھوں مرتے ہیں۔ قاتل زول گاز نے صدر میکلے کو قتل کرنے پر ہیرو بنا دیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے زول گاز کو اسی طریق کار سے ہیرو بنا دیا۔ پھانسی کے تختہ پر قتل تو قتل کی بدترین صورت ہے کیونکہ وہاں سماج کی منظوری سے قتل کیا جاتا ہے۔
جب کوئی آدمی کسی شیر کو قتل کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے شکار کا نام دیتا ہے اور جب شیر اُسے ہلاک کرنا چاہتا ہے تو وہ اسے درندگی کہتا ہے۔ جرم و انصاف میں زیادہ فرق نہیں۔

خطابات

خطابات اوسط درجہ کے انسان کو مشہور بنا دیتے ہیں، برتر انسان کو پریشان کر دیتے ہیں اور کمتر انسان ان کی بے حرمتی کرتے ہیں۔

جائداد

پرودھن نے کہا کہ جائداد چوری ہے۔ اس موضوع پر یہی ایک سچی بالکل سچی بات کہی گئی ہے۔

ملازم

جب گھریلو ملازموں کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کیا جائے تو انھیں ملازم رکھنا فائدہ مند نہیں ہوتا۔
آقا اور ملازم کا رشتہ صرف اُن آقاؤں کے لئے مفید ہوتا ہے جو اپنے اقتدار کا ناجائز فائدہ اٹھانے سے نہیں جھجکتے اور ان ملازموں کے لئے مفید ہوتا ہے جو اپنے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھانے سے نہیں جھجکتے۔
آدمی اس چیز سے لطف اندوز ہوتا ہے جسے وہ استعمال کرتا ہے اور اس چیز سے لطف اندوز نہیں ہوتا جس کے نوکر استعمال کرتے ہیں
غلاموں کی ریاست میں غلام حکومت کرتے ہیں۔ منڈیوں میں تاجر حکومت کرتے ہیں۔

بچوں کو کس طرح پیٹنا چاہیئے

اگر آپ کسی بچہ کو پیٹتے ہیں تو اس بات کی احتیاط کیجئے کہ اُسے غصّے کے عالم میں پیٹیئے، چاہے آپ اس کو عمر بھر کو اپاہج بنانے کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لے لیں۔ سرد مہری اور بد دلی سے لگائی ہوئی ضرب کو نہ بھلایا جا سکتا ہے نہ بھلایا جانا چاہیئے۔

مذہب

اس آدمی سے بچو جس کے خدا آسمان میں ہیں۔

عظمت

عظمت چھوٹے پن کی ہیجان انگیزیوں میں سے صرف ایک ہیجان انگیزی ہے۔
جنت میں ایک فرشتہ خصوصی طور پر کچھ بھی تو نہیں۔
اگر کوئی عظیم انسان، اپنے آپ کو ہمیں سمجھا دے تو ہمیں اس کو پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے۔
احمق قوم میں ذہین آدمی خدا بن جاتا ہے۔ ہر شخص اس کی پرستش کرتا ہے اور اس کی مرضی کی کوئی بات نہیں کرتا۔

حُسن اور مسرّت، آرٹ اور دولت مندی

حماقت حُسن اور مسرّت کی براہِ راست جستجو ہے۔
وہ شخص جو عمر بھر کے لئے ایک حسین عورت کے ساتھ مسرّت کی خواہش کرتا ہے وہ شراب کے مزے سے اپنے مُنہ کو ہر وقت شراب سے بھرا ہوا رکھ کر لطف اٹھانے کی خواہش کرتا ہے۔
سب سے ناقابلِ برداشت تکلیف شدید لطف کو طول دینے سے پیدا ہوتی ہے۔
بدصورت اور دکھی دنیا میں امیر ترین آدمی بدصورتی اور دُکھ کے سوا کچھ بھی نہیں خرید سکتا۔
انیسویں صدی فنونِ لطیفہ میں اعتقاد کا عہد تھی اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

نیک ارادے ۔ جہنم کو بُرے نہیں بلکہ اچھے ارادوں سے بنایا گیا ہے۔

خیرات ۔ جو لوگ افلاس اور بیماری کے مددگار بنتے ہیں وہ بدترین جرائم میں سے دو جرائم میں شریک ہوتے ہیں۔

گھریلو عورت ۔ لڑکی کے لئے گھر جیل خانہ ہے اور عورت کے لئے کارگاہ۔

تہذیب تہذیب ایک ایسا مرض ہے جو شراب اور سڑے ہوئے سازوسامان سے سماجوں کی تعمیر کرنے کی مشق کرنے کے ذریعہ پیدا کیا جاتا ہے۔

طنز خطرناک شغلہ ہے

رشید احمد صدیقی

رخط

محترمی۔ تسلیم

آپ کا اصرار ہے کہ میں طنز و ظرافت پر آپ کے رسالہ کے لئے کچھ حاضر کروں۔ اس سلسلہ میں آپ نے میری کوئی معذرت قبول نہ فرمائی۔ اس میں آپ کا قصور نہیں۔ میری بدنصیبی ہے اور چونکہ بدنصیبی میرا خانگی معاملہ ہے اس لئے اس میں حصہ لینے کی نہ میں آپ کو دعوت دے سکتا ہوں نہ خود اس کو طوالت دینے میں کوئی فائدہ دیکھتا ہوں۔

طنز و ظرافت کا کام میں نے نہ کہیں سیکھا نہ پڑھا۔ بس ایک دن نہ معلوم کیوں اور کیسے علی گڑھ میں یہ کاروبار شروع ہو گیا اور چل نکلا۔ اس میں علی گڑھ کا جو کم و بیش چالیس سال سے میرا اوڑھنا بچھونا رہا ہے بڑا دخل ہے۔ کیوں اور کیسے قصہ کوتہ۔ بڑی کہانی ہے!

میں ذرا غبی واقع ہوا ہوں۔ کتابوں میں جو لکھا ہوتا ہے یا کوئی خدا ترس جو کچھ بتاتا ہے وہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ علی گڑھ نے یہ مشکل اس طرح آسان کر دی کہ جو کچھ میری سمجھ میں آتا اسی کو اس نے اپنی چرخ پر چڑھا کر میرے لئے میرا سہارا بنا دیا۔ روٹی کا بھی رسوائی کا بھی!

طبیعت کی افتاد کے اعتبار سے میں طنز کا آدمی نہیں ہوں۔ طنز کے لئے عام طور پر جس جلن اور جس قسم کے جلال یا جس بیزاری اور برہمی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیئے جس کا مجھے افسوس نہیں ہے۔ میں اپنا کام دوسرے طریقے سے نکال لیتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں ایک حس کی کمی فطرت دوسرے حصہ کو زیادہ فعّال بنا کر پوری کر دیتی ہے۔ ظلم، بے ہودگی اور تنگ نظری پر جو طنز کی محرکات میں سے ہیں مجھے غصہ آتا ہے لیکن اس سے زیادہ ہنسی بعض طنز نگاروں کے ظلم، بے ہودگی اور تنگ نظری پر آتی ہے! آتش کی ایک بڑے معرکہ کی غزل کا شعر ہے۔

آیا تھا بلبلوں کی تدبیریں، گلوں نے
ہنس ہنس کے مار ڈالا صیاد کو چمن میں

ظرافت کے اسرار و رموز کو ذہن میں رکھ کر اس شعر پر غور کیجیے،

طنز بڑا مشکل فن ہے۔ ظرافت اس سے بھی زیادہ۔ اس لئے کہ ظرافت اتنا ہی نازک فن بھی ہے۔ خطرہ کا مقابلہ نسبتاً آسان ہے نزاکت کے مرحلوں سے خیر و خوبی سے گذر جانا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اتنا مشکل کہ خدا ہی آسان کرے تو ہو۔ میں نے خدا کا نام یہاں بشارت کی خاطر نہیں لیا ہے خطرے کے اعلان کے لئے لیا ہے! غم و غصہ میں مقررہ حدود سے تجاوز کر جائیے تو لوگ معاف کر دیتے ہیں۔ عدالت تک معاف کر دیتی ہے! لیکن ظرافت میں ذرا چوک ہو جائے تو کوئی نہیں بخشتا اور اس لئے نہیں بخشتا کہ بخشنے والا خود منہ دکھلانے کے قابل نہیں رہتا۔

فن کوئی ہو اگر اس میں خامی رہ جائے تو خطرہ سے خالی نہیں۔ اپنے لئے بھی دوسروں کے لئے بھی۔ طنز و ظرافت کی وضاحت کرتے ہوئے ایکبار میں نے کہیں کہا تھا کہ ان کی مثال "سفلی علم" سے دی جا سکتی ہے۔ جس میں کہیں خامی رہ جائے تو دشمن کے بجائے خود عامل اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ طنز و ظرافت کی تاریخ اتنی ہی قدیم، طویل اور دلچسپ ہے جتنی کہ انسان کی تاریخ۔ جسے میں یہاں دہرانے پر تیار نہیں۔ آپکے رسالہ کے اس نمبر میں کسی نہ کسی نے یہ فریضہ ضرور ادا کیا ہوگا۔ میں صرف یہ عرض کرونگا کہ طنز حربہ ہے، ظرافت طاقت، طنز بغاوت ہے۔

ظرافت انقلاب!

طنز وظرافت کے اُردو میں کیسے کیسے نمونے ملتے ہیں کس شخص یا عہد کا ان کی ترقی میں کیا حصہ ہے اور طنز وظرافت کا مستقبل کیا ہے ان موضوعات پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن اس طرح کی گفتگو کی ذمہ داری میں نے نہیں لی ہے۔ البتہ طنز وظرافت کے بارے میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ طنز گالی گلوچ نہیں اور ظرافت پھکڑ اور مسخرگی نہیں۔ طنز وظرافت کا کاروبار اس شخص کو ہرگز راس نہ آئے گا۔

جیسے عیش میں یاد خدا نہ رہی   جیسے طیش میں خوف خدا کا نہ رہا

طنز وظرافت اصلی معنوں میں اس قوم و ملک میں فروغ پاتی ہے جو آزاد ہو اور آزادی کو عزیز رکھتی ہو۔ محکوم قوم اور ملک میں ان کے پنپنے کا امکان نہیں۔ جہاں دیوتاؤں اور بادشاہوں کی پرستش ہوگی وہاں کے شعر وادب میں گالی گلوچ، پھکڑ اور مسخرگی تو ممکن ہے مل جائے طنز وظرافت نہ ملے گی۔ آپ پورے ایشیا کے شعر وادب کو دیکھ جائیں (شاید یہ استثناء عرب) آپ کو کوئی قوم یا ملک ایسا نہ ملے گا جہاں طنز کے اچھے نمونے ملتے ہوں اور ظرافت کو بھی شامل کر لیجئے تو عرب کا استثناء بھی باقی نہ رہے گا۔

اس نظریہ کے تحت آپ انگلستان اور دوسرے ممالک کے شعر وادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ طنز وظرافت کے شاید سب سے اچھے اور مکمل نمونے انگریزی شعر وادب میں ملیں گے اس لئے کہ اپنے اوپر ہنسنے اور نکتہ چینی کرنے میں انگریز سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ انگریز شکار، کھیل بالخصوص کرکٹ کے بڑے دلدادہ ہیں۔ یہ ہی سبب ہے کہ ان کے یہاں اسپورٹسمین شپ کا جو تصور رہا ہے یا کرکٹ کا جو مفہوم یہ لیتے ہیں وہ ہم کو کہیں اور نظر نہیں آتا۔ آپ غور فرمائیں تو یہ بھی محسوس ہوگا کہ انگریزوں کی جو یہ قوم بڑے سے بڑا حادثہ آسانی سے جھیل جاتی ہے اور اپنا سر اونچا رکھتی ہے اس کا سبب بھی یہی طنز وظرافت اور اسپورٹسمین شپ ہے۔ یہاں یہ کہنے کی اتنی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اسپورٹسمین شپ اور طنز وظرافت کا ایک دوسرے سے بڑا معنوی تعلق ہے۔

اُردو میں طنز وظرافت کے جتنے اچھے اور بھرپور نمونے ملتے ہیں وہ اس ملک کی دوسری زبانوں میں شاید نہ ملیں۔ اُردو جن زبانوں پر بنی ہے یا ہندوستان، ایران، عرب کے جن زبانوں سے اس کا قریب یا دور کا واسطہ ہے اُن میں بھی طنز وظرافت کے ایسے نمونے نہ ملیں گے جیسے کہ اُردو میں ملتے ہیں۔ اس کے بے شمار اسباب ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ اردو میں یہ بات غزل سے آئی ہے جو اور باتوں کے علاوہ بات کہنے کی میزان یا معیار بھی ہے۔ کون سی بات کب کہی جائے۔ کتنی کہی جائے اور کیسے کہی جائے۔ یہ غزل بتاتی ہے۔ طنز وظرافت میں اس طرح کے میزان و معیار کی اہمیت مسلّم ہے!

آخر میں ایک بات اور کہنی ہے وہ یہ کہ طنز وظرافت بڑا دلچسپ بڑا نازک اور بڑا خطرناک مشغلہ ہے۔ اس لئے کہ یہ ہماری زندگی اور شعر وادب کا اتنا ہی اہم مسئلہ بھی ہے جیسے مثلاً جنس کا مسئلہ جو ہماری زندگی اور شعر وادب میں ہمیشہ سے ذلیل جیتا آتا ہے اب آپ ہی اندازہ فرما لیجئے دونوں (طنز وظرافت اور جنسیات) کو اچھے اور اعلیٰ شعر وادب میں ڈھالنے میں فن کار کو کیسی کیسی اُفتاد سے کہاں کہاں سابقہ پڑتا ہے اور کہیں کوئی چوک ہو جائے تو کیا انجام ہوتا ہے!

●

خدا اور شیطان

ایک دفعہ پرانے جوش صاحب اور پرانے جگر صاحب ایک ہی تانگے میں کہیں جا رہے تھے اور دونوں عالم سرور کی سیر میں مصروف تھے اتفاقاً جگر صاحب نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا یا اللہ۔

جوش صاحب نے اپنے مخصوص ظرافت آمیز لہجہ میں کہا "کیا مجھ کو پکارا؟" — جگر نے بے ساختہ جواب دیا۔ "پھر شیطان بیچ میں آگیا۔"

میں ریڈیو کیلئے کس طرح لکھتا ہوں

کنھیا لال کپور

عینی شاہدہ

پیارے فکر! ایک مضمون (خدا جانے یہ مضمون ہے یا کیا بلا ہے؟) بھجوا رہا ہوں۔ اسے غنیمت سمجھ کر چھاپ دیجیئے۔ میں نے واقعی مضمون بھجوانے میں تاخیر کا جرم کیا۔ مگر تم میرے جرمِ گناہ بخش دینا۔ نہیں تو روزِ حشر تم سے منہ سے چھپاتا رہوں گا اور ملاقات وہاں بھی نہیں ہو سکے گی۔ تمہارا کپور

میں ریڈیو کے لئے کس طرح لکھتا ہوں؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح آپ لکھتے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ آپ ریڈیو کے لئے نہ لکھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ہی بتانا پڑے گا۔ تو لیجیئے میں ریڈیو کے لئے بالکل اسی طرح ہی لکھتا ہوں جس طرح مجھے ریڈیو والے لکھنے کے لئے کہتے ہیں۔ نکتہ اس انکشاف میں یہ ہے کہ جب تک ریڈیو والے آپ سے لکھنے کے لئے نہ کہیں آپ ریڈیو کے لئے لکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ ترقی پسند ادیب ہیں، چین یا روس کی سیاحت کر چکے ہیں یا چینی اور روسی سفارت خانے میں ملازم ہیں تو سمجھ لیجیئے کہ آپ ریڈیو کے لئے کبھی لکھ نہیں سکتے۔ یعنی آپ کی ادبی حیثیت ریڈیو والوں کی نگاہ میں صفر تسلیم کی جائیگی ہاں اگر اس قسم کی غزلیں کہتے ہیں جن میں بتِ کم سن اور رقیب روسیاہ کا ذکر رہتا ہے یا ایسے افسانے لکھتے ہیں جو محبت کی واردات سے شروع ہو کر خودکشی کی واردات پر ختم ہوتے ہیں تو بلاشبہ آپ سے ریڈیو کے لئے لکھنے کی درخواست کی جائے گی۔

ایک اور بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔ یہ ہے کہ ریڈیو سٹیشن تک آپ کی رسائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے۔ جب آپ ریڈیو سٹیشن کے افسروں سے رسم و راہ پیدا کر لیں۔ یہ کوئی اتنی مشکل بات نہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے احباب کو ریڈیو کے محکمہ میں ملازمت کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر آپ کا ایک دوست بھی اس محکمے میں ملازم ہو گیا تو جب تک اس کی ملازمت سلامت ہے آپ ریڈیو کے لئے لکھتے رہیں گے۔ بالفرض آپ کا کوئی دوست ریڈیو کی ملازمت کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تو پھر بہرحال آپ کو اُن لوگوں کی خدمت میں باریابی حاصل کرنا ہوگی جو ریڈیو سٹیشن پر خدا یا ناخدا کی حیثیت سے قابض ہیں۔ یعنی ڈائریکٹر۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر۔ پروگرام ایگزیکیٹو۔ وغیرہ۔ ڈائریکٹر سے ملاقات کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ خدا کا یہ برگزیدہ انسان عموماً ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اس کے پاس ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دو چار ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر عموماً دین اور دنیا سے اس قدر بیزار رہتا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد ملاقاتی کچھ لکھنے کی بجائے خودکشی کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ اس لئے اگر آپ پروگرام ایگزیکیٹو سے ملنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا۔ پہلے ٹیلیفون پر اس سے ملاقات کا مناسب دن اور وقت دریافت کریں اور پھر دو چار انگریزی یا فرانسیسی ناول بغل میں داب کر اس کے دفتر میں جا دھمکیں۔ گفتگو اس قسم کی ہونی چاہیئے۔

"آداب عرض ہے"

"مدت سے خواہش تھی کہ آپ سے شرف نیاز حاصل کیا جائے۔"
"آپ تو اُردو، ہندی، بنگالی اور گجراتی کے مانے ہوئے ادیب ہیں۔"
"وہ ناول جو آپ پچھلے پندرہ برس سے لکھ رہے تھے، اس کا پہلا باب آپ نے لکھ لیا یا ابھی اس کا پلان بنا رہے ہیں۔"
"جب سے آپ یہاں تشریف لائے ہیں پروگرام یقیناً بہتر ہوگئے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی تقریریں سننے کو بھی جی چاہنے لگا ہے۔"
"یہ الماس بیگم تو آپ کی دریافت معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے اسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔"
"آپ نے یہ فرانسیسی ناول پڑھا۔ اگر آپ اسے گجراتی میں منتقل کریں تو کیسا رہے۔"

ان باتوں کے جواب میں اگر پروگرام ایگزیکٹو سمجھدار ہے تو برابر مسکراتا رہے گا۔ اگر نہیں ہے تو شیخی بگھارنے لگے گا۔ آپ اس کی باتوں سے ذرہ بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیے۔ اگر وہ کہے کہ فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ کوئی اپنے ناول کا پہلا باب مکمل کر سکے۔ تو آپ کو فوراً کہنا چاہیئے "بجا ارشاد ہوا۔ یقیناً اگر آپ کسی اور محکمے میں ہوتے تو اس وقت تک دو درجن ناولوں کے مصنف ہوتے۔" اگر وہ کسی جرمن یا جاپانی مصنف کا حوالہ دے جس کا تازہ ناول وہ پڑھ رہا ہے تو آپ دس بارہ فرضی ڈچ یا چینی مصنفوں کے نام گنوا دیجئے جن کے تمام ناول آپ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس ملاقات کا آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آئندہ آپ پروگرام ایگزیکٹو کی نگاہ میں رہیں گے۔ اور وہ جب بھی نیا سلسلہ (SERIES) شروع کرے گا۔ ایک آدھ تقریر آپ کو مل جائے گی۔

دوسری بات جو آپ کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ یہ ہے کہ ریڈیو والے ہمیشہ تقاریر کے "سلسلے" تجویز کرتے ہیں۔ مثلاً سلسلہ ہوگا "یہ کیسے چلتی ہے" اور اس میں تقاریر کے عنوانات ہوں گے :۔

(۱) کھوٹی اٹھنی۔
(۲) زنگ خوردہ بندوق۔
(۳) بات سے بات۔
(۴) پنڈت جی کی بہلی۔
(۵) بدمزاج بیوی کی زبان۔

اب آپ اس پر نہ جایئے کہ یہ "سلسلہ" کتنا مضحکہ خیز ہے یا اس میں تقاریر کے عنوانات کتنے عجیب و غریب ہیں بلکہ ع۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست کے مصداق اسے نظر انداز کر دیجئے۔ اور چپکے سے تقریر لکھ ڈالئے۔ اس ضمن میں ایک نکتہ آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ وہ یہ کہ قریب قریب ہر ریڈیو سٹیشن ایک ہی قسم کے سلسلے نشر کرتا ہے۔ اس لئے آپ غور سے ہر سٹیشن کا پروگرام سُنیئے۔ کوئی نہ کوئی وہی تقریر نشر کر رہا ہوگا کہ جو آپ کو کرنا ہے۔ اس لئے آپ وہ ساری کی ساری تقریر نوٹ کر لیجئے۔ اور تاریخ مقررہ پر نشر فرما دیجئے۔

بعض اوقات تقاریر کے نئے سلسلے پر کسی مشہور شاعر کا کوئی چلتا ہوا مصرع چسپاں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ع
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ

(۱) ہم خاکروب ہوتے!
(۲) ہم چڑیمار ہوتے!
(۳) ہم تھانے دار ہوتے!
(۴) ہم سمجھدار ہوتے!

یا ے تنگدستی اگر نہ ہو غالب
(۱) بے حیائی ہزار نعمت ہے!
(۲) روسیاہی ہزار نعمت ہے!
(۳) بد دماغی ہزار نعمت ہے!

جب صورت حال یہ ہو تو آپ غالب کی رُوح سے معذرت کئے بغیر تقریر کا آغاز کر دیں۔ کیونکہ اگر آپ یہ سوچنے لگے کہ غالب مرحوم پر جنت میں کیا گزرنے گی تو آپ تقریر نہیں کر سکیں گے۔

تقاریر کے علاوہ ریڈیو والے آپ سے فیچر اور ڈرامے بھی لکھواتے ہیں۔ فیچر ریڈیو کی خاص ایجاد ہے۔ اس کو عام طور پر وہ لوگ لکھتے ہیں جو فیچر سے بہتر چیز لکھنے کے اہل نہیں۔ چونکہ معاوضہ کافی ملتا ہے اس لیئے فیچر نویسی ہرگز خسارے کا سودا نہیں۔ فیچر موسموں۔ شہروں۔ کھنڈلوں اور گلہریوں پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی خاص موسم پر فیچر لکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس موسم سے متعلق چند گیت۔ نظمیں یا غزلیں لیں انھیں اکٹھا کر لیجئے اور پھر پانچ دس سطور خود لکھئے اور ایک آدھ سطر کے بعد دو تین بلکہ چار گیت نقل کرتے جایئے۔ مثلاً آپ کو "بسنت" پر فیچر لکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ کو مندرجہ ذیل طبعزاد فقرے لکھنا ہوں گے۔

"بسنت! آہاہا بسنت! یعنی واہ واہ بسنت کا موسم ہے۔ جدھر دیکھو اُدھر بسنت۔ دائیں بائیں آگے پیچھے بسنت! ساتویں آسمان کے علاوہ ہر جگہ بسنت۔ ریڈیو سٹیشن پر بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ ڈائرکٹر صاحب کو شاید یرقان ہو گیا ہے۔ اسی لیئے انھیں ہر چیز پیلی پیلی نظر آرہی ہے۔ وہ دیکھئے۔ ارے وہ۔ بسنتی کپڑوں میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں بسنت کے گیت گا رہی ہیں۔ اُدھر بدصورت لڑکے اُن کا منہ چڑا رہے ہیں۔ آیئے یہاں سے کہیں دُور بھاگ چلیں۔ ورنہ ہمیں یہ گیت سننا پڑیں گے۔"

اگر آپ کو کسی شہر پر فیچر لکھنا مقصود ہے۔ تو یوں لکھئے،

"دلی! ہندوستان کا دل ہے۔ ہندوستان ایشیا کا دل ہے۔ اور ایشیا خدا جانے کس کا دل ہے۔ بہرحال کسی کا ہوگا دلی کئی بار اُجڑی اور کئی بار بسی اور اب اُجڑنے کا نام نہیں لیتی۔ دلی بہرحال دلی ہے۔ یعنی لکھنؤ یا ٹمبکٹو نہیں۔ دلی میں بڑے بڑے باکمال لوگ رہتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سبھی باکمال۔ دلی کی گلیوں میں خاص کشش ہے۔ کیونکہ یہاں بارہ مسالے کی چاٹ بکتی ہے۔ اسی لیئے تو انھیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ چاہئے بھی تو کوئی کہاں جائے۔ چاروں طرف دلی ہی دلی ہے۔ یہاں کا ہر فاقہ مست اپنے کو میر یا غالب سمجھتا ہے۔ اللہ اللہ خود فریبی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دلی شہر نہیں۔ بھول بھلیاں ہے۔ نئی دلی میں راستہ بھول جاؤ تو پرانی دلی میں جا پہنچو۔ اور پرانی دلی میں راستے سے بھٹک جاؤ۔ تو نئی دلی پہنچ جاؤ۔ دلی کی اہمیت تبھی تک ہے جب تک مہا دلی وچ دمیں نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اب رہے ریڈیو ڈرامے! ریڈیو ڈرامہ لکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کبھی طبعزاد ڈرامہ لکھنے کی غلطی نہ کی جائے اول تو پلاٹ ہی مشکل سے ملتا ہے۔ پلاٹ مل جائے تو مناسب کلائمیکس نہیں سوجھتا۔ کلائمیکس بھی سوجھ جائے تو اختتام کا مسئلہ اچھی خاصی اُلجھن پیدا کر دیتا ہے۔ ان مشکلوں سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ کسی انگریزی انتخاب کی طرف رجوع کیجئے۔ جس کا نام ہو "۱۹۵۵ء کے بہترین ناٹک" "انیسویں صدی کے مشہور ایک ایکٹ کے ڈرامے" اس کتاب سے پلاٹ۔ کردار۔ زبان اُڑا کر انھیں ہندوستانیت کا رنگ دے دیجئے۔ اگر اصل ڈرامے کا نام ہے "کھٹے انگور" تو اب اس کا نام رکھ دیجئے "میٹھا آلو بخارا"۔ لیجئے ڈرامہ تیار ہے۔ معمولی ترمیمیں تو ہوں گی ہی۔ مثلاً ہیرو کا نام "ولیم"

کی بجائے "ولی علیم" ہوگا۔ اور ہیروئن للی کی بجائے لیلیٰ کے نام سے پکاری جائے گی۔ اگر آپ ایسا ڈرامہ لکھ دیں گے تو نہ صرف ریڈیو والے آپ کی ذہانت کی داد دیں گے بلکہ مبلغ تیس روپیہ کا چیک بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ایک آخری بات اور یاد رکھیئے۔ جب کبھی آپ ریڈیو پر تقریر کریں یا آپ کا لکھا ہوا کوئی فیچر یا ڈرامہ نشر کیا جائے۔ اس سے اگلے دن آپ اپنے احباب کو لکھیں کہ وہ آپ کی تقریر، ڈرامے یا فیچر کے بارے میں تعریفی خطوط اسٹیشن ڈائرکیٹر کے نام بھجوائیں۔ اگر ہوسکے تو چھ سات خطوط آپ خود لکھ کر فرضی ناموں کے تحت ڈائرکیٹر صاحب کو بھجوا دیں۔ مضمون یہ ہونا چاہیئے:۔

محترمی!

بڑی مدت کے بعد آپ کے سٹیشن سے ایک اچھا فیچر سننے کو ملا۔ میری مراد "میر معلوم ہے قلندر رہتا" سے ہے۔ ملنگ شمسانوی صاحب نے میر کی قلندری کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ بعینہ میر کے اپنے الفاظ ہی ہیں۔ اُمید ہے آپ یہی فیچر دوبارہ بلکہ سہ بارہ سنوائیں گے۔ ہاں اگر مناسب سمجھیں تو ملنگ صاحب سے کہیں کہ ایک فیچر "پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں" پر آپ کو لکھ کر دیں۔

تو لیجیئے۔ یہ ہے ریڈیو کے لئے لکھنے کا تکنیک۔ اللہ توفیق دے تو آپ بھی ریڈیو کے لئے لکھا کیجیئے۔ دلچسپ شغل ہے۔ اور پھر جیسا کہ ملنگ صاحب نے کہا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام!

حقیقت نگاری

"۔۔۔۔ افسانوں کی ایک قسم وہ ہے جس میں حقیقت نگاری معراج پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ مثلاً ایسا افسانہ یوں لکھا جائے گا "ہماری گلی میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ ہماری گلی کا طول ۸۷ فٹ ۸ انچ عرض ۲۰ فٹ ۴ انچ ہے۔ گلی کا فرش نہایت خستہ ہے۔ جگہ جگہ اینٹیں اُکھڑی ہوئی ہیں۔ ایک جگہ تو ایسا گڑھا پیدا ہوگیا ہے کہ اُسے پُر کرنے کے لئے دوسو اینٹیں درکار درکار ہیں۔ جو بزرگ ہماری گلی میں رہتے ہیں اُن کی عمر ساٹھ سال اور آٹھ ماہ ہے۔ ان کی داڑھی میں ستّر فی صدی بال سفید ہو چکے ہیں۔ وہ ایک لال رنگ کی ٹوپی پہنتے ہیں جن پر تقریباً ایک سو بیس دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بزرگ ہر روز صبح چھ بج کر پچاس منٹ پر اپنے کُتّے کو ساتھ لے کر سیر کو جاتے ہیں۔ اُن کے کتے کا رنگ خاکی مائل سیاہ ہے۔ قد کوئی دس انچ اور دم تین انچ ہوگی۔ سیر کرتے وقت پہلے کتا اُن بزرگ کے آگے دوڑتا ہے اور اُس کے بعد پیچھے دوڑتا ہے ۔۔۔۔۔۔"

—— کنہیالال کپور

هجرت

۱ خوشبو کی

شیخ صلاح الدین ۔ حنیف رامے
انتظار حسین ناصر کاظمی

عقل کی

احمد حسین چغتائی ۔ ظہور نظر
ریاض الرحمٰن ۔ محمد خالد اختر

کہانی یہ ہے کہ ایک مراثن گاؤں والوں سے ناراض ہوگئی، تو اپنا مُرغا بغل میں دبا کر گاؤں سے ہجرت کرگئی اور دھمکی دے گئی کہ اب نہ میرا مُرغا بانگ دے گا۔ اور نہ گاؤں میں سورج نکلے گا۔

یہ بحث :۔ اردو کے مشہور ادبی رسالہ "سویرا" کے میں ایک ادبی بحث چھپی ہے جس کا عنوان ہے "خوشبو کی ہجرت" اس بحث کی پیروڈی "عقل کی ہجرت" کے عنوان سے ہم پیش کر رہے ہیں ——— ایڈیٹر

سویرا ۱۹۹

خوشبو کی ہجرت

(ایک مکالمہ)

شیخ صلاح الدین — ناصر کاظمی

انتظار حسین — حنیف رامے

شیخ :۔ کسی فن کار کی تخلیق کا صحیح ذریعہ اظہار کوئی خاص صنفِ سخن نہیں ہوا کرتی ۔ بلکہ سامع یا قاری کا ذہن ہوتا ہے ۔ اگر وہ ذہن کسی پاگل کا ذہن ہے ۔ تو فن کار وہاں کچھ بھی نہیں کر سکتا ۔

حنیف رامے :۔ مصوری کی روایت میرے وجود کا سایہ ہے ۔ اپنے سائے کو قبول کرنا میری دیانت داری میں شامل ہے ۔ اور عامیت سے کنارہ کشی میری نجات کا حصّہ ہے ۔

ناصر :۔ غزل گوئی میں خرابی یہ ہے کہ وہاں پیاز کا ذکر نہیں کیا جا سکتا ۔ ویسے یہ کام بھی اب کرنا ہی پڑے گا ۔

انتظار :۔ ہجرت تو انسان کی تاریخ ہے ۔ جنّت کی ہجرت سے لے کر آج تک کی ہجرت تک انسان نے جس جس طرح ہجرت کی ہے ، ان کا عکس تہہ میں جاری و ساری ہے ۔ ہر فن کار کے ہاں یہی ہجرت کا سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ ہر گم شدہ بچّے کو جنت کی تلاش رہتی ہے ۔

عقل کی ہجرت

(ایک پیروڈی)

احمد حسن چغتائی | ظہور نظر
ریاض الرحمٰن | محمد خالد اختر

چغتائی :۔ کسی فن کار کی تخلیق کا صحیح ذریعہ اظہار کوئی خاص صنفِ سخن نہیں ۔ بلکہ سامع یا قاری کا ذہن ہوتا ہے ۔ اگر وہ ذہن کسی پاگل کا ذہن ہے تو فن کار وہاں کچھ بھی نہیں کرسکتا ۔ بالکل اسی طرح اگر فن کار پاگل ہے تو اس کی تخلیق کو سمجھنے کے لئے قاری کا پاگل ہونا نہایت ضروری ہے ۔۔۔ فرض کیجئے ایک بھینگا مصوّر تصویر میں پانچ پرندے بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے دس پرندے بنائے ہیں تو یہ بڑی صاف بات ہوگی کہ ایک نارمل آنکھوں والا انسان انہیں اس وقت دس نہیں مانے گا جب تک کہ وہ خود بھینگا نہ ہو جائے ۔

ریاض :۔ پھر تو طے پا گیا کہ فن کے سلسلہ میں فن کار اور اس کا تخیل اب بالکل آزاد ہیں ۔ خواہ وہ کچھ ہو خواہ وہ کچھ بھی کرے ۔ ساری ذمہ داری اب سامع یا قاری کے کندھوں پر آن پڑی ہے ۔ اب یہ اس کا فرض ہے کہ خود میں خاطر خواہ صلاحیتیں تخلیق کرکے اپنے آپ کو فن کار کے فن اور تخیل سے ہم آہنگ کرے ۔۔۔ مثال کے طور پر اگر ایک اُود بلاؤ اپنی مخصوص صنفِ سخن یا "صنفِ فن" میں کوئی شے تخلیق کرتا ہے تو ہم انسان اس پر کسی قسم کی کوئی بھی شرط عائد نہیں کرسکتے ۔ کلیتاً ذمہ داری ہم انسانوں پر عائد ہوتی ہے کہ ہم خود کو اُود بلاؤ کے تخیل اور فہم و ادراک کی بلندیوں سے ہم آہنگ کرکے اس کے فن پارے کو سمجھیں ۔۔۔ ماڈرن زمانے میں فن کار ہر قسم کی قیود سے بالکل آزاد ہے ۔

ظہور :۔ لیکن یہ اس امر پر منحصر ہوگا کہ آیا اُود بلاؤ اپنے ماضی میں درخشاں روایات کا حامل رہا ہے ۔ اگر رہا ہے تو ایسا ہونا قطعی ضروری ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ ایک فنکار کے لئے روایتی سلسلے کے تصوّر میں اُود بلاؤ کی "موجودگیت" کا احساس بدرجہ اتم ہونا چاہیئے ۔

خالد :۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُود بلاؤ کے روایتی تسلسل میں انسانی فنونِ لطیفہ کے روایتی تسلسل کو بھی مدغم کرسکتے ہیں یہ تو ایک بے حد دلچسپ فن کی تخلیق کا باعث ہوگا ۔ مثلاً آپ موسیقی ۔ آرٹ اور لٹریچر کی روایات کو اُود بلاؤ کی روایات میں سمو لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس امتزاج سے کس قسم کا نیا فن جنم لے گا ۔

ظہور :۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی ایسا ازل سے ہوتا چلا آرہا ہے ۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ گیدڑ اس دنیا کا عظیم ترین روایتی جانور ہے اور تاریخ انسانی میں کوئی باب ایسا نظر نہیں آتا جس میں گیدڑوں کا ذکر نہ ہو اس قسم کے محاورے "اگلا شیر کا اور پچھلا گیدڑ کا" انسانوں ہی کے لئے استعمال ہوتے ہیں ۔ میں تو اود بلاؤ اور گیدڑ کی روایات کو بھی اپنی ہی روایات سمجھتا ہوں ۔ انسانی تہذیب ازل سے ایسی موہوم اور مجرد چیخیں اپنے لاشعور میں لئے چلی آرہی ہے جن کا تعلق کافی حد تک گیدڑوں سے بھی ہے ۔۔۔ جو رات کا آغاز ہوتے ہی اپنی اہمیت اور روایات کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں ۔ بعض مشہور ترین سمفنیوں میں بھی گیدڑوں اور اُود بلاؤ کی چیخیں بدرجہ اتم موجود ہیں ۔

خالد :۔ شیر کی روایات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

ظہور:۔ شیروں کی روایات ان کی نسل کی طرح بہت کم ہوتی جا رہی ہے صرف ایک روائت زیادہ تر سننے میں آتی ہے کہ "بگا شیر اوّل تو ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بڑا سخت ہوتا ہے" جس طرح اُودھ کے بغیر بلاؤ اور بلاؤ کے بغیر اُودھ اندھا ہے بالکل اسی طرح سختی کے بغیر بگا شیر اور بگے شیر کے بغیر سختی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یقیناً۔ گیدڑ۔ شیر۔ اُودھ۔ بلاؤ اور دوسرے فن کار جانوروں کے تجربوں کی گونج انسانی تہذیب کے لاشعور میں ہے اور تصوری۔ موسیقی اور ادب کی روایات میں یہ گونج بھی شامل ہے۔

ریاض:۔ اس بات کا تو میں بھی قائل ہوں۔ مگر پھر یہ کیا ضرور ہے کہ شیر۔ گیدڑ اور اُودھ بلاؤ تک ہی روایات کے امتزاج کو محدود کر دیں۔ میں تو انسانی زندگی کی روایات میں بھڑکے چھتے کو بھی وہی اہمیت دیتا ہوں اور پھر حلوائی کی امرتیاں بھی میری روایات کا اہم جزو ہیں۔

چغتائی:۔ کسی زمانے کسی ملک کسی قوم کسی زبان میں وہ سب کچھ شامل سمجھنا چاہیے جو دنیا کے تمام جانداروں کی حرکات و سکنات اور حیات و موت میں ہوتا ہے۔ چاہے اس کا ذریعہ کسی فنکار کی انسانی اور فنی صلاحیتوں پر مبنی ہو یا گیدڑوں۔ شیروں اور اُودھ بلاؤں کا مرہونِ منت جن کی روایات کی سلطنت حدود زمان و مکان سے بالا نیاز ہوتی ہے۔

ریاض:۔ پہلی بار جب گیدڑ نے بیچ ماری ہوگی تو ظاہر ہے اس نے کوئی "وسل" استعمال نہیں کی ہوگی۔ بلکہ اپنے گلے کی نال کو کسی نئے طریق سے استعمال کیا ہوگا اور دوسری بار کسی نے اسے روایت قرار دیدیا ہوگا۔

خالد:۔ کیا گیدڑ فن کار نہیں ہو سکتا۔ میرا مطلب ہے اس میں افسانہ لکھنے۔ غزل کہنے یا تصویر بنانے کا شعور نہیں ہے۔

ظہور:۔ میرے خیال میں اسے ان تینوں فنونِ لطیفہ میں سے کسی کا بھی شعور نہیں۔ البتہ موسیقی میں وہ بہت بڑا فن کار ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ ہو بھی اور ہم اپنی محدود روایت کے باعث اس کی موسیقی کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔

چغتائی:۔ میں سمجھتا ہوں گیدڑ کے فن کو صرف بیچ تک محدود کرنا اس کی شخصیت اور اس کے فہم و ادراک پر بہت بڑا حملہ ہے۔ یہ امر کسی تجزیے کا محتاج نہیں کہ ہم کسی تہذیب۔ عصر یا فرد کے فنی و ثقافتی ورثے کا موازنہ کرتے وقت جو پہلی شرط عائد کرتے ہیں وہ یہ ہوتی ہے کہ اس میں روایتی عناصر کا تسلسل کس شدت تک پہنچ چکا ہے چونکہ روائت کا عنصر ہی کسی تہذیب کی فنی اقدار کا پیمانہ ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ اگر ہمیں کہیں روایتی عناصر مل جاتے ہیں تو وہ بلاشک و شبہ فن اور آرٹ کی منزل کا پتہ دیں گے۔ لہٰذا اگر گیدڑ صاحبان کی تہذیب میں روایت کا تسلسل موجود ہے تو ایسا محض گیدڑوں کی فنی طبع کے سبب ہوا ہے۔ میں بڑے وثوق سے کہنے پر مجبور ہوں کہ گیدڑ دنیا میں ہر صنفِ سخن کے بڑے بڑے فن کار ہوں گے۔ ورنہ یہ روایت کا تسلسل بے معنی اور مجہول سی چیز بن کر رہ جائے گا۔

مجہول ہے ہر چیز جو مجہول نہیں ہے
معقول ہے ہر چیز جو معقول نہیں ہے

خالد:۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر جاندار جو کسی نہ کسی روایت کا حامل ہے فن کار ہو سکتا ہے۔

ریاض:۔ یہ درست ہے البتہ اُودھ بلاؤ اور نیل کنٹھ فن کار نہیں ہو سکتے۔

چغتائی:۔ یہاں مجھے پھر وہی الفاظ دہرانے پڑیں گے جو اس سے پہلے میں گیدڑ کے بارے میں کہہ چکا ہوں۔ میرا مطلب ہے آپ کسی بھی جاندار کے فن کار ہونے سے منکر نہیں ہو سکتے۔ اُودھ بلاؤ کے ساتھ یہ سراسر زیادتی ہے۔

ظہور:۔ مجھے ریاض سے اتفاق ہے اس لئے کہ اُودھ بلاؤ کا شعور لاشعور کے بغیر اندھا ہے۔ اور اس کا روایتی تسلسل بھی نیل کنٹھ کی طرح کہیں کہیں ٹوٹ جاتا ہے۔

چغتائی:۔ کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ سمندر کے نیلے پانیوں میں اُودھ بلاؤ کس چستی۔ طراری اور فنکاری کے ساتھ غوطے لگاتا ہے۔ اس کی شخصیت میں یہ جو چھچھورا پن ہے یہ اس کے فن کار ہونے کی دلالت نہیں تو اور کیا ہے۔ کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ فنکار اور بچے یا بچے اور فن کار کی شخصیتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ اُودھ بلاؤ کے اندر جو چھچھورا پن ہے اور جس نے

اُودھ بلاؤ کی شخصیت کو بچے کا اس قدر قرب بخشتا ہے۔ اس کے فن کار ہونے کی بیّن دلیل ہے ع۔

جو ہے سو ہے۔ جو نہیں ہے سو نہیں ہے

ریاض :۔ اگر آپ اودھ بلاؤ کو فن کار ماننے پر تل ہی گئے ہیں تو چلئے وہ فن کار ہی سہی۔ لیکن اس کا شمار تیسرے درجہ کے فن کاروں میں ہوگا۔ کیونکہ اس کی تحریر یا تقریر یا تصویر سے تیسرے درجے کا قاری ہی محظوظ ہوگا۔ جس میں بذاتِ خود اُودھ بلاؤ سے ملتی جلتی خاصیتیں ہوں گی۔ اور پھر یہ بھی ثابت ہے کہ اودھ بلاؤ ایک تیسرے درجے کے لکھنے والے کی طرح روایت کو محض موریخوں کا زبدہ سمجھتا ہے اس کے برعکس گیدڑ اسے اپنے ماضی کا جیتا جاگتا سرمایہ اور مستقبل کی واٹر سپلائی کا منبع سمجھتا ہے اگر وہ بزدل اور بس بھرے گنوں کا رسیا نہ ہوتا تو فن کاری میں اس کا درجہ یقیناً لومڑی سے بھی بڑا ہوتا۔

خالد :۔ بالکل ٹھیک ہے۔ جب تک کوئی شخصیت اپنے عنصر کو اظہار کا مناسب فنکارانہ جامہ نہ پہنائے۔ اس میں خواہ کتنا ہی "بچہ" ہو کتنا ہی بڑا چھوکرا ہو بلکہ کتنی ہی عمر کا ہو اس کو فن کار نہیں کہا جا سکتا ــــ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ حضرت ناصر نے کئی مہینوں کراچی میں رہے بسے۔ تا بڑتوڑ اور بھرپور زندگی بسر کی۔ دن بھر "ہاکس بے" شام کو کبھی کلفٹن کبھی کیماڑی کبھی ایئرپورٹ رنگ رنگ کے مشروبِ ارغوان" ــ وسکی بیئر۔ رم۔ کوکو کولا۔ پاکولا۔ جام پہ جام بوتلوں پہ بوتلیں اور اس پر کیفے ڈی خان کے مرغن لنچ۔ بیچ لفرٹی کے چکرادینے والے ڈنر۔ مگر اس کا کیا کیجئے کہ جب اپنے تاثرات کو بحیثیت فنکار فن کی "قید میں زیر دستی جکڑنے" کا وقت آیا تو فرمایا ع

یاد ہے شہر کراچی تا صَـــــر
کیسا کھایا تھا "گرب[۱]" یاد نہیں

کتنا المناک واقعہ ہے یہ ـــــــ ناصر صاحب میں جو "کوئی" بھی بول رہا تھا۔ بحیثیت فنکار کراچی سے متعلق اپنے محسوسات بتانے میں ناکام رہا ہے ــ لہٰذا چغتائی تمہارا یہ اصرار کہ اُودھ بلاؤ محض اس لئے بڑا فنکار ہے کہ اس کے اندر ایک چھوکرا ہے یقیناً مجہول اور بے معنی ہے اس لئے اُودھ بلاؤ کے متعلق فن کے ثقہ نقادوں نے آج تک ایک لفظ نہیں لکھا۔ حالانکہ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دنیا میں اودھ بلاؤں کی آبادی کافی موجود ہے ــ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اودھ بلاؤ میں چھوکرا موجود ہی نہ ہو اور یہ محض ایک سراب ہو۔ ایک دکھاوا۔ ایک جھلک۔ ایک الہام ......

ظہور :۔ آہا ــ کیا بات کی خالد ــ اپنا تو یہ ہے کہ ع

بڑی مشکل ہے۔ عجب میرا دل ہے
کوئی نہ سمجھے کوئی نہ جانے

سچ پوچھو تو یار ہر بڑا فن ہر بڑا آرٹ ناقابلِ فہم ہوتا ہے اور بڑے بڑے فن کار اسے اپنے اپنے "طوطی" میں فٹ کر کے نقار خانے سے باہر بجاتے ہیں۔ یہاں نقار خانے سے میری مراد زندگی کی گہما گہمی ہے شاید آپکو معلوم نہیں کہ ایک بار کسی کی دھوپ کسی کے ذہن سے یوں گذری کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے نکل کر پھر آسمانوں پہ چڑھ گئی ــ آپ مانیں یا نہ مانیں مگر ایک فن کار کہتا ہے کہ اس نے ایسا محسوس کیا ہے اور یہ کہ اس کے یوں محسوس کرنے میں روائت کا بڑا دخل ہے ــ خیر یہ تو "جملہ تسلیمیہ" تھا۔ اب مجھے ایک جملہ معترضہ بھی کہنا ہے اور وہ یہ کہ خالد تم نے فن کے نقادوں کا ذکر کرتے ہوئے "سقہ" کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس سے تمہاری مراد ایسے نقاد تو نہیں جو جگہ جگہ پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

خالد :۔ نہیں بھائی۔ ثقہ وہ ہے جو "ث" سے لکھا جاتا ہے۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں کے ثقہ نقادوں میں بعض نقاد ایسے بھی ہیں جنھیں فن تنقید کا "بچہ سقہ" کہا جا سکتا ہے۔ گیدڑوں میں ایسے نقاد بہت پائے جاتے ہیں۔

ریاض :۔ اب چھوڑو بھی ــ اب اس گیدڑ اور اُودھ بلاؤ سے بہت بور ہو گئے ہیں۔ میرا خیال ہے ......

[۱] GRUB

چغتائی :۔ تمہارا خیال چاہے کچھ بھی ہو لیکن تم اس قدر سنجیدہ اور مجرّد بحث پہ اس طرح پانی نہیں پھیر سکتے ۔ اگر تم میں اتنی قوتِ برداشت نہیں تھی تو اس عالمانہ بحث میں شریک ہی نہ ہوتے ۔ بور ہونا کہاں کی عقلمندی ہے ۔

ریاض :۔ لیکن یار ۔ کسی بات کی آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے ؟

ظہور :۔ معلوم ہوتا ہے اس بحث سے تمہاری صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے ۔ لہذا یہ بحث بند کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ کہ گیدڑوں اور اودھ بلاؤں میں بھی فنکارانہ عنصر اور روایات کا تسلسل موجود ہے اور فن اور روایات کے تسلسل کی کوئی حد نہیں ہوتی ۔

ریاض :۔ یہ تو مجھے بھی تسلیم ہے کہ فن اور روایت لامحدود ہیں لیکن گیدڑوں اور اودھ بلاؤں کی تو کوئی نہ کوئی حد ہونی ہی چاہیئے ۔ لہذا روایت کے تسلسل کا رُخ اب کسی اور طرف کیجئے ۔

خالد :۔ ظہور، تم نے کافی کبوتر پال رکھے ہیں کیا تم ان کی روایات کے تسلسل اور فنکارانہ صلاحیتوں پر کچھ روشنی ڈال سکتے ہو ۔

ظہور :۔ "بھائی پالتو کبوتر کا مصرف زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ کسی افسانہ نگار کو کوئی ثقہ نقاد اجتماعی شعور کی "خلعت بخش دے" کیونکہ اکثر نقاد پالتو کبوتروں سے فنی اور روایتی لحاظ سے بہت مشابہ ہیں ۔ دونوں میں سیٹی کے اشارے سے لوٹ آنا اور تالی کے زور سے اڑ پر اُٹھنا قدرِ مشترک ہے ۔

چغتائی :۔ پھر تو ہم سب کو اولین فرصت میں کبوتر بازی شروع کر دینی چاہیئے ۔

ریاض :۔ "یوں بھی پالتو کبوتر زمین کا جانور ہے ۔ ایک محدود زمین کا" اور چغتائی تمہارے باپ کے پاس تو چودہ مربع زمین ہے ۔ جتنے چاہو کبوتر پال لو ۔ ع

ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے

چغتائی :۔ مگر بھائی ۔ افسانہ نگار تو تم ہو کبوتر تمہیں پالنے چاہئیں ۔ پالتو کبوتروں پر اجتماعی شعور کی خلعت صرف افسانہ نگاروں کو ہی ملتی ہے ۔

خالد :۔ ممکن ہے تکنیک کے تنوع کی خاطر ثقہ نقاد تمہیں بھی کوئی خلعت بخش دیں ۔ اجتماعی شعور کی نہ سہی انفرادی ہی کی سہی ۔ اور پھر زمین کا تمہیں بڑا "ایڈوانٹیج" ہے ۔

چغتائی :۔ اگر آپ لوگوں کا یہی مشورہ ہے تو میں ضرور کوشش کروں گا ۔ مگر تکنیک کے تنوع کا زیادہ تر قریبی تعلق ظہور سے ہے کیونکہ تنوع اور تکون شاعری کے چھوٹے بڑے مصرعوں سے روایتی طور پر مانوس ہیں ۔ یوں بھی اس کی شاعری میں جمع تفریق بہت ہے ۔ اگر بڑے مصرعوں میں سے چھوٹے مصرعے نکالتے چلے جائیں تو باقی صرف تکنیک کا تنوع رہ جاتا ہے ۔

ظہور :۔ چونکہ میں نے اپنی تکنیک کا حصہ شاعری کی روایت کو قرار دیا ہے اور خود قرار دیا ہے اس لئے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ۔ اور یہ منفی رہتی ہے نہ مثبت ۔ روایت کو محدود کرنا اگرچہ زیادتی ہے پھر بھی میں اس روایت میں محدود رہنا چاہتا ہوں ۔ مگر یار لوگ میرے پیچھے ڈنڈا لئے پھرتے ہیں ۔ میرے کندھوں پر پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہیں ۔ کبھی کہتے ہیں مصوری کرو ۔ کبھی کہتے ہیں اداکاری یا ایڈیٹری کرو ۔ کبھی کہتے ہیں "ادبِ لطیف" قسم کے مجرد فن پارے لکھو ۔ حالانکہ شاعری اور صرف شاعری ہی میرے لئے "مکمل" ہے ۔ اس کی روایت میرے وجود کا مایہ ہے ۔ دیانت ہے ۔ نجابت ہے ۔ حلاوت ہے ۔ یہی مجھے عامیت کے گڑھے سے نکال سکتی ہے ۔ اور یہی مجھے شہرت کے سمندر میں غرق کر سکتی ہے ۔ میں تو یوں محسوس کرتا ہوں جیسے میں ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوں جس کے نیچے زمین ہے نہ اوپر آسمان ۔ پھر بھی روایت کی داغ بیل ہے کہ ڈلتی چلی جا رہی ہے ۔ خوب کہا ہے کسی شاعر نے ۔ ع

نہیں ریساں چنانچہ یاں بہا دیں سکّا ای دگے

اگرچہ میرے دائیں بائیں آگے پیچھے ۔ اوپر نیچے رنگ برنگی بد دیانتیوں اور عامیتوں کے ڈھیر لگے ہیں پھر بھی میں روایات میں

دلچسپی لینے سے نہیں چوکتا۔ تخیل اور ذہن کے نئے نئے دروازے کھولتا ہوں شعور اور لاشعور کے پراسرار جھروکے تیار کرتا ہوں۔ سارا علم۔ سارے انسانی جذبات۔ سارا تجربہ خواہ وہ تمہارا ہو یا میرا ہو۔ میری تحویل میں ہے۔ میرے حواس باختہ ہیں۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ سانس اکھڑ چکی ہے دل کی حالت دگرگوں ہے منظر گزر رہا ہو چکی ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ لیکن جب بھی چاہوں تو سورج کو مٹھی میں بند کر لوں اور انگلی کے اشارے سے اپنے ساتھ ساتھ چلاؤں۔ اندھیرے کو روشنی کر دوں روشنی کو اندھیرا کر دوں حرکت کو جامد کر دوں۔ جامد کو حرکت کر دوں۔ سیدھے کو الٹا کر دوں۔ الٹے کو ٹیڑھا کر دوں۔ ٹیڑھے کو پھر سیدھا کر دوں۔ میں کیا نہیں کر سکتا — سائیکل چلاتا ہوں تو ساری زمین میرے پہیئے کے نیچے گھومتی ہے۔ اور میں زمین کا مرکز ہوتا ہوں۔ یہ زمین میری آنکھ کی فضا میں ایک ننھا سا پتھر ہے۔ مکان پھیلتا جا رہا ہے۔ زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ کوٹ لنڈے ہوتے جا رہے ہیں۔ پتلونیں کھلی ہوتی جا رہی ہیں۔ عجیب زمانہ ہے مکان ہے تو گھر نہیں گھر ہے تو مکان نہیں۔ فنکار کے لئے اس دور کا اہم ترین مسئلہ مکان ہے۔

ریاض:۔ واقعی مکان کا مسئلہ انتہائی اہم ہے۔ اس مسئلے نے پگڑی کی مستقل روایت اختیار کر لی ہے۔ فنکار پگڑی کہاں سے لائے وہ تو فلیٹ اور سولا ہیٹ بھی نہیں خرید سکتا۔ کل میں نے ایک فنکار کو دیکھا جو مکان نہ ملنے کی وجہ سے پاگل خانے جا رہا تھا۔ اور سمجھ رہا تھا کہ چاند اور مریخ کے سفر پر جا رہا ہے۔ یہ مسئلہ اگر حل نہ ہوا تو شاید ہم کو بھی چاند اور مریخ کے سفر پر جانا پڑے۔

سہیل:۔ کوئی بات نہیں۔ ع

گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں

خالد:۔ ظہور۔ اگر تم کسی دن یہ اعلان کر دو کہ مونث کو مذکر اور مذکر کو مونث لکھو گے تو شاعر دن کا گدھا کتنی دولتیاں جھاڑے گا۔ میرا مطلب ہے اگر تم شعر میں بیوی آتا ہے اور بیٹا جاتی ہے موزوں کر دو تو کیا ہماری روایت کی پرانی ڈیوڑھی میں کہرام نہ مچ جائیگا۔ کیونکہ ان کے خیال میں بیوی ہمیشہ آتی ہے اور بیٹا ہمیشہ جاتا ہے۔ حالانکہ بیٹا آتا بھی ہے۔

سلیم:۔ اگر بیوی تمہاری اپنی ہے اور بیٹا بھی تمہارا اپنا ہے تو جیسے چاہو موزوں کر لو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

چغتائی:۔ ایک بات اور بتاؤ شاعری تمہارے ہاں آسمان سے اترتی ہے یا زمین سے پھوٹتی ہے؟

ظہور:۔ اس کے جواب میں کوئی واحد بات نہیں کہی جا سکتی۔ مختلف حالات میں اس کی پیدائش کے مختلف طریقے ہیں مثلاً جب بارش ہو رہی ہو تو شاعری آسمان سے ٹپکتی ہے اور پتنگا زمین سے اڑتا ہے (میری مراد برساتی کیڑوں سے ہے) اور جب چشمہ پھوٹ رہا ہو، تو اس کا الٹ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ سب عقل کا الٹ پھیر ہے۔ ع

کرو تو بھی ڈرو۔ نہ کرو تو بھی ڈرو

خالد:۔ اپنے ہاں تو سلسلے کے ایک طنز نگاری کی روایت ہے۔ بلکہ روایت بھی کیا صرف اس کا تسلسل ہے جہاں سے چاہتا ہے پھوٹ پڑتا ہے۔ موقعہ محل اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ مکان کا مسئلہ نہ ہو تو بھی پگڑی اور طنز نگاری کا تسلسل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

ریاض:۔ جہاں تک میری تکنیک اور افسانہ نگاری کی روایت کا تعلق ہے۔ بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ پہلے موضوع کی چڑیا بنائی جاتی ہے۔ پھر پلاٹ کا درخت بنا کر یہ چڑیا اس پر بٹھائی جاتی ہے۔ بعد ازاں درخت کو ہلا ہلا کر "بلایا جاتا ہے اور چڑیا کو پچکار پچکار کر "گنوایا" جاتا ہے۔ آخر کار درخت جڑ سے اکھڑ جاتا ہے اور چڑیا اس کے نیچے دب کر مر جاتی ہے۔ پھر ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے۔" روشنی کا مینار" — یہ مینار اس کھوہ سے نکلتا ہے جو درخت کے اکھڑنے سے سینۂ گیتی میں پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی بے مثل فن ہے — اگر قاری کا ذہن تیسرے درجے کا گھٹیا ذہن نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے روشنی کے اس مینار پہ جامنیں لٹکی ہوئی نظر نہ آئیں۔ جامنیں۔ جل پریاں — جل پریاں — جامنیں۔

خالد:۔ ہانک دے میرے یار ہانک دے ـــــ حالانکہ بڑا فن کار وہ ہوتا ہے جس کے ہاں چڑیا خود بخود گاتی اور درخت خود بخود بولتا ہے اور وہ روشنی کے مینار پر چڑھنے کے لئے قاری کو "پولی سز" کا رستہ بھی مہیا کرتا ہے اگرچہ واپس کرنے کی شرط ساتھ ہوتی ہے۔ لیکن اپنے ہاں تو یہ سوال ہے کہ ہم لوگ "پولی سز" کا رستہ کہاں سے لائیں۔

چغتائی:۔ کیا اس سلسلے میں پٹ سن کا رستہ کار آمد ثابت نہیں ہو سکتا؟

ظہور:۔ کیا بات کرتے ہو یار ـــــ پٹ سن کی روایات ہی کیا ہیں۔ کہاں "پولی سز" اور کہاں بیچاری پٹ سن!

ریاض:۔ "پولی سز" اور پٹ سن کا ذکر چھوڑ دیئے۔ رستہ تو مونج کا بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا کیا کیجئے کہ سونے کا پانی اب ختم ہو چکا ہے جسے چھڑک کر اگلے وقتوں کے لوگ افسانوں کو بلایا کرتے تھے۔ افسانے تو افسانے آج کل تو تیترا اور بٹیر بھی نہیں بولتے۔ زندہ دلانِ اودھ کا خاتمہ ہوتے ہی تیتروں اور بٹیروں کی روایات بھی دفن ہو گئیں ـــ "اپنے کو نہ تو اب کردار نگاری میں مزا آتا ہے نہ فضا نگاری کا نہ زبان لکھنے کا"۔ وہ زبان ہی کیا جس میں تیترا اور بٹیر بھی نہ بولتے ہوں اردو مختصر افسانے کے ساتھ سب سے بڑا گھپلا یہی ہے کہ وہ گونگا ہے۔ کئی بار میرا دل چاہتا ہے کہ تیترا اور بٹیر کی طرح خود بولوں۔ لیکن پھر سوچتا ہوں ـــ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا" والی بات نہ ہو ـــ آپ کہیں، ریاض الرحمٰن کیا حال ہے اور میں کہوں۔ پٹ پٹ پٹاک ـــ ٹیہوں ٹیہوں ـــ ع

ڈرتا ہوں کہ انسان سے بن جاؤں نہ تیتر

ورنہ مجھے خدمات روائت سے نہیں عار (قاصر ندیمی)

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اردو ادب کی روایات میں مختصر افسانے کی گھگی بندھی ہوئی ہے اور اردو ادب کا یہ حصہ قطعی طور پر غیر کار فرما ہے کار فرما وہ حصہ ہے جہاں آواز ہے۔ مثلاً نقیر جلال آبادی کے یہاں ہر لفظ ایک آواز ہے اور ہر آواز ایک صدا ـــ نقیر کے یہاں محض آوازیں بھی ننگی آوازیں نہیں ہوتیں۔ ذرا غور سے ٹٹولئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ کئی عدد کپڑے۔ ہرے کے نیچے سرخ۔ سرخ کے نیچے نیلے۔ نیلے کے نیچے پیلے۔ بید بھڑکیلے، بے حد فحش۔ پیاز کی گٹھیوں کی طرح جن میں گٹھلی نام کو نہیں ہوتی، پرت ہوتے ہیں۔ نہیں ہوتی ہیں۔ چھیلتے جاؤ اور رکھاتے جاؤ۔ ڈنر کے ساتھ لنچ کے ساتھ۔

ظہور:۔ حضرت گنجفانی نے ایسی ایسی چاندنی کی گھٹیوں پر بہت سی پہیلیاں اور دوہے کہہ رکھے ہیں وہ پہیلیاں مجھے ہمیشہ "انسپائر" (INSPIRE) کرتی ہیں۔ یار روشنی کی پہلی کرن مجھے اس وقت ہی نظر آئی تھیں جب میں نے یہ پہیلی سنی۔ ع

چار گھڑے، دودھ بھرے، اُلٹے دھرے

پھر بھی بوند تلک نہ گرے

"یہ تھن ہیں"۔ کیا بات کہی ہے حضرت گنجفانی نے۔ بھینس کی شخصیت کا سارا تجرد اس پہیلی میں سمٹ آیا ہے۔ دوسری پہیلی ہے۔

ایک مرغ ایسا۔ جس کی چونچ پر پیسہ

یہ ہے پوست کا ڈوڈا۔

ریاض:۔ پوست کا تعلق بھی دراصل دودھ سے ہے۔ جو بچہ زیادہ روتا ہے اسے دودھ میں پوست ملا کر پلاتے ہیں۔ تاکہ وہ ہڑبونگ نہ مچائے۔ ہم فنکاروں کے اندر جو بچہ ہے یہ نسخہ اس پر بھی آزمایا جا سکتا ہے۔

ظہور:۔ یار کبھی کبھی تو مجھے بھینس بھی ایک بڑا پیانو نظر آتی ہے۔ جوہڑ میں قیلولہ کرتی ہوئی بھینس کو دیکھ کر میں نے کئی بار ایسا محسوس کیا ہے۔ نہ جانے کیوں؟

خالد:۔ اس لئے کہ تم اونچے درجے کے فنکار ہو۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں تم ان پہیلیوں سے زبردستی انسپائر (INSPIRE) ہوتے

سہتے ہو۔ ظاہر ہے حضرت گنجفانی نے یہ پہیلیاں بچوں کو محظوظ کرنے کے لئے لکھی ہوں گی تم خواہ مخواہ (SERIOUS) ہو جاتے ہو۔

ظہوری:۔ تم نہیں جانتے خالد۔ میرے اندر جو ایک عدد بچہ ہے وہ مجھ سے بھی بڑا فنکار ہے اور وہ اپنی باتوں سے محظوظ اور (INSPIRED) ہوتا ہے۔

چغتائی:۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارے اندر جو بچہ ہے اس کی سیکس (SEX) کیا ہے؟

ظہوری:۔ فی الحال تو وہ صرف بچہ ہی ہے۔

چغتائی:۔ تمہیں اس بچے کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور بتانا پڑے گا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ کچھ ثقہ نقاد تمہارے اس بچے کو پٹا ہوا بچہ سمجھ کر تمہیں صحرائے خیال میں ٹامک ٹوئے مارنے والا فنکار بنا دیں۔ ان لوگوں نے تو غالب کو بھی نہیں بخشا۔ کہتے ہیں وہ شاعر تو زبردستی بنا تھا۔ حقیقتاً وہ ایک سپاہی تھا۔ اس کے لئے صحیح راستہ شاعری نہیں فوج میں بھرتی ہونا تھا۔ جبھی تو وہ کبھی جاہ طلبی کے لئے شہنشاہ دہلی کا قصیدہ لکھتا تھا۔ کبھی یہ کہہ کر اپنا حق جتاتا تھا کہ اس کا حقدار وہی ہے کوئی اور نہیں اور جب ان جذبات کو سماج میں تسکین نہیں ملتی تھی تو ایک پٹے ہوئے بچے کی طرح صحرائے خیال کی خاک چھانتا تھا اور کوچہ لبیاران میں بیٹھ کر اس قسم کے شعر کہتا تھا ؎

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

نیز وہ صرف ایک بگڑا ہوا تصرف پسند تھا اور اس کی شاعری جو در اصل شاعری نہیں اسی تصرف پسندی میں گم ہے۔ اس قدر گرانڈیل اور قدآور نقادوں کا فیصلہ کہیں غالب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم نہ کر دے؟

خالد:۔ گھبراؤ نہیں چغتائی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کا فیصلہ غالب کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ ذہین اور ہوشمند قاری اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ نقاد جو ادراک کو محض "ادرک" کی جمع سمجھتے ہیں۔ غالب سے آنکھ تک نہیں ملا سکتے ــ بندر کیا جانے ادرک کا سواد۔

چغتائی:۔ صرف یہی نہیں بلکہ یاروں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ غالب در اصل غاصب تھا۔ اس نے میر کے مصرعے چوری کئے ہیں۔ تراکیب گول کر دی ہیں۔ زمینیں ہتھیا لی ہیں۔

خالد:۔ لیکن ان کا اپنا خیال بھی تو دیکھو۔ جن کی دست برد سے میر مرحوم کا گھر بار، مکان، کپڑے لتے تو الگ کفن تک نہیں بچا اور وہ بڑے فخر سے میر کا پھٹا ہوا کرتہ پاجامہ پہن کر گلی گلی میں گھومتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میر نے اپنی زمینوں کا پٹہ ان کے نام لکھ دیا ہے اس متبنہ پن کے باوجود شعر اس قسم کے کہتے ہیں ؎

میں وہ طفلِ مکتب ہوں جس کے لبوں پر نہ غوں ہے نہ غاں ہے
ملن کیسے ہوگا میں رہتا یہاں ہوں تو رہتا وہاں ہے
ہر ایک چیز آپس میں گڈمڈ ہے ایسی کہ آدھی نہاں اور آدھی عیاں ہے
زمین سر کے اوپر ہے یا میں ہی الٹا ہوں۔ یارو بتاؤ کہاں آسماں ہے
آج کی رات نہ سونا لوگو
چور آج آپ کا در کھولیں گے
تم کمر باندھو کہ جانا ہے تمہیں ہم تو اب اپنی کمر کھولیں گے (وغیرہ وغیرہ)

ریاض:۔ لیکن پیار وچہ بات نہیں بنی ۔ میر میری ہی تھا ۔

بنا گواہ نا ملے سکا د عضد ا ہو
نانک جی فرما گئے منہ دورے تیے چکڑ ہو

خالد: میرے خیال میں انہیں دودھ میں پوست ملا کر پینا چاہیئے ۔ شاید کچھ افاقہ ہو ۔

چغتائی:۔ ہو سکتا ہے ۔ لیکن ــــ

کام اپنا تو ہے سمجھانا فقط
مان نہ مان تیری مرضی ہے

شاید آپ لوگ ابھی سیر نہ ہوئے ہوں پھر بھی میرا خیال ہے کہ شاعری ۔ طنز ۔ افسانہ نگاری اور دوسری روایات کے تسلسل پر کافی بحث ہو چکی ہے ۔ مجھے نظر انداز نہ کیجئے ۔ میرے فن کی روایات پر بحث کے بغیر یہ مکالمہ ابھی تک نامکمل رہے گا ۔

خالد:۔ تم بھی ہانک لو میرے یار ــ کوئی بات نہیں ۔ لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ مصوری میں محسوسات اور تخیل کی درمیانی کڑی عقل کو غیر ضروری قرار دینے کے بعد مصور جب نظری حقیقتوں کی موجودگی کو غیر موجود قرار دیتا ہے تو کیا وہ حق بجانب ہوتا ہے ۔

چغتائی:۔ بات دراصل یہ ہے کہ اگر مصور کا محسوساتی نقطہ باقاعدہ منجمد ہو چکا ہے اور "لذت" "وارفتگی" "حسن مزاح" "خوش نظری" "مشرقی خطاطی" "فارسی مسودے" "توسین" "دائرے" "مافوق الحیات" "بے ساختگی" یہ سب چیزیں مصوری کی نغماتی کیفیت کا آئینہ ہیں تو مصور اپنے فن میں کامیاب ہے ۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہے کہ جب زمان و مکان زینۂ بیچاں بنا کر عالم درجات میں یوں جذب ہو جاتے ہیں کہ نیند نیند نہیں رہتی ۔ بے خوابی بے خوابی نہیں رہتی اور نینوں میں سکھ سما جاتا ہے تو مصور بھی عالم مکافات میں سکھ اور چین کی بنسی بجانے لگتا ہے اور پھر کون دیکھتا زمان و مکان ۔ ایٹم اور ہائیڈروجن بم ۔ جنت اور جہنم ۔ غزل اور افسانہ ۔ بھیڑیں اور مالکونس ۔ سب بیک وقت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر کینوس (CANVAS) کے اندر کے نظام میں گھس جاتے ہیں ۔ یہیں پہ کر اُدھ بلاؤ والی شرط کا اطلاق ہوتا ہے کہ اگر دیکھنے والا "کینوس" پر یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا تو سمجھ لیجئے کہ وہ ایک بیچ تھرڈ کلاس "سیڈی ام" ہے اور یہ کہ وہ مفردات کے رشتوں سے اپنے اندر احساس برتری پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے ۔ اور یہ سراسر ایک ایسے شخصی ویژن کی عدم تکمیل ہے جس کا کوئی سر پیر نہ ہو ۔ یوں ہم دیکھنے والے کی بے بصارتی اور گھپلے سے آرٹ کے دامن کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتے ہیں جس کا کہ سخت احتمال ہے ۔

ظہور:۔ جو کچھ تم نے کہا ہے بالکل واضح ہے ۔ میں اس سے ہٹ کر کچھ پوچھنا چاہوں گا ۔ کیا کلاسیکل مصوری کی روایات کا تسلسل ماڈرن آرٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی متزلزل نہیں ہو جاتا ۔ مجھے تو ماڈرن آرٹ اور کلاسیکل آرٹ میں اتنا تال میل بھی نظر نہیں آتا جو گھوڑے اور گدھے میں ہے ۔

چغتائی:۔ یہاں کلاسیکل روایات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ ماڈرن آرٹ بالکل ہٹ کے ہے ۔ یہ دو طرح کا ہوتا ہے ۔ اور دو مختلف وجوہ کی بنا پر پیدا ہوتا ہے ۔ پہلی یہ کہ وہ مصور جو کلاسک آرٹ کی حدود میں رہ کر اپنی تصویر میں کوئی خوبی ۔ کوئی ناولٹی پیدا نہیں کر سکتے ماڈرن آرٹ کا رُخ کرتے ہیں میرا مطلب ہے وہ عورت کو محض عورت اور گائے کو محض گائے بنا بنا کر بور ہو جاتے ہیں یعنی وہ گائے اور عورت کے چہرے پر کوئی ایسا جذبہ ایسا تاثر پیدا نہیں کر سکتے جو اسے دوسری گائے اور دوسری عورت سے الگ خوبصورت اور علیحدہ حیثیت دے ، تو پھر وہ یہ کرتے ہیں کہ عورت کے چہرے پر گائے اور گائے کے چہرے پر عورت کی ناک فٹ کر دیتے ہیں یا آدمی کو عجیب ٹیڑھی میڑھی بے ہنگم لکیروں کا پتلا بنا کر اس پر خرگوش کے کان لگا دیتے ہیں جو دیکھا جائے تو خرگوش کے بھی کان نہیں ہوتے صرف خر کے ہوتے ہیں ۔ ایسی تصویروں کی خود تشریح کرتے وقت وہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارا ذہن اور ہماری آنکھ بہت دور اور بہت سیچ تک دیکھتی ہے اس لئے گائے کو محض گائے اور آدمی کو محض آدمی بنانا ماڈرن آرٹ کی توہین ہے ۔ مثلاً گائے میں انھیں کتنی ہی چیزیں نظر آتی ہیں ۔ بچھڑی ۔ بچھڑا ۔ دودھ ۔ مکھن ۔ دہی وغیرہ تو پھر وہ صرف گائے ہی کیوں بنائیں اسی لئے تصویر بناتے وقت "موجود" سے متعلق جو کچھ ان کے ذہن میں آتا ہے بلا تامل بنا کے رکھ دیتے ہیں ۔ دوسری قسم ان کی ہے جنھیں کلاسک آرٹ

کی الف۔ب۔ت بھی نہیں آتی اور وہ محض کھینچا تانی کرکے اس کو ماڈرن آرٹ کا نام دیدیتے ہیں۔ یوں تو اور بھی بہت کچھ ہے لیکن آپ چونکہ میرے دوست ہیں اس لئے ماڈرن آرٹ کی تمام پیچیدگیوں سے روشناس کرا کے آپ کو بوکھلانا نہیں چاہتا۔ لہذا چند ترکیبیں جو ماڈرن آرٹ کو پاپولر کرتی ہیں باختصار پیش کرتا ہوں۔

۱۔ اپنے لئے حمایتی ثقہ نقادوں کا گروپ پیدا کرنا، اس کے لئے کٹ شارٹ یہ ہوگا کہ کسی جریدے کی ایڈیٹری فراہم کرلی جائے۔

۲۔ جس شہر میں مستقل اقامت پذیر ہو اس کی کسی ماڈرن روڈ پر مثلاً لاہور ہو تو مال روڈ کراچی ہو تو الفنسٹن اسٹریٹ پر اسٹڈیو قائم کرنا اور وہاں اپنے فن کا ڈرامیٹک مظاہرہ کرنا جیسے پیرس میں۔ جہانگیر میتھو اپنے رزمیہ فن کا باقاعدہ پبلک شو دیتا ہے۔

۳۔ پبلک کو شاک (SHOCK) کرنا۔ مثلاً اچھا خاصا سوٹ پہن کر پبلک کے جم غفیر میں مہذب انسان کی طرح چلتے چلتے ایکدم سارے کپڑے اتار کر صرف ایک لنگوٹی کا جلوہ دکھانا۔ وغیرہ وغیرہ۔

۴۔ اپنے اور اپنے حلقہ بگوش ثقہ نقادوں میں دن بدن زیادہ سے زیادہ تشہیرانہ صلاحیتیں پیدا کرنا۔

خالد:۔ میں تو ابھی سے بوکھلا گیا ہوں چغتائی حالانکہ تم نے کافی اختصار اور رحم سے کام لیا ہے۔

ظہور:۔ اب ذرا اپنے آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک رات میں سوتے سوتے چونک پڑا۔ میرے کمرے کے باہر درخت پر دو اُلو آپس میں بحث کر رہے تھے۔

پہلا اُلو:۔ چلو کمرے کے اندر چلیں۔

دوسرا اُلو:۔ نہیں وہاں ہماری برادری نہیں انسان ہمارا دشمن ہے۔

پہلا اُلو:۔ تم نرے اُلو ہو، بلکہ کاٹھ کے اُلو۔ انسان نے ہم کو مہذب بنایا۔ ہم پر احسان کیا۔

دوسرا اُلو:۔ انسان اور ہم میں کیا قدر مشترک ہے۔

پہلا اُلو:۔ اس مکان کا رہنے والا محض انسان ہی نہیں، فنکار بھی ہے اس کے چہرے پر بھی ایک سدا بہار اُلوانہ تجسس ہے۔ میں نے بارہا اس سے گفتگو کی ہے۔ دیوار کے شگاف سے جھانک کر دیکھو ہماری برادری انسان سے کتنی مانوس ہے۔

دوسرا اُلو:۔ تم انسان کے جاسوس ہو تم جاؤ میں تو واپس جاتا ہوں۔

خالد:۔ واقعی بعض دفعہ انسان اور اُلو میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو انسان اور اُلو میں روایتی تسلسل بھی پیدا ہو جاتا ہے۔

ریاض:۔ گویا کہ ہم اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں کہ کائنات میں بہت کچھ ہے۔ لیکن اسے دیکھنے کی جرات ہر کس و ناکس میں نہیں۔ ایک بڑے شہر میں مینار و گنبد کو دیکھ تو ہر شخص سکتا ہے لیکن اس پر چڑھتا کوئی کوئی ہی ہے۔ جنت کو آنکھوں میں چھپائے چھپائے پھرنا فن کا منتہا نہیں۔ جنت تو وہ ہے جو باہر آئے بقول میراجی۔ ع

پیرہن سیج پہ رکھ دے دراستادہ سے باہر آئے

اس لئے روایت کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ماڈرن مصور کی طرح ہر صنف سخن کے فنکار کو نئی روایات پیدا کرنی چاہئیں۔ یعنی جنت کو باہر لانا چاہیئے۔ اگر ہم اس نکتے کو سمجھ لیں تو سارا رونا دھونا ختم ہو جائے گا۔ پرانی جنتوں کی یاد میں رونا دھونا۔ خواہ وہ جنت میراؔ باؔئی کی ہو یا میر کی۔ نظیر آبادی کی ہو یا نظیر کی۔ جنت عبقری سے جہاں یہ رونا دھونا نظر آئے سمجھ لو کہ یہ پرانی نسل کی آواز ہے۔ تخلیق کا معاملہ جنت کو رونا نہیں ہے" بلکہ جنت کو رلانا ہے"۔ جنت کی ہجرت سے لیکر آج تک کی ہجرت تک انسان نے جس جس طرح کی ہجرت کی ہے ان سب میں اہم عقل کی ہجرت ہے۔

چغتائی:۔ ہم سب گم شدہ بچے ہیں۔ ہم سب کو اپنی گم شدہ جنت کی تلاش ہے۔ آؤ ہم ہجرت کریں — ہجرت، عقل کی ہجرت —"

مالک مکان کا قتل

● لی کاک ترجمہ

لی کاک ـــــ کی طنزیہ کہانیوں کے بارے میں آپ کو
میں کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ کیونکہ اگر میں نے بتانا شروع
کیا تو مجھے اپنا ٹائپ رائٹر کھڑکی سے باہر پھینک دینا
پڑے گا اور پھر میں بھوکوں مرنا پڑے گا۔
(ڈونلڈ سٹراوٹ)

چونکہ اب یہ بات سب لوگوں کو معلوم ہو گئی ہے کہ میں نے اپنے مالک مکان کو قتل کر دیا ہے۔ اس لئے میں یہ لازمی خیال کرتا ہوں کہ اپنی اس حرکت کی وضاحت کر دوں۔

مجھے کئی لوگوں نے یہ یقین دلایا ہے کہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تاہم میں اس مسئلہ کے متعلق بہت گہرے خیالات رکھتا ہوں اس لئے میں خود ہی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس چلا گیا اور اس کے پاس جا کر میں نے اپنی پوزیشن واضح کر دی۔ اس نے بھی مجھے بتایا کہ ایسا کرنا نہ تو لازمی ہے اور نہ ہی ایسا کرنے کا رواج ہے۔

"تم نے اپنے مالک مکان کو قتل کر دیا ہے؟" اس نے کہا۔ "بہت خوب۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں؟" میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کا قانون کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مگر اس نے اپنا سر نفی میں ہلا دیا اور مجھ سے پوچھا: "اس کا قانون کے ساتھ کس طرح تعلق ہے؟"

میں نے اُسے بتایا کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس سلسلہ میں میری پوزیشن کو ٹھیک طرح سمجھا نہیں جا رہا کیونکہ مجھے دوستوں اور یہاں تک کہ غیبیوں سے بھی مبارکباد کے پیغام موصول ہوئے ہیں۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر سب کو ٹھیک ٹھیک واقعات کا علم ہو جائے تو وہ خود محسوس کریں گے کہ وہ غلط آدمی کو مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔ مختصراً میں نے یہ بات اس پر واضح کر دی کہ میں اس مسئلہ کو کچھ پبلسٹی دینا چاہتا ہوں۔

"بہت خوب" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "اگر تم چاہو تو تم ایک فارم پُر کر سکتے ہو" اور اس نے اپنے کاغذات میں فارم کی تلاش شروع کر دی۔ تھوڑی دیر کے بعد پوچھا: "تم نے اپنے مالک مکان کو قتل کر دیا ہے یا قتل کرنے والے ہو؟" "میں نے اسے قتل کر دیا ہے" میں نے تیزی سے جواب دیا۔ "بہت خوب ہم دو عورتوں میں الگ الگ فارم استعمال کرتے ہیں" اس نے مجھے ایک لمبا سا کاغذ دے دیا جس میں الگ الگ خانے بنے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "قتل کی وجوہات کے خانے میں کیا لکھوں؟"

"میرے خیال میں یہ بہتر رہے گا کہ تم کہہ دو کوئی وجہ نہیں یا ذہنی وجوہات جو عام طور پر ہوتی ہیں" اتنا کہہ کر اس نے بہت حلیمی سے مجھے الوداع کہی اور جاتے جاتے یہ یقین دلایا کہ میں مالک مکان کو دفن کر دوں گا۔ اس کی لاش کو پڑا نہیں رہنے دوں گا۔

اس بات چیت سے میری تسلی نہ ہوئی۔ مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے کہ سپرنٹنڈنٹ قانون کی تمام شرائط پوری کر رہا تھا۔ یہ بات تو

شاہراہ

بالکل واضح تھی کہ اگر مالک مکان کو قتل کئے جانے کے واقعہ کی تحقیقات کروائی جائے تو اس کے نتائج بہت پریشان کن اور تنگ کرنے والے ثابت ہوسکتے ہیں۔

عام طور پر مالک مکان کو اس وقت قتل کیا جاتا ہے جب وہ کرایہ میں اضافہ کرتا ہے اور اس بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ مثلاً مالک مکان کہتا ہے "میں تمہارے کرایہ میں دس فیصدی اضافہ کر رہا ہوں" اور کرایہ دار جواب دیتا ہے "بہت خوب تو میں بھی تمہیں گولی سے اُڑا دوں گا" کبھی بار وہ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہناتا ہے اور کبھی بار ایسا نہیں کرتا۔

مگر میری بات اس سے بالکل مختلف ہے۔ حال ہی میں کرایہ داروں کی قومی لیگ نے مجھے سونے کا میڈل دینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے حالات اور بھی خراب ہوگئے ہیں۔

مجھے وہ دن خوب یاد ہے جب میں (اور میری بیوی نے یہ فلیٹ کرایہ پر لیا۔ مالک مکان نے خود ساتھ جا کر مجھے سارا فلیٹ دکھایا اور مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کے رویہ میں کوئی بات نہ تھی جس سے کوئی کوئی غیر معمولی احساس پیدا ہوتا ہو۔

صرف ایک چھوٹی سی بات میرے ذہن میں جمی ہوئی ہے۔ اس نے اس بات کے لئے افسوس ظاہر کیا کہ فلیٹ میں کافی الماریاں نہیں ہیں۔

"اس فلیٹ میں کافی الماریاں نہیں ہیں" اس نے کہا۔

اس کو اس طرح بات کرتے سُن کر میں کچھ عجیب وغریب احساسات میں پھنس گیا۔ "مگر دیکھئے" میں نے کہا "رسوئی گھر کے ساتھ میں سامان کا کمرہ کتنا بڑا ہے؟"

مگر اس نے جواب میں اپنا سر ہلا دیا۔ اور اس بات کا ذمہ لیا کہ فلیٹ میں کافی الماریاں ہیں۔ وہ کہنے لگا "مجھے چند الماریاں بنانی چاہئیں"

دو ہی ماہ بعد اس نے نئی الماریاں بنا دیں اور پھر مجھے حیرانی ہوئی۔ خصوصاً اس بات پر کہ نئی الماریاں بنانے کے بعد اس نے مکان کا کرایہ نہ بڑھایا۔ میں نے پوچھا "کیا تم کرایہ نہیں بڑھا رہے" اور اس نے جواب دیا "نہیں۔ ان الماریوں پر میرا صرف اڑھائی سو روپیہ خرچ ہوا ہے"

"مگر بھائی یہ تو تم بخوبی جانتے ہو کہ اڑھائی سو کا سالانہ سُود تین سو بنتا ہے"

اس نے یہ بات تسلیم کی۔ مگر کہا کہ اس کے باوجود وہ کرایہ میں اضافہ نہیں کرے گا۔ اس بات پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کے دماغ میں کچھ خرابی ہے۔ مگر اُس وقت میرے دماغ میں اسے قتل کرنے کا کوئی خیال تک نہیں تھا۔

اس کے بعد کوئی خاص اہم بات نہ ہوئی۔ مگر موسم بہار میں ایک دن اچانک مالک مکان میرے گھر آیا۔ اس طرح اندر گھس آنے پر معذرت ظاہر کی۔ (یہ اپنے آپ میں شکوک کا کھٹکا) اس نے اعلان کر دیا کہ وہ سارے فلیٹ میں نیا پلستر کروانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر اس نے میرے احتجاج پر قطعی کوئی توجہ نہ دی۔

میں نے کہا "بھائی یہ پلستر صرف دس برس پُرانا ہے" اس نے جواب میں کہا "ٹھیک ہے مگر اس طرح میں پلستر کروانے کا خرچہ دگنا ہو گیا ہے" "بہت خوب۔ اگر تم پلستر کروانا چاہتے ہو تو تمھیں کرایہ میں بیس روپیہ ماہوار اضافہ کرنا ہوگا" میں نے بہت سختی سے جواب دیا۔

"میں بالکل اضافہ نہیں کروں گا" اس نے جواب دیا "اس سے ہمارے درمیان بہت سردمہری پیدا ہوگا"

اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جو بہت اہم ہے۔ یہ تو سب کو یاد ہے کہ مکان کی تعمیر کے خرچہ میں بھاری اضافہ کے باعث کرائے بڑھائے گئے تھے۔ مگر میرے مالک مکان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔

"بھئی مکان بنانے کا خرچہ تو سو فیصدی بڑھ گیا ہے۔ تم کرایہ کیوں نہیں بڑھا رہے؟" میں نے کہا۔

"بہت خوب۔ مگر میں تو نئے مکان نہیں بنا رہا۔ مجھے اس سے پہلے اپنے سرمایہ پر ۱۰ فیصدی آمدنی ہوتی تھی۔ اور اب بھی اتنی ہی ہوتی ہے" اس نے جواب دیا۔

"اپنے بیوی بچوں کا تو خیال کرو" میں نے اسے کہا۔

"میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں کروں گا۔"

"یہ تمہارا فرض ہے۔ میں نے ابھی کل ہی ایک اخبار میں ایک مالک مکان کا ایک خط دیکھا ہے۔ ایک بہت خوبصورت خط جس میں اس نے کہا ہے کہ چونکہ مکان بنانے کا خرچہ بڑھ گیا ہے۔ اس لئے اس کے لئے اپنی بیوی بچے کا خیال کرنا لازمی ہے۔ چنانچہ وہ کرایہ بڑھا رہا ہے۔"

"مجھے اس بات کی کوئی پروا نہیں۔" اس نے جواب دیا "میں شادی شدہ نہیں۔"

"ہوں۔ تو تم شادی شدہ نہیں۔" میرے خیال میں یہ پہلی بار تھا کہ میرے باغ میں یہ خیال آیا کہ مجھے اس کو قتل کر دینا چاہیئے۔

اس کے بعد نومبر کا مہینہ ہوا۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ جنگ بند ہونے کی خوشی میں کرایہ میں ۵۰ فیصدی اضافہ کیا گیا تھا۔ مگر میرے مالک مکان نے اس خوشی میں بھی شریک ہونے سے انکار کر دیا۔

اس کے اندر جب وطنی کی اس کمی پر مجھے بہت غصہ آیا جب مارشل صاحب خوشی میں کرایہ میں ۲۵ فیصدی اضافہ کیا گیا تو اس وقت بھی اس کا رویہ یہی رہا۔ یہ اضافہ جنگ سے واپس آئے سپاہیوں کی عزت افزائی کے طور پر کیا گیا تھا۔

یہ بالکل وطن پرستانہ تحریک تھی۔ جو خود بخود طور پر اُبھری۔ میں نے کئی سپاہیوں کو یہ کہتے سُنا ہے کہ یہ ان کا سواگت تھا اور وہ اس کو ساری عمر بھر نہیں بھولیں گے۔

کچھ عرصہ بعد جب پرنس آف ویلز آئے تو کرایہ میں ایک بار پھر اضافہ کر دیا گیا۔ شہزادہ کا اس سے بہتر سواگت کیا ہو سکتا تھا۔ مگر میرا مالک مکان اس وقت بھی خاموش رہا۔ اس نے کرایہ میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ وہ یہی کہتا رہا "مجھے اپنے سرمایہ پر ۱۰ فیصدی آمدن ہو رہی ہے اور یہ میرے لئے کافی ہے۔" اب مجھے یقین ہو گیا کہ اس کا دماغ بالکل خراب ہے۔ چنانچہ میں نے کچھ کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

اصلی سنکٹ تو گذشتہ ماہ آیا۔ جب جرمنی کے لئے مارک کی قیمت میں کمی پورا کرنے کے لئے کرائے بڑھا دیئے گئے۔ ایسا کرنا بالکل درست کاروباری بات تھی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو جرمن اپنے سستے مارک کو استعمال کر کے ہمارے مکان ہم سے چھین لیتے۔

میں نے تین دن انتظار کیا۔ مگر مجھے کرایہ میں اضافہ کا کوئی نوٹس نہ ملا۔ چنانچہ میں اپنے مالک مکان کے گھر گیا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں مسلح تھا۔ مگر اس کے جواز میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرا واسطہ ایک ایسے آدمی سے پڑا تھا جس کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کئے بغیر براہ راست بات شروع کی۔ اور کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جرمنی کے سکّے مارک کی قیمت گر گئی ہے۔"

"ہاں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"صرف اتنا۔ تم کرایہ بڑھانے کے لئے تیار ہو یا نہیں۔"

"نہیں" اس نے ضدی انداز میں جواب دیا۔

میں نے اپنا ریوالور اٹھا کر گولی چلا دی۔ میں نے کل چار گولیاں چلائیں۔ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ مر چکا ہے۔

میں نے اسے اسی طرح چھوڑ دیا۔ اور سیدھا پولیس کے پاس اطلاع دینے چلا گیا۔ اگر اس کے باوجود کرایہ داروں کی قومی لیگ مجھے میڈل دینا چاہتی ہے تو اس کی مرضی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ ساری بات بالکل واضح کر دی جائے۔

بی آزادی کی کہانی

اودھ پنچ سے

اوراقِ پارینہ

اودھ پنچ اُردو کا پہلا اخبار ہے جس کی ایک پالیسی بھی تھی سیاسی مسائل کے بارے میں بھی اور سماجی اور تہذیبی معاملات کے بارے میں بھی۔ مگر ہر مسئلہ کے بارے میں وہ اپنے اسی مخصوص مزاحیہ انداز میں رائے زنی کرتا تھا اس میں ایسی تحریریں بھی ہیں کہ پُرانی ہونے پر بھی پُرانی نظر نہیں آتیں۔

قصہ مختصر جب بی آزادی پیدا ہوئیں تو ان کے ماں باپ نے بڑی دھوم سے چھٹی کی ناچ رنگ کی دعوتوں کے جلسے پر لوگوں کو مٹھی بھر بھر انعام دئے۔ جوڑے باگے تقسیم کئے۔ دوہری دوہری اَنائیں نوکر ہوئیں۔ چاپکلائیاں باری بھرتی تھیں۔ بڑے مان گون سے پروان چڑھیں۔ اب دودھ بڑھائی کے بعد شادی کا ذکر کیا یہی ایک اکلوتی بیٹی۔ بھولی آنکھ کا تارا۔ سارے گھر بھر کی جان ایمان۔ اندھیرے گھر کا اُجالا اور خدا کا دیا سب کچھ جو نہ ہوتا وہ تھوڑا تھا۔

چٹ منگنی پٹ بیاہ

ادھر سُننے خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ ان کے ماں باپ تجارت پیشہ تو تھے ہی۔ کسی تقریب سے انھیں اپنا اصلی وطن چھوڑ کے نقل وحرکت کی نوبت آ گئی۔ دوسرے شہروں میں وارد ہوا۔ ادھر یہ بھی بھردل جوان ہوگئیں بیٹھتیں کیوں کر، چاہا کہ کسی نہ کسی کے پلے باندھ دیں۔ لیکن بڑا غضب یہ کہ وہاں تازہ وارد، ایک تو یہ کہ اچھی طرح کسی کے چال چلن اور حقیقت سے واقف نہیں۔ دوسرے ایسی ایسی نیک بختیں گھسیں کہ آسمان پھاڑیں اور تھگلی لگائیں۔ انھیں میں ایک کودھ جوڑی دقاقہ تھی اس نے وہ باغ سبز دکھایا اور ایسا شیشہ میں اُتارا کہ مرزا مغل بیگ تخلص آزاد کے ساتھ چٹ پٹ منگنی ٹھہری تو گئی اور دولہ والے تھوڑی بہت مٹھائی لا پھرے پان کا بیڑا کھلا گئے۔

بی آزادی کی شادی

اب لیجئے بات قرار پاتا تھا کہ شادی کی دھوم دھام ڈالی تقاضے شروع ہوگئے۔ نہیں صاحب ہم بیاہ مانگنے آتے ہیں۔ اب زیادہ بات کو کون بڑھائے، جوں توں مانجھے کی تاریخ قرار پاگئی اور کھانے جوڑے اور دودھ پلائی کا مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ آخر ہزار خرابی بڑی تعائیں مٹھائیں سے رو جھینک کے مانجھا مہندی ساچق برات، چوتھی، اجالے وغیرہ سے بھی نجات پائی۔ اب نئی نئی بات اوائل بیاہ چوچلوں کا کیا پوچھنا۔ میاں کیا مٹھو بیٹے تھے۔ ہر گھڑی بیوی بیوی کا کلمہ پڑھتے تھے آٹھ پہر آئینے کی طرح سامنے دھرے ہیں کسی کام میں کوئی عذر نہیں۔ چوکی میں لوٹا تک رکھنا فخر و سعادت۔ غرضکہ لینے دینے کی گھاتیں خوب ہی برتی گئیں لیکن سب دنیا سازی، بناوٹ۔

فضیحتا

مہینے دو مہینے کے بعد لگی جوتیوں میں دال بٹنے۔ بالکل اختلاف۔ ایک کہے دن دوسرا کہے رات۔ یہ کہے زمین وہ کہے آسمان۔ یہ کہے آم وہ کہے

املی - ایک مغرب دوسرا مشرق - آئے دن کی لڑائی ٹھکا فضیحتی - جوتی پیزار - جب دیکھو بیوی کی ڈولیا کے پکوائی جاتی ہے - میاں کے پٹے ان کے جو نئے رو بچے کے تکانے کیطرح تو بنے ہوئے پڑے ہیں (بہت تری ہندوستان کی رسم کا ستیاناس جائے - اگر پہلے سے ان باتوں کی آزمائش، دیکھ بھال - ایک دوسرے کی خو بو سے واقف ہو جائے تو یہ خرابی کیوں واقع ہو) خیر آمدم بر سر مطلب - اب تقدیر کے بگاڑ کی باتیں سُنیئے - سامان ہی کچھ اور ہو گئے - پہلی بسم اللہ ہی غلط ہوئی کہ شادی بیاہ کرنے والے اپنے گھر چلے گئے - دوسرے جن سے سابقہ وہ ایسے بھلے مانس - پکی بیری کے تلے مرنے والے - احدی - افیونی - جواری نشہ باز پنج عیب شرعی، طرہ یہ کہ جتنے یہ ناکارے مجہول - بے حیا - مفت خور - جاہل - بدکردار - اتنی ہی بیوی تربیت یافتہ - پڑھی لکھی - دست و قلم - عقیل و فہیم - گن ونتی - دسوں انگلیاں دسوں چراغ - چالاک - ہوشیار - پھر پنے تو کیوں کر بنے اور رہو تو کیا ہو - سو اتو تو میں میں کے - اس کے سوا پیٹ بڑا ظالم ہے کھائے بغیر بنتی نہیں، آئے کہاں سے - میاں نوکر نہ چاکر، نہ کوئی بنج نہ بیوپار - مفت خوری کے عادی - حد کے بے حیا - چندے گرستی بیچ کر گزران کی - مال اسباب کے خورد ہے کئے - تھوڑے عرصہ میں وہ بھی جان تلنے کا چھلا اور گوٹے کا تار تک باقی نہ رہا - ننگے بچے ہو گئے اور کبھی بھوکے چوکے بیوی نے کسی بات کو کہا کچھ مانگا تو صاف ٹکڑا توڑ کے جواب دیا کہ سنو خدا نے تمہیں بھی آنکھ - ناک - ہاتھ پاؤں دیئے ہیں - تمہیں کوئی صورت نکالو چار پیسے پیدا کرو - چلو ایک نکتا ہے - دوسرا ہی کچھ کام کرے اور میں جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں کوئی صورت نظر نہیں آتی - چار طرف آگ لگی ہے - باقی فکر سے خالی نہیں - خدا مالک ہے دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے - کیا زمانہ ہمیشہ برخلاف رہے گا - ابھی دیکھیئے اونٹ کس کروٹ بیٹھے -

نالشی فریادی

آخر کو مجبور مرتا کیا نہ کرتا - ایک دن بی آزادی خانم تنگ آ کے شہر کے قاضی سے رجوع کی کہ مولوی صاحب اپنے خدا کو مان کے اس موئے نکھٹو سے ایک کی دو کرا دیجئے یہ نانصیب کسی کام کا نہیں - پیچھا چھوٹے - میں چار گلی کی بھیک مانگ کھاؤں گی - قاضی جی بھی کتاب اٹھا اِدھر اُدھر کی ورق گردانی کرنے لگے - آخر تھا کیا وہی مُلّا کی دوڑ مسجد تک - ایک شرعی خدمتگار کو بھیج کر میاں کو بلوایا اور خدا رسول کی باتیں سمجھانے لگے کہ یا تو موافق حکم کے خبرگیری قرار واقعی کرو نہیں تو مہر ادا کر کے طلاق دو - وہاں کیا تھا اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ خود خدا سے چاہتے تھے یہ تو گھر بیٹھے خضر ملے - بے ساختہ گھبرا کر کہنے لگے - سُنیئے جناب آپ حاکم شرع ہیں - یہ دونوں چیزیں میں کہاں سے لا کے دوں اور اگر مہر ہی ادا کر سکتا تو روٹی کپڑا دینا کیا زہر تھا - اب رہی طلاق ایک تو آپ کی خاطر سے - دوسرے جس سے سابقہ پڑا ہے جب وہی رضامند نہیں تو کیا میں زبردستی کروں گا - میں نے طلاق دی میرے خدا نے طلاق دی - لیجئے طلاق - طلاق - طلاق - میں کہتا ہوں جو طلاق نہ دے اس کی سات پشت پر تین طلاق -

طلاق

بھئی واہ قاضی جی نے اچھا ڈھکوسلا نکالا کہ ہینگ لگی نہ پھٹکری خالی دو باتوں میں نکاح اور دھیر ڈالا اور فارغ خطی کا ایک پرزہ اعمالنامے کی طرح بی آزادی خانم کے ہاتھ میں دیا کہ جاؤ چین کرو اور گھر دیکھو - اب حق حیران ہکا بکا کھڑی ہیں کہ الٰہی کدھر جاؤں کیا کروں اور اس دو انگل کے پُرزے کو کیا شہد لگا کے چاٹوں اسی سوچ بچار میں سوا گز کا ہونٹ لٹکا اپنا رستہ لیا - اور دل سے تجویز کیا کہ آؤ کچھ دن نئی ملاقاتوں اور نئے صاحب سلامتوں میں ایام گذاری کرو لیکن نصیب برگشتہ مقسوم میں آگ لگی ہوئی کسی نے سیدھی طرح بات بھی نہ کی - جدھر گئیں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں - جن لوگوں پر دعوئی اور ناز تھا انھیں کو دیکھا کہ بالکل جھوٹے دغا باز وقت پر صاف دھوکہ دے گئے -

الغرض کچھ دنوں امید انشاء اللہ پشتم پشتم دن گذارے - جب دیکھا کہ کہاں تک ٹھوکوں ستو ملنئے - اب یہ کام چلائے نہیں چلتا تو جان بچانے کو بموجب مثل سب طرف سے ہارے تو چلے تان پارے، ہو رہا بدہناد ہائے اپنے وطن کا رستہ لیا - چلتا دھندا کیا - پھر نہیں معلوم کیسی گذری کیسی بنی - خدا جانے کہ جیتی ہیں کہ خدا گنج کا سفر کیا - جیتی ہوں تو خدا زندہ رکھے اور مر گئی ہوں تو خدا بخشے -

قلم گھسیٹ

● اُپندر ناتھ اشک

آزادیٔ تحریر

اپنے ہندوستانی آئین میں نہ مارکیٹ سے قلم خریدنے پہ پابندی ہے نہ قلم کے استعمال پہ —— قلم آزاد ہے چاہے سہرا لکھے، چاہے خطبۂ استقبالیہ لکھے، چاہے معمّہ کمپنی کا معمّہ لکھے۔ اشک کو قلم کی یہ آزادی ایک ٹریجڈی نظر آتی ہے شاید اسی لئے اس نے یہ کامیڈی لکھ دی۔

قلم گھسیٹ کا مطلب صاف ہے —— ایسا ادیب جو سراسر قلم گھسیٹتا چلا جائے۔ لیکن ہم ایسے ادیبوں کو جن میں ایک لا محدود صلاحیت ہے اور جو اپنی آمد کو دیکھ کر کہہ اُٹھتا ہے۔ ع

بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

اور پھر مضمون پہ مضمون، کہانی پہ کہانی اور نظم پہ نظم لکھتا چلا جاتا ہے۔ کیا ہمیں بھی قلم گھسیٹ کہا جائے گا یا ..... نہیں! —— اگر کوئی ادیب اچھا نہیں لکھتا۔ تو ہم حقارت سے اسے ادیب کی بجائے شدیب کہہ دیں گے۔ اور اگر زیادہ لکھنے کے ساتھ ساتھ اچھا بھی لکھتا ہے تو ہم اُسے بلند تخیُّل کا مالک اور فاضل ادیب کے نام سے موسوم کریں گے تو پھر وہ "قلم گھسیٹ" نام کا جو کہنا ہے ؟ ظاہر ہے کہ جو قلم گھسیٹتا ہے وہ قلم گھسیٹ ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ جو خواہش بے خواہش قلم گھسیٹنے پر مجبور ہے تو شاید ہم اس لفظ کے مفہوم کا صحیح اظہار کریں گے۔ قلم گھسیٹ کو انگریزی میں HACK WRITER. کہتے ہیں۔ ڈکشنری میں اس لفظ کے کئی معنی لکھے ہیں کہ

(۱) فعلی طور پہ۔ کاٹنا، پُرزے پُرزے کرنا، پرخچے اُڑانا۔

(۲) اسمی طور پہ۔ باربردار جانور۔ بھاڑے کا ٹٹو۔ اور محنتانہ لے کر دوسروں کے لئے اپنی مرضی کے خلاف کام کرنے والا۔

اور یوں دیکھا جائے تو یہ انگریزی لفظ قلم گھسیٹ نامی جیو کی تمام خوبیوں اور خامیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ قلم گھسیٹ۔ قلم اور پھر جو کچھ بھی سامنے آئے، کہانی ہو، ترجمہ ہو، اشتہار ہو، تقریر ہو۔ کسی لیڈر کی تعریف میں لکھا جانے والا قصیدہ ہو یا کسی دولت مند آدمی کے لڑکے کا سہرا۔ بلا سوچے سمجھے اس کے پُرزے اُڑا دیتا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں کہ وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اس میں مرضی کا نہیں بلکہ اس کے محنتانہ کا دخل ہے۔ اس کا قلم کتنی تیزی سے سامنے پڑے ہوئے کام کی دھجیاں اُڑا دیتا ہے اس کا انحصار اسے ملنے والے محنتانہ پہ ہے۔ شاید اس کے گھر میں ایک بیمار یا لڑاکا یا چڑچڑی بیوی اور کلبلاتے یا سکول جانے ہوئے کئی بچے ہوں۔ یا اگر وہ شادی شدہ نہیں ہے تو اپنے چھوٹے بھائیوں کی پڑھائی کا بوجھ یا اپنی بہنوں کے بیاہ کی پرابلم اس کے سامنے مُنہ کھولے کھڑی ہو یا پھر اس کی بوڑھی ماں یا بوڑھا باپ بیمار ہو اور مہنگے ڈاکٹر اور دوائیاں اسے مسلسل قلم گھسیٹنے پر مجبور کر رہی ہوں وہ اپنے فرض کی پرواہ کئے بغیر جو بھی سامنے آتا ہے گھسیٹ دیتا ہے۔ کام کے بوجھ سے دب جاتا ہے اور اُف تک نہیں کرتا۔ حالات کے کوڑے مسلسل اس کی

پیٹھ پر پڑتے رہتے ہیں اور دوہارے ہوئے من اور تھکے ہوئے تن سے قدم بڑھاتا چلا جاتا ہے وہ باربردار جانور نہیں تو اور کیا ہے؟

وہ ادیب ہے۔ قدرت نے اسے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے بہت بڑی صلاحیت دی ہے۔ اس نے کبھی عظیم افسانہ نگار ڈرامہ نویس یا شاعر بننے کے خواب دیکھے ہیں۔ لیکن اب تو اسے ان خوابوں کی یاد بھی نہیں آتی۔ شروع شروع میں اس نے ہمیشہ چاہا تھا کہ وہ وہی کام ہاتھ میں لے جو اس کے من کو پسند ہو۔ اس نے کوشش بھی کی تھی کہ وہ کہانیاں لکھ کر اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالے گا لیکن اسے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ادب لکھ کر اتنے روپے کمانا کہ اس کے بیوی بچے پل سکیں، بھائی تعلیم حاصل کر سکیں، بہنوں کا بیاہ ہو سکے یا ماں باپ کی بیماری کے لئے مہنگی دوائیاں خریدی جا سکیں ناممکن ہے اور اس نے پہلے دوسرے ممالک کی اچھی کہانیوں کو ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ بڑی محنت سے وہ یہ کام کرتا اور ہفتہ وار رسالوں اور ماہناموں سے دس پانچ مل جاتے لیکن مہینے میں وہ اتنا بھی نہ کما پاتا کہ اُسے کمانا کہا جائے۔ پھر اچانک ایک جاسوسی ناول چھاپنے والے ان پڑھ لیکن امیر پبلشر نے اس سے کہا کہ وہ اتنی مشکل سے کہانی ترجمہ کرتا ہے اور اُسے صرف پانچ دس روپے ملتے ہیں۔ اگر وہ اس کے لئے اپنا چھوٹا سا ناول لکھ دے تو وہ ساٹھ ستر روپے اور اگر ناول بڑا ہو تو سو روپے تک دے سکتا ہے۔ قلم گھسیٹ کو جاسوسی ناول لکھنا بہت نہایت گھٹیا سا کام لگتا تھا۔ اس نے ٹالنے کے لئے کہا۔

"مجھے جاسوسی ناول لکھنا نہیں آتا۔"

"اس میں کون سی مشکل ہے؟" پبلشر نے کہا۔

"کباڑی بازار میں جا کر انگریزی کے کچھ پرانے جاسوسی ناول خرید لائیے۔ جو اچھا ہو اس کی بنیاد پر ناول لکھ ڈالئے۔ نام وغیرہ بدل کر اسے ہندوستانی بنا دیجئے۔ بس یہ نقل اگر ہمیں پسند آگئی تو پچاس ساٹھ روپے دے دیں گے۔"

"نقل!" قلم گھسیٹ نے نفرت سے پبلشر کی طرف دیکھا۔ اس کا خون ابھی گرم تھا اور ادیب بننے کے خواب ابھی پوری طرح ٹوٹ نہیں پائے تھے۔

"ایسی نقل تیار کرنا میرے بس کا روگ نہیں" اس نے کہا۔ "اچھی ناول یا کہانی کی ضرورت ہو تو میں لکھ دوں گا۔"

لیکن حالات نے اسے کباڑی بازار جانے، جاسوسی ناول خریدنے، اس کا ترجمہ کرنے اور اس ان پڑھ پبلشر کے سامنے لے جانے اور سونہیں ساٹھ نہیں، پچاس نہیں بلکہ تیس روپے لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے خوابوں کی سنہری اور ریشمی چادر میں یہ پہلا پیوند تھا لیکن یہ تو پہلے کی بات ہے جب آتش جواں تھا۔ اب تو چادر میں ریشم کا کہیں بتہ ہی نہیں بس پیوند ہی پیوند نظر آتے ہیں:۔ جہاں تک

اچھا ادیب اپنی پسند کے مطابق اچھی کہانیاں، ڈرامے یا نظمیں پڑھتا ہے۔ چھوٹی سی لائبریری بناتا ہے اور محنت سے اپنے آرٹ میں ماہر ہو جاتا ہے۔ اس کی طرح قلم گھسیٹ کا بھی ایک فن ہے جس میں قلم گھسیٹ نے مسلسل محنت اور تجربے سے بہت مہارت حاصل کر لی ہے۔ بھان متی کے پٹارے کی طرح اس کی اپنی لائبریری ہے۔ اس میں کباڑی بازار سے خریدے ہوئے جاسوسی اور عشقیہ ناول ہیں۔ اخباروں اور رسالوں میں چھپے ہوئے مختلف اشتہارات کی فائلیں ہیں۔ الگ الگ لفافوں میں مختلف مضامین کے تراشے ہیں۔ ایک میں کھیلوں پر تو دوسرے میں صحت کے بارے میں۔ تیسرے میں جنسیات پر تو چوتھے میں فیشن پر۔ پانچویں میں بڑے لیڈروں کی تقریریں ہیں تو چھٹے میں دنیا کی مشہور ہستیوں کے حالات زندگی درج ہیں۔ پھر ایک فائیل میں لیڈروں، مینیجنگ ڈائرکٹروں۔ بڑے بڑے افسروں کو آمد اور تبادلے پر پیش کئے جانے والے اعزازی خطبے ہیں تو دوسری میں دولہے کے سہرے اور دلہنوں کو دی جانے والی دعائیں ہیں۔ ان سب موضوعات پر قلم گھسیٹ کم سے کم نوٹس پر دل پسند چیزیں تیار کر دیتا ہے۔

کسی بڑے لالہ کے بیٹے کی شادی ہے ان کی خواہش ہے کہ جب بارات اُن کے سمدھی کے یہاں جائے، دولہا سہرا باندھے تو ان کے دوست دو سہرے پڑھیں جس میں دولہا کے حسن کی تعریف کے ساتھ اس کے والد کی ثروت، دریا دلی اور ہنس مکھ طبیعت کا ذکر

ضرور ہو۔ لیکن ان کی بدقسمتی کہ اُن کے دوستوں میں کوئی بھی شاعر نہیں۔ شاعری کرنا تو دور رہا شاعری کو سمجھنے کا سلیقہ بھی کسی میں نہیں۔ ان کے فرزند کے احباب میں ایک صاحب فلمی گانے بڑی بے سُری اور بھونڈی آواز میں گا لیتے ہیں۔ دوسرے فلموں کے ہیرو اور ہیروئنوں کے پوشیدہ راز بتا کر اپنے دوستوں کو خوش کر سکتے ہیں۔ ایک تیسرے ہیں جو نت نئے فیشنوں کے بارے میں دوستوں کو واقفیت بہم پہنچاتے ہیں۔ اور چوتھے عشق کی کہانیاں سُنانے میں مشّاق ہیں لیکن ان میں سے شاعر کوئی نہیں۔

لالہ جی کے اپنے دوستوں میں سے دو حضرات مٹھائیوں کے بارے میں ماہرانہ رائے دے سکتے ہیں۔ تیسرے چاٹ کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں اور چوتھے بھنگ رگڑنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن شاعری کس چڑیا کا نام ہے یہ اُن میں سے کوئی نہیں جانتا۔ اور لالہ جی ہیں کہ فرزند کی شادی پر سہرا پڑھوانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ بات یوں ہوئی کہ وہ ایک بار اپنے بیرسٹر دوست کے لڑکے کی شادی پر گئے تھے جب اُن کے بیٹے کا سہرا بندھا تو دولہا کے ایک دوست نے بڑا سہرا پڑھا۔ لڑکے کی جو تعریف کی سو کی لیکن بیرسٹر صاحب کی بہت تعریف کی۔ بڑے چوڑے سنہری فریم میں جڑا ہوا خوبصورت سُنہری حروف میں چھپا ہوا سہرا جب دولہا کے دوست نے پڑھا (ایک ایک کاپی اس تقریب میں شریک ہونے والے لوگوں میں تقسیم کی گئی) تو لالہ جی کی آنکھیں اپنے بیرسٹر دوست کے چہرے پر ٹھہری ہوئی اس کے کھلتے ہوئے رنگوں کو دیکھتی رہیں اور تبھی انھوں نے طے کیا تھا کہ جب ان کے صاحبزادے کی شادی ہوگی تو وہ دو سہرے پڑھوائیں گے۔ اپنے دوستوں سے انھوں نے کہا کہ چاہے پیسے بھی ہوا در جتنا خرچ ہو، سہرے لکھوائے جائیں، سُنہری حروف میں چھپوائے اور سنہری فریموں میں جڑوائے جائیں۔

چنانچہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے لالہ جی کے دوست قلم گھسیٹ کے یہاں آئے۔ بہت زیادہ مصروفیت کا بہانہ بناتے ہوئے (کہ یہ بھی اُن کے فن کی ایک شاخ ہے) قلم گھسیٹ نے مجبوری ظاہر کی کہ وہ ایک سپاسنامہ لکھ رہے ہیں جو کل ہی اسے دے دینا ہے۔ لیکن لالہ جی کے صاحب یوں خالی ہاتھ لوٹنے والے نہ تھے۔ پتھر دل کیسے موم ہو جاتے ہیں یہ سب وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے منت سماجت کی اور کہا کہ زیادہ وقت ہوتا تو وہ کہیں اور چلے جاتے لیکن بارات تین دن میں جانے والی ہے اور لالہ جی فوراً چاہتے ہیں اور ایسے مشکل وقت میں کوئی دوسرا اُن کے آڑے نہیں آسکتا اور پھر انھوں نے بیس روپے پیشگی قلم گھسیٹ کے سامنے رکھ دیئے اور باقی تیس روپے دونوں سہرے ملنے پر دینے کا وعدہ کیا۔ تب بظاہر منہ بناتے ہوئے (لیکن دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے) قلم گھسیٹ نے بیس روپے جیب میں ڈال لئے اور کہا کہ لالہ جی کی وہ بہت عزت کرتا ہے۔ ان کا حکم کیسے ٹال سکتا ہے۔ وہ رات بھر جاگے گا اور بھگوان نے چاہا تو صبح انھیں دونوں سہرے دے دے گا۔

"ذرا لالہ جی کی تعریف کرنا نہ بھولئے گا" لالہ جی کے دوست بولے۔

"آپ فکر نہ کیجئے۔ لالہ جی کیا۔ ان کے دُور نزدیک کے سبھی رشتے داروں، دوستوں اور پڑوسیوں تک کی تعریف کر دوں گا" قلم گھسیٹ نے یقین دلایا۔

اُن کے جانے کے بعد قلم گھسیٹ سہروں کی فائل نکالتا ہے۔ چونکہ سہرے دو لکھنے ہیں اس لئے ایک لمبی بحر کا اور دوسرا چھوٹی بحر کا چننا چاہیئے اور پھر تھوڑی سی تبدیلی کے بعد ایک اچھے سے کاغذ پہ خوبصورت الفاظ میں لکھ کر وہ سہرے تیار کر دیتا ہے۔

تبدیلیوں کی ضرورت ناموں کی وجہ سے پڑتی ہے کیونکہ سہرے میں دولہا، اس کے والد اور دادا کا نام اگر آجائے تو سونے پہ سہاگہ ہو جاتا ہے۔

لالہ جی کا نام بھگوان داس ہے اور لڑکے کا روشن لال۔ قلم گھسیٹ لکھتا ہے ؎

ہوئے بھگوان کے داس کے تم داس اے روشن
تو سہرے پہ نچھاور کیوں نہ ہوں پھولوں بھرے دامن

دادا کا نام ہے روپ لال۔ قلم گھسیٹ اس نام کو نٹ کرنا نہیں بھولتا ؎

مبارک روپ کے اس باغ میں کھل کر بہار آئی
لئے پھولوں کی پریاں ساتھ میں دیوانہ وار آئی
گلوں میں یہ سنہرے تار کیسے جگمگاتے ہیں
کھلا ہے روپ کا بازار تارے رشک کھاتے ہیں

اور باقی کے شعر قلم گھسیٹ یوں ہی رہنے دیتا ہے۔ دوسرے سہرے کو وہ کچھ یوں لکھتا ہے ؎

سہرا تیرا گوہر ہے
سہرا تیرا اختر ہے
رُخ تیرے روشن
اک ماہ منوّر ہے
کیا حُسن کا پیکر ہے

اور یوں وقت پر دونوں سہرے تیار کر کے قلم گھسیٹ وعدے کے روز دے دیتا ہے، باقی تیس روپے کیونکہ ایک دم مل جاتے ہیں اس لئے گاہک کو آئندہ پکا کرنے کے خیال سے وہ ان پر اتنی مہربانی کرتا ہے کہ دولہے کے دوستوں کو بُلا کر اُن میں سے دو بانکے جوانوں کے نام اُن دونوں سہروں کے آخری شعروں میں فٹ کر دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ سہرے کی ریہرسل بھی انھیں اچھی طرح کرا دیتا ہے۔

اس کام سے نبٹ کر وہ پھر پُرانے کام کو ہاتھ لگاتا ہے۔ شہر میں ایک بڑی کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر آ رہے ہیں۔ وہ کھانڈ بنانے والی کئی ملوں کے منتظم ہیں۔ شہر کے بیوپاریوں کی سنڈیکیٹ سے اُسے کبھی کبھار کام ملتا ہی رہتا ہے اس لئے پیشگی وہ مانگ نہیں سکتا لیکن اگر آئندہ کام لینا ہے تو یہ سپاسنامہ وقت پر دینا ہوگا۔ چنانچہ وہ الوداعی اور استقبالیہ ایڈریسوں کی فائل نکالتا ہے اور تین چار کو ملا کر ایک استقبالیہ ایڈریس تیار کر دیتا ہے اور لکھتا ہے :-

"جناب عالی!

ہم شہریوں اور بیوپاریوں کی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے قابل جن سیوک کے سواگت کا ہمیں موقع ملا ہے تیاگ اور دوسروں کی سیوا ہمارے شہر کی روایت ہے۔ اس عظیم روایت کی آپ ایک علامت ہیں۔ آج ہمارے درمیان آپ کی موجودگی ہمارے لئے فخر ہے کیونکہ آپ کی آمد سے ہمارے اندر عوام کی خدمت کا جذبہ موجزن ہو گیا ہے۔ یہ آپ کی عظیم خوبیوں کا اثر ہے کہ آج آپ ہمارے سامنے ایثار، یقین اور مستقل مزاجی کا مجسمہ بن کر کھڑے ہیں۔ آپ کی ان خوبیوں نے آپ کو ایک عام آدمی کی سطح سے اٹھا کر ایک انسٹی ٹیوشن بنا دیا ہے۔"

اور اسی طرح قلم گھسیٹ لکھتا چلا جاتا ہے اور انسان میں جتنی بھی خوبیاں وہ سوچ سکتا ہے سب اس مینجنگ ڈائرکٹر میں دکھا دیتا ہے۔

قلم گھسیٹ آخر ادیب ہے، کبھی افسانہ نگار اور شاعر بھی رہا ہے۔ وہ حساس اور جذباتی ہے: اس کا کوئی دوست کبھی کچھ سوچتا ہے تو کیا اس سارے کام سے جسے اُردو کے ایک حساس شاعر نے خشت کو بی یعنی اینٹ پتھر توڑنے کا نام دیا ہے لیکن اس کا جی نہیں اُوبتا۔ کیا اس جھوٹی تعریف، چاپلوسی اور چٹپٹی باتیں لکھتے ہوئے ناواقف لوگوں کے قصیدے گاتے ہوئے وہ اپنے آپ پر جھنجھلا نہیں اُٹھتا اور اس کا وہ دوست اپنے آپ پر جھنجھلا نہیں اُٹھتا؟"

قلم گھسیٹ کے خیالات ایک سے نہیں رہے۔ جب اس کے خواب کی ریشمی چادریں تار تار نہیں ہوتی تھی۔ اس کی امیدوں کے قلعے کی دیوار مضبوطی سے جمی کھڑی تھی، وہ گلی سڑی سماج کو بدل دیکھنے کے خواب دیکھتا تھا۔

"اس سماج کو ہم بدل دیں گے" وہ اعلان کرتا تھا۔

شاہراہ

"ہم ادیبوں اور شاعروں کے کندھوں پر بڑی ذمے داری ہے کیونکہ ہم عوام کی فوج کے ٹینک ہیں۔ ہم ایک طرف خیالات کے گولے برسا کر اس گھناؤنی سماج کو قائم رکھنے والے دشمنوں کی صفوں کو منتشر کر دیں گے اور دوسری طرف اپنی تنقید کے بھاری پہیوں کے نیچے عوام کو گمراہ کرنے والوں کو پیس کر عوامی فتح کا راستہ بنائیں گے۔"

لیکن آہستہ آہستہ اس کے خیالات کی تندی مدھم ہوتی گئی۔ اس نے اپنے آپ کو تسلّی دی کہ ناسازگار حالات کی وجہ سے اُسے دشمنوں سے جو سمجھوتہ کرنا پڑ رہا ہے اسے انہی کے ہتھیاروں سے ہرا دے گا۔ ان حالات پر قابو پا کر اپنی مرضی کے مطابق لکھے گا اور دنیا کو نئے سرے سے بنانے سنوارنے کے آدرش کو پورا کرے گا۔

لیکن اس بات کو برسوں بیت گئے ہیں۔ اب تو کبھی وہ ان باتوں کے بارے میں سوچتا بھی نہیں۔ نیا کام ڈھونڈنے اور ہاتھ کے کام کو ختم کرنے کے فکر میں دن رات غرق رہتا ہے۔ اگر کوئی دوست اس کی آرزوؤں پر مدت سے پڑی ہوئی اس راکھ کو کریدنا بھی چاہتا ہے تو وہ ہمیشہ ہنس کر یا مذاق کر کے یا بات کا رُخ پلٹ کر اس کی کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے کیونکہ اسے یقین ہو گیا ہے کہ راکھ کے نیچے دبے ہوئے اس کی اُمیدوں کے انگارے تھے اب وہ بجھتے بجھتے چنگاری سی بن کر رہ گئے ہیں اور اب اُن میں اتنی طاقت بھی نہیں کہ بھڑک کر شعلے بن اٹھیں۔ اسے تو یہ بھی ڈر ہے کہ وہ راکھ کریدنے بیٹھے گا تو شاید اس کے ہاتھ چنگاری بھی نہیں آئے گی۔

چنانچہ طنز بھری مسکراہٹ سے وہ دوستوں کے سوالات کا جواب دے دیتا ہے کہ

"باربردار جانور سوچے گا تو بوجھ کیسے اٹھائے گا"

یا ــــ "مزدور کا کام محنت کرنا ہے۔ فلسفہ بگھارنا نہیں"

یا ــــ "خیال اور فلسفہ صرف بیکار اور کندھوں کے بوجھ سے آزاد لوگوں کی عیاشی ہے۔ ہمارے کندھوں کے بوجھ نے دماغ کو سوچنے کی عیاشی کے قابل نہیں رکھا" اور ایک بڑے فلاسفر کی طرح بڑے سے بڑے سیاسی اور سماجی واقعہ پر طنز سے مسکرا کر ادھورے کام کو ختم کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن کسی شاعر نے کہا ہے :-

زندگی آگ ہے
آر ہے پار ہے
جب تلک کہ رس نہ ہو
جب تلک کہ بس نہ ہو

چونکہ وہ شاید سبزی خور ہے اس لئے مشورہ دیا ہے کہ خشکی کو دُور کرنے کے لئے :-

باغ میں شوق سے
سنگترے توڑ کے
اُن کا رس پیجئے گا
عیش یوں کیجئے گا

تلم گھسیٹ بھی سبزی خور ہے کیونکہ گوشت کھانا اس کی طاقت سے باہر ہے لیکن اسے اتنے سنگترے میسر نہیں جن سے وہ ان کا رس پی کر عیش کر سکے۔ وہ ایک سنگترہ بھی چوس سکتا ہے جب اپنے بیوی بچوں کے لئے چھ سنگترے لائے۔ کبھی جب پیسے فالتو آ جاتے ہیں تو وہ انھیں کوئی دھارمک یا مذاحیہ فلم دکھا لاتا ہے۔ اس سے بیوی بچوں کا دل بہل جاتا ہو لیکن اس کا دل اتنا نہیں بہلتا کہ آسانی سے ہر بوجھ اٹھا سکے۔ لیکن رس وہ لیتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے اس کمر توڑ دینے والے کام سے لیتا ہے۔ وہ اس سے خود ہی رس نہیں پیتا، دوستوں کو بھی پلاتا ہے۔

شاہراہ

جب اس کے پاس وقت ہوتا ہے اور کام کی جلدی نہیں ہوتی تو وہ دل بہلاوے کے لئے سہرے ، استقبالیہ ، الوداعی اور دیگر ایڈریسوں کو خاص ڈھنگ سے لکھتا ہے اور اپنا اور اپنے دوستوں کا دل بہلاتا ہے ۔ لالہ بھگوان داس کے صاحب زادے کا سہرا اس نے لکھا ہے اس کے کچھ مصرعے اس طرح ہیں :۔

سہرا تیرا چھچھڑ ہے
سہرا تیرا تیتر ہے
رُخ تیرا کیوں کر سجے
ٹوٹا ہوا چھپّر ہے
باراتی تیرے روشن
بھالو یا بگھیلے ہیں
اور تو ... میں تیرے قربان
اچھا بھلا بندر ہے

اور اس استقبالیہ ایڈریس کا جو دوسرا ورشن (VERSION) اس کے پاس ہے وہ کچھ یوں ہے :۔
"زناب والا ! ہم شہریوں اور بیوپاریوں کے لئے بدقسمتی کا دن ہے کہ آپ جیسے کام چور، نالائق، عوام دشمن کا استقبال کرنے کی تکلیف ہمیں اٹھانا پڑ رہی ہے ۔ ہماری سنڈیکیٹ کی روایت لالچ و بددیانتی رہی ہے ۔ آپ اس عظیم روایت کی ایک بہترین علامت ہیں ......"

اور اسی انداز میں اس نے یہ استقبالیہ ایڈریس لکھ رکھا ہے جس میں مینجنگ ڈائریکٹر اور اس کا استقبال کرنے والے بیوپاریوں کا ایک ایسا خاکہ کھینچا ہے اور وہ رازدارانہ باتیں کی ہیں کہ قلم گھسیٹ اور اس کے دوست اسے پڑھ کر قہقہے پر قہقہہ لگاتے ہیں ۔

اور جب ایک چیز سے طبیعت بھر جاتی ہے تو وہ فوراً ہی کوئی دوسری چیز تیار کر دیتا ہے ۔ ان مضامین میں دراصل سماج پر ایسی تنقید ہوتی ہے کہ اگر وہ شائع ہو جائے تو سماج اور اس کے ستون آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر متحیر رہ جائیں اور پہلی مرتبہ انھیں معلوم ہو کہ باربردار جانور جو ایک دماغ کا بھی مالک ہے ، کیا کیا باتیں سوچتا ہے ۔

قرضہ چکانے والا

دو دوست ریل میں سفر کر رہے تھے ۔ ان میں سے ایک دوست نے دوسرے کا ڈیڑھ سو روپیہ قرض دینا تھا ۔ مسلسل تقاضوں کے باوجود وہ قرض ادا کرنے سے کنّی کتراتا رہتا تھا ۔ اچانک ریل گاڑی کے ڈبے میں ایک رہزن گھس آیا اور آتے ہی پستول تان لیا اور دونوں سے کہنے لگا " جو کچھ تمہارے پاس ہے نکال کر دے دو " دونوں دوست ڈر گئے ۔ مقروض دوست نے جھٹ اپنا بٹوہ نکالا اور اپنے دوست سے کہنے لگا " یہ لو یار ! مجھے تمہارا ڈیڑھ سو روپیہ قرض ادا کرنا ہے ۔ مجھے انتہائی ندامت ہے کہ میں تمہارے بار بار مانگنے پر بھی نہیں دے سکا ۔ اب لے لو اپنا یہ روپیہ "

دانتوں کا بیمہ

• زوشنکو • روسی طنز

"کیا واقعی دانت نکلنے اور ٹوٹنے کے کچھ قدرتی اصول ہوتے ہیں؟ ——
زوشنکو کہتا ہے کہ اس کا ایک کردار یہ بات معلوم کرنے کے لئے ایک بیمہ کمپنی کے پاس گیا۔ اور بیمہ کمپنی والوں نے ثابت کردیا کہ اب انسان نے قدرت پر فتح حاصل کرلی ہے۔ اور دانتوں کے لئے اپنے اصول بنا رہا ہے"

اس سال ایگورچ کے دانت کچھ کمزور پڑ گئے اور جھڑنے لگے۔ جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اور انسان بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے تو جسم بھی ڈھلنے لگتا ہے۔ اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ جسم میں وہ پہلا سا تناؤ نہیں رہتا۔ قوت برداشت کم ہو جاتی ہے اور معمولی سی سردی گرمی صحت پر اثر انداز ہو جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ ایون ایگورچ کا لباس ف، کے دانت اس سال جھڑنے لگے۔ ایگورچ ان دنوں ہمارے ہاں قیام پذیر تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایگورچ نے اپنا پہلا دانت تو خود اپنے ہاتھ سے جڑ کر جڑ سے اکھاڑ لیا۔ مگر دوسرے دانت اس قسم کے کسی "حادثے" کا انتظار کئے بغیر ہی ٹوٹنے لگے —— بات چیت کے دوران کسی مسئلہ پر گرما گرم بحث کرتے وقت یا پھر کسی چیز کے چبانے پر اس کے دانت خود بخود بڑے پراسرار طریقہ پر اس کے منہ سے لڑھک کر باہر آجاتے۔ اس مختصر سے عرصے میں ایگورچ کے چھ دانت ٹوٹ گئے۔ یہ بات کسی معجزے سے کم نہ تھی۔

لیکن دلچسپ بات تو یہ تھی کہ ایگورچ کو اپنے دانتوں کی رتی بھر پرواہ نہ تھی۔ وہ اس بات سے قطعی پریشان نہ تھا کہ اگر اس کے دانت اس تیزی سے جھڑتے رہے تو کچھ دنوں میں اس کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں رہے گا۔ بات یہ تھی کہ ایگورچ ان لوگوں میں سے تھا جو مکمل طور سے بیمہ شدہ ہوتے ہیں۔ اس کے دانتوں کا بیمہ ہو چکا تھا اور دانتوں کی دیکھ بھال اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کی جگہ نئے دانت لگانے کی ذمہ داری بیمہ والوں پر تھی۔

ایگورچ اکثر کہا کرتا —— "دانتوں کی دیکھ بھال کے متعلق مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ اس معاملہ میں میں بالکل آزاد ہوں۔ اگر آپ میری ناک پہ گھونسہ لگانا چاہیں تو میں ہرگز ہرگز آپ کو اس بات کی اجازت نہ دوں گا۔ مگر دانتوں کی تو بات ہی الگ ہے۔ ہم لوگ جو کہ بیمہ کرا لیتے ہیں بڑے مزے میں رہتے ہیں ——"

اس طرح جب ایگورچ کے چھ دانت ٹوٹ گئے تو اسے نئے دانت لگوانے کا خیال آیا اس نے بیمہ کی پالیسی اور ضروری کاغذات سنبھالے اور سماجی بیمہ کے سرکاری اسپتال کی طرف چل پڑا۔

اسپتال میں ڈاکٹر اس سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آیا اور اس نے ایگورچ کو بتایا کہ یقینی طور پر نئے دانت لگانے کی ذمہ داری بیمہ والوں کی ہے اور ہم ضرور آپ کے نئے دانت لگا دیں گے۔ مگر قانون یہ ہے کہ کم از کم آٹھ دانت ٹوٹنے چاہئیں۔ اگر آٹھ سے زیادہ ہیں تو اس میں آپ کا فائدہ اور ہمارا نقصان ہے۔ لیکن آٹھ سے کم دانتوں کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے۔

ایگورچ نے ڈاکٹر کو بتلایا کہ اس کے چھ دانت ٹوٹے ہیں۔

"پھر تو ہم آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے"۔ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "آپ کو آٹھ دانتوں کے ٹوٹنے تک انتظار کرنا پڑے گا"

اس پر ایگورچ جھلا اٹھا۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں باقی دانت ہتھوڑے سے توڑ دوں؟"

"اوہو" ڈاکٹر نے ایگورچ کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ہتھوڑے کی کیا ضرورت ہے؟ قدرت کے عمل میں دخل اندازی کیوں۔ آپ

انتظار کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی خوش قسمتی سے وہ خود ہی ٹوٹ جائیں "۔

ایگورچ بڑبڑاتا ہوا واپس چلا آیا۔ اب تک وہ اپنے دانتوں کی دیکھ بھال کی فکر سے آزاد تھا۔ مگر بیمہ والوں کے اس قانون نے جس کا اسے خواب و خیال میں بھی گمان نہ تھا پریشان کر دیا۔

اب ایگورچ "غیر ضروری اور غیر قانونی" دانتوں کے ٹوٹنے کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

آخرکار ایک روز اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی اور اس کا ایک دانت لڑھک کر اس کے منہ سے باہر آ گرا۔ دوسرے دانت کو وہ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے پکڑ کر دائیں بائیں آگے پیچھے دبا تا رہا اور اُسے اپنی جڑ سے ہلا دیا۔ بہرحال کیل نکالنے والی پکڑ کی مدد سے اُسے اُس جگہ سے اُکھاڑ لیا جہاں کہ وہ عرصۂ دراز سے صحیح سلامت اور مضبوطی سے جما کھڑا تھا۔

اب ایگورچ پھر بیمہ کمپنی والوں کے اسپتال جا پہنچا۔ اور اُس نے ڈاکٹر سے بڑی شان سے کہا۔ "جناب اب میرے پورے آٹھ دانت ٹوٹ چکے ہیں "۔

"تب تو ہم آپ کو نئے دانت لگا دیں گے" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کے دانت کیسے ٹوٹے ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ سلسلہ وار ایک ہی قطار میں ترتیب سے ٹوٹے ہیں؟ کیونکہ قانون یوں ہے کہ نئے دانتوں کے لگانے کی ذمہ داری ہم پر صرف اس صورت میں عائد ہوتی ہے جبکہ دانت سلسلہ وار ایک قطار میں ٹوٹیں۔ وہ اس لئے کہ اگر دانت سلسلہ وار اور ایک ہی قطار میں ٹوٹیں تو طبی نقطۂ نگاہ سے آپ آسانی سے کھا اور چبا سکتے ہیں اور آپ کو نئے دانت لگوانے کی خاص ضرورت نہیں "۔

ایگورچ نے جواب دیا — " نہیں میرے دانت سلسلہ وار ایک ہی قطار میں نہیں ٹوٹے "۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنا مُنہ ڈاکٹر کے سامنے معائنہ کے لئے کھول دیا۔

"مجھے افسوس ہے" ڈاکٹر نے کہا۔ "اس صورت میں ہم آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ قانون ہی کچھ ایسا ہے "۔

اس پر ایگورچ نے کچھ نہ کہا اور دانت پیستا ہوا اسپتال سے باہر نکل آیا۔

" اوہ۔ اب نہ جانے کیا ہوگا۔ اب تک میں اپنے دانتوں کی دیکھ بھال کی فکر سے آزاد تھا اور میری روح کتنی مطمئن تھی اب یہ نئی مُصیبت آن پڑی "۔

آج کل ایگورچ مائع اور ہلکی پھلکی غذا پر زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے دانت ایک چھوٹے سے برش سے روزانہ صاف کرتا ہے۔ دن میں تین مرتبہ۔

چلئے بیمہ والوں کے قانون سے اگر اور کچھ نہیں تو اتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ وہ اپنے دانتوں کی دیکھ بھال کرنے لگا۔

(ترجمہ:۔ لاجپت رائے)

بے ایمان ایڈیٹر

ایک صاحب نے لکھا۔ "ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ اسے چھاپ کر اس کا معاوضہ بھیج دیجئے۔ غزل تھی:۔ ظُلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے! ..... الخ ایک ہفتہ بعد تقاضہ آیا۔ "معاوضہ آپ نے ابھی تک نہیں بھیجا۔ اگر نہیں بھیج سکتے تو غزل واپس کر دیجئے"۔ اس کا بھی جواب نہیں دیا گیا تو تیسرا خط آیا۔ "یہی تو خرابی ہے آپ ایڈیٹروں میں ہوتی ہے کہ اچھی چیزیں سب ہڑپ کر جاتے ہیں جس نے محنت کی ہے اُسے کچھ نہیں دینا چاہتے۔ خدا بچائے بے ایمانوں سے"۔ میں نے دل میں کہا۔ "آمین"

(شاہد احمد دہلوی)

ادب کی مارکیٹ

● موہن راکیش ● ہندی طنزیہ

پروفیسر موہن راکیش کا خیال ہے کہ ان کے طنزیہ میں جتنے کردار آئے ہیں وہ سب فرضی ہیں ۔ اس سلسلے میں ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت دلچسپی سے سنی جائے گی کہ پروفیسر راکیش ایک حقیقت پسند ادیب ہیں ۔ جو کچھ دیکھتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔

جب میں ادب کی مارکیٹ میں پہنچا اور چاروں طرف نظر دوڑائی تو مجھے اچانک محسوس ہوا کہ اس کا ماحول ایک اچھی خاصی نمائش کے ماحول سے کم کشش انگیز نہیں ہے۔

درمیان میں سفید پتھروں سے بنا ہوا ایک مندر تھا جس کے چاروں طرف طرح طرح کے سٹال لگے ہوئے تھے۔ کسی سٹال کے باہر باجا بج رہا تھا، کسی کے باہر مردنگ ـــ میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سٹالوں کے آگے سے گذرتا ہوا ان کے بورڈ پڑھنے لگا: "ذوقِ جنس پیدا کرنے والا مرکز"، "ہند امریکن کلا کار سماج"، "ملکی بیداری کی ترقی کی اکاڈمی"، "نوآموز ناول کلب"، "یورک رائٹرز سبھا"، "ہل چل پسند ادبی انجمن"، "بزم ناول نگاراں"، "تعمیرِ ادب کوآپریٹو سوسائٹی"۔

میں آخری بورڈ کے سامنے جاکر رک گیا۔ یہ سٹال کئی حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ پہلے حصے میں سوسائٹی کا دفتر تھا جہاں ایک بھیم و شحیم سا آدمی بیٹھا ہوا خط لکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کی خود اعتمادی کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ وہ اس سوسائٹی کا مالک ہے۔ چنانچہ میں نے اس کے قریب جاکر کہا۔ کہ میں گھوم پھر کر اس سٹال کے سبھی شعبوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے منہ کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے ایک جماہی لی اور کہا۔ "آپ ایک دو منٹ اور ٹھہر جائیے، تو میں آپ کے ساتھ چل کر سبھی کچھ دکھا دوں گا۔"

سامنے رکھی ہوئی چٹھی کو ختم کرکے وہ اٹھا اور مجھے ساتھ آنے کے لئے کہا۔ اور وہ سب سے پہلے مجھے جس حصے میں لے گیا ـــ وہاں چاروں طرف بنگالی، فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور کئی آدمی چھوٹی چھوٹی قینچیاں لئے یہاں وہاں سے ان کی کترنیں کاٹ رہے تھے۔ دو ایک آدمی بڑی سی قینچیوں کو استعمال کرکے ان کتابوں میں سے صفحے کے صفحے کاٹ رہے تھے۔ ایک معزز سے آدمی ایسے بھی تھے جو جلدوں میں سے پوری کی پوری کتاب ہی نکال کر رکھتے جا رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر کہ وہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ سٹال کے ایک شخص نے بتلایا کہ یہ مواد کی ترتیب و تنظیم کا شعبہ ہے۔ اور یہ قینچی چلانے والے ان کتابوں کے مصنف ہیں اور ہمارے نئے اشاعتی پروگرام کے لئے مواد اکٹھا کر رہے ہیں۔

میں کئی لمحوں تک مسحور سا ہوکر قینچیوں کے اس کرشمے کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد سٹال کے مالک نے ادھر ادھر سے مجھے مختلف رسم الخط کے مسودے اٹھاکر دکھائے اور بتلایا کہ کس طرح ان سے ایک ذہین ادیب صاحب موپاساں کی کہانیوں کے ہندی ڈرامے تیار کرتے ہیں اور کس طرح انہوں نے حال ہی میں ولیم سارایان کی کہانی "سانپ" کا ہندی اڈیشن اپنے ایک مشہور و معروف ہندوستانی افسانہ نگار کی تخلیق کے طور پر پیش کر دیا ہے۔ اس مالک نے مجھے "فاؤنٹین" نامی ناول کا ہندوستانی مسودہ بھی دکھایا جسے وہ جلد ہی اسی مشہور و معروف افسانہ نگار کے نام سے شائع

کرنے والے تھے۔

"ہم تو صرف عالمگیر ادب کی بنیادی تخلیقی چیزیں ہی لیتے ہیں۔" اس نے قدرے فخر کے ساتھ کہا۔ "یہاں ایسے ایسے پبلشرز بھی ہیں جو ہماری شائع کردہ کتابوں میں سے مواد اڑا کر چھاپ دیتے ہیں۔ دراصل لوگ محنت کرنے سے کتراتے ہیں۔ اب ہمارے یہاں ہی دیکھئے کتنی محنت سے کام ہوتا ہے۔ مصنف لوگ مہینوں عالمگیر ادب کی چھان بین کر کے چیزیں نکالتے ہیں۔ ابھی ابھی ہم نے سومرسٹ ماہم کے ناولوں کا پورا سیٹ منگوایا ہے۔ اس میں سے "ریزر ریج" کو منتخب کیا ہے۔ لیکن ہماری سوسائٹی کے ادیبوں کے پاس ابھی چھ ماہ تک اتنا زیادہ کام ہے کہ شاید اس ناول کی بنیاد پر کوئی بنیادی تخلیقی چیز جلدی تیار نہ کی جاسکے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ کام جلدی ہو جائے تاکہ اسے مارکیٹ میں نکال دیا جائے۔"

پھر اس نے سگریٹ کیس نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا:۔

"کیا آپ بھی لکھنے کا شوق رکھتے ہیں؟"

"جی ہاں! کچھ تھوڑا بہت شوق ہے تو سہی۔" میں نے سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کش کھینچ کر کہا۔ "اگر آپ اپنی کوشش کو آزمانا چاہیں تو یہ کام میں آپ کو بھی سونپ سکتا ہوں۔ اس میں آپ کو کچھ زیادہ وقت نہیں کرنا پڑے گی۔ کتھا کہانی میں ردوبدل کرنے اور اسے ہندوستانی جامہ پہنانے کے سلسلے میں آپ شری دیشم پاٹن جی سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ اس فن میں مسلم ہیں اور نئے ادیبوں کو ہمیشہ راستہ دکھلاتے رہتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں آپ کو بتلا چکا ہوں کہ "سینک" اور "فاؤنٹین" کے ایڈیشن انہی کے تیار کردہ ہیں۔"

"لیکن اگر آپ کو کوئی نئی چیز دی جائے تو.....؟" میں نے پوچھا۔

"نئی چیز؟" وہ قدرے مسکرایا اور بولا۔ "دیکھئے، ایک تو دنیا میں اتنی چیزیں لکھی جا چکی ہیں کہ اب کسی نئی چیز کا لکھا جانا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ پھر نئی چیز چھاپنے میں رسک (R,S,K) بھی بہت ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں ادیب لوگ سینکڑوں چیزیں بھیجتے ہیں مگر ہم انھیں پڑھنے کے لئے بھی وقت نہیں نکال سکتے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے....." اس نے پل بھر کے لئے خاموشی سے سگریٹ کے کش کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہم صرف وہی چیزیں چھاپتے ہیں۔ جو ہماری بزنس کی پالیسی کے مطابق ہوگی۔ اگر آپ ہماری پالیسی کے مطابق کوئی نئی چیز لکھ کر دیں تو ہم چھاپ دیں گے۔ ہم نے ایسی ہی ایک دو چیزیں پہلے بھی چھاپی ہیں۔" اس نے ایک دو ایسی کتابوں کے نام لئے جن میں کام شاستر کو ناول کی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔

"ایسی چیزیں بک بھی جاتی ہیں؟" اس نے کہا۔ "جن ادیبوں نے یہ کتابیں تیار کی ہیں۔ اب وہ انہی کے بل بوتے پر خود پبلشر بن گئے ہیں۔ اور اپنی پچاسوں کتابیں شائع کر ڈالی ہیں۔ ویسے شروع شروع میں ہم نے بھی انھیں خوب پبلیسٹی دی تھی۔ آپ نے شاید ابھی ہمارا شعبۂ نشر و اشاعت نہیں دیکھا۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم اپنے ادیبوں کو ادیب بنانے کے لئے کتنی محنت سے کام کرتے ہیں۔ ہمارے ایسے ٹائٹل جیسے کوئی پبلشر پیش نہیں کر سکتا ہے۔"

اور پھر وہ مجھے اس شعبہ میں لے گیا جہاں ان کے اشتہار اور ٹائٹل پیج تیار کئے جاتے تھے۔ ایک میز پر آٹھ دس کور ڈیزائن رکھے ہوئے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا۔ "وہ سبز رنگ کا ٹائٹل دیکھئے۔ جس پر ہنس کے جنسی فعل کی تصویر ہے۔ وہ ہمارے ایک مضامین کے مجموعہ کے لئے ہے۔ وہ کور جس پر کالی اور پیلی لکیروں سے مرد اور عورت کی ازلی حالت بنائی گئی ہے ایک ڈکشنری کے لئے ہے۔ وہ ایک خانہ بدوش حسینہ کی نیلگوں تصویر ایک نظموں کی کتاب کے لئے تیار کروائی گئی ہے۔ یہ تصویریں ہم مشہور و معروف مصوروں سے بنواتے ہیں۔ ہم صرف اتنی احتیاط برتتے ہیں کہ کور کی تصویر اور کتاب کے نام میں ذرا دور کا تعلق ہو۔ تاکہ پڑھنے والے میں ذرا تحیر پیدا ہوا اور کم از کم

ایک بار تو وہ کتاب کو ضرور پڑھ لے۔ اور اپنی حیرت دور کرلے۔ اب آپ کو اپنے کچھ اشتہار دکھاؤں۔

یہ کہہ کر اس نے اشتہاروں کے کچھ پروف منگوائے اور بولا "یہ دیکھئے، یہ ایک نئے افسانہ نگار کی کتاب کا اشتہار ہے جو اس افسانہ نگار نے ہمارے آدرش کی روشنی میں تیار کیا ہے۔ لکھا ہے:۔

"مصنف کی کہانیاں ہندی ادب میں ایک نئی کیفیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ پریم چند کی نظر اور سرت چندر کا دل اس نوجوان مصنف میں ملے گا۔

اور یہ ہے شری ویشم پاٹن کے نئے ناول کا اشتہار:۔

"فوق البشر"۔ "اس ناول کے سبھی کردار غیر معمولی ہیں، اس حد تک غیر معمولی ہیں کہ انھیں فوق البشر بھی کہا جا سکتا ہے ان کے دل کا درد" بھی انہی کی طرح غیر معمولی ہے۔ اس درد سے آشنا ہو کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ زندگی کی سچائی سے بھی بڑی ایک سچائی ہے جس تک ہر آدمی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مصنف ہمیں اپنے ساتھ اس سچائی کی دنیا میں لے جاتا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے ایک اور اشتہار دکھایا۔ جو ایک ایسے ناول کے لئے تھا جس میں کہانیاں ہی کہانیاں تھیں۔ ناول کہیں نہیں تھا۔ اور یہ سب کچھ دکھانے کے بعد پوچھنے لگے۔ "کیا خیال ہے آپ کا؟"

"میرا خیال ہے کہ آپ واقعی اس فن کے میگنٹ ہیں۔"

وہ لفظ میگنٹ پر اتنا خوش ہوا کہ مجھے دفتر چل کر کافی پینے کی دعوت دے ڈالی۔

"ادبی تعمیر کا کام بے حد دلچسپ ہے۔" اس نے دفتر کی کرسی پر لیٹ کر جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن کام کی یکسانیت سے طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اور اکتاہٹ کو دور کرنے کے لئے کافی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔"

کافی کی دو پیالیاں آگئیں۔ اور وہ اپنی پیالی کی طرف یوں جھکا جیسے بھجنے سے پانی پی رہا ہے۔ ایک گھونٹ پینے کے بعد اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"سچ مچ دنیا میں گرم کافی سے زیادہ دلآویز چیز کوئی نہیں ہے۔"

اچانک ایک اور آدمی دفتر میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی پبلشر کی مستی ذرا گمبھیر ہو گئی۔ پتھر کے بت کی طرح بے جان نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ "آئیے، بیٹھئے!"

وہ آدمی بیٹھ گیا۔ تو پبلشر نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "کہئے"

"گذشتہ ماہ آپ نے مجھے آج کے دن آنے کے لئے کہا تھا۔ امید ہے آپ نے میری رائلٹی کا حساب تیار کر رکھا ہوگا۔"

"ہوں!" کہہ کر پبلشر چند منٹ خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "دیکھئے آپ کا حساب تو ابھی تک تیار نہیں ہو سکا۔ ان دنوں مارکیٹ میں بہت مندا آرہا ہے۔"

"لیکن جناب! میرا تو گذشتہ دو سالوں کا حساب رہتا ہے۔"

"اچھا، میں اکاؤنٹنٹ سے کہوں گا کہ آپ کا حساب بنا رکھے۔" پبلشر بیچ ہی میں بولا۔

"لیکن..... میں تو آج صرف اس لئے آیا ہوں۔ تاکہ آپ میرا چیک....." "چیک آپکو بھجوا دیا جائے گا۔"

"چیک بھجوانے کی بات آپ نے پچھلے سال بھی کہی تھی۔" وہ آدمی گھبرا کر بولا۔ "چھ ماہ پہلے بھی کہی تھی؛ دو مہینے پہلے بھی کہی تھی۔"

"آپ ہماری مجبوریاں نہیں سمجھتے۔" پبلشر نے کہا۔ "ہم تو صرف ادب میں دلچسپی رکھنے کی وجہ سے یہ کام کر رہے ہیں۔ ورنہ آپ میں رکھا ہی کیا ہے؟ — آپ پھر کسی دن تشریف لائیے تو میں کوشش کروں گا۔ آج کے لئے مجھے افسوس ہے۔"

"تو اگلے ہفتہ.....؟"

"ہاں ہاں — ! اگلے نہیں۔ اس سے اگلے ہفتہ رکھیئے۔ اور اگر زیادہ یقینی بنانا چاہیں تو ایک ہفتہ اور چھوڑ دیجئے۔ اگلے ماہ انہی دنوں آجایئے۔"

"لیکن ......"

"اور نہ آسکیں تو میں چیک بھجوا دوں گا۔"

"لیکن ......"

"آپ بے فکر رہیں، مجھے آپ کی تکالیف کا پورا احساس ہے۔"

"لیکن، میں ......"

"آپ خود آنا چاہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اس بہانے آپ کے درشن بھی ہو جائیں گے۔ آپ کے لئے کافی منگواؤں؟"

"جی نہیں! شکریہ!"

"اچھا آپ نے درشن دے کر بڑی عنایت فرمائی۔" اور پھر ہاتھ جوڑ کر اُسے الوداع کہنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ادیب بھی غیر شعوری طور پر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "تو آپ میرا چیک ......"

"اس کے بارے میں آپ بے فکر رہیں۔" پبلشر نے کہا۔ "چیک آپ کے گھر پہنچ جائے گا۔"

وہ آدمی افسردہ سا ہو کر لوٹ گیا۔ میری سمجھ میں آخر تک کچھ نہ آیا کہ طے کیا ہوا۔ چیک اسے اگلے ماہ یہاں آکر ملے گا، یا اس کے گھر پہنچ جائے گا۔

اس کے چلے جانے کے بعد پبلشر نے شکایتی لہجہ میں مجھ سے کہا۔ "آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کا رویہ ہمارے متعلق کیسا رہتا ہے۔ ادیب کو پبلشر سے کچھ تو ہمدردی کرنی چاہیئے۔" میری کافی ختم ہو گئی تھی اور میں نے پیالی ہٹا کر ایک طرف رکھ دی تو اس نے پوچھا۔ "اور کافی منگواؤں؟"

"جی نہیں؟" میں نے کہا۔

"تو آپ نے اس سلسلے میں کیا سوچا؟"

"کس سلسلے میں؟"

"وہی .... وہ "ریز راسج" کا آئیڈیا لے کر ایک ناول لکھنے کے سلسلے میں۔"

"جی، میرے لئے یہ مشکل ہے۔ مجھے اس لائن کا ذرہ بھر تجربہ بھی نہیں ہے۔"

"اس میں مشکل کچھ نہیں ہے۔ ہاں، شروع شروع میں آپ کو جھجک ہو سکتی ہے۔ مگر آپ چند دن مارکیٹ میں رہیں تو آپ کی جھجک جاتی رہے گی۔ اور اس طرح شروع ہی میں ایک اعلیٰ ترین پبلشر سے آپ کا تعلق قائم ہو جائے گا۔ آپ شاید نہیں جانتے کہ اس مارکیٹ میں آدھے سے زیادہ سٹال ہمارے ہیں۔"

"— اچھا؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں، یہ سبھی سٹال ویسے آزادانہ اور الگ الگ ناموں پر چلتے ہیں۔ مگر انہیں صرف ہماری پالیسی ماننا پڑتی ہے۔ اس وقت مارکیٹ میں ہمارے ہی سٹال سب سے زیادہ مقبول ہیں —— تو آپ کو منظور ہے نا؟"

"کیا بات؟"

"وہی "ریز راسج" کا آئیڈیا لے کر ...."

"میں سوچوں گا۔"

"ہاں، سوچ لیجئے، مگر ذرا جلدی۔ میں اگلے ماہ اسے چھاپ کر مارکیٹ میں بھیج دینا چاہتا ہوں۔"
"اچھا اب اجازت دیجئے"۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "پھر کسی وقت درشن کو آؤں گا۔"
"دو ایک دن میں کسی وقت ضرور تشریف لائیے۔" میں آپ سے کیا عرض کروں کہ نئے ادیبوں سے مل کر مجھے کتنی مسرت ہوتی ہے۔
"اچھا آداب!"
"آداب!"

اس سٹال سے نکل کر تھوڑا آگے جانے پر میرا دھیان ایک اور بڑے سٹال کی طرف چلا گیا۔ جس کے بورڈ پر موٹے موٹے رومن حروف میں لکھا تھا۔

"نیو لُک ان ہندی پوئیٹری۔"

اس کے نیچے ساتھ ہی ساتھ چھوٹے دیوناگری حروف میں لکھا تھا۔

"۱۹۵۴، ۵۵ء کی نظموں کے لئے نئے نئے موضوع اور اسلوب"

اس سٹال میں داخل ہو کر میں نے دیکھا کہ چاروں طرف دیواروں پر چسپاں گتوں پر ۱۹۵۴، ۵۵ء کی شاعری کے مختلف اسالیب سے روشناس کرایا گیا ہے۔ ان میں سے کئی اسلوبوں کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

۱۔ گئو دوہن اسلوب:۔ اس اسلوب میں نظم کا ویسا ہی آہنگ ہوتا ہے۔ جیسے گائے دوہنے کے وقت دودھ کی دھاریں نکلتے وقت۔ مثال کے طور پر:۔

برکھا برسے برکھا برسے
ان من، ان من
چھائے رے گن، چھائے رے گن
آئے رے گن آئے رے گن
کے کی ہرسے سیپی ترسے
برکھا برسے برکھا برسے

"چوبنج مار اسلوب":۔ اس اسلوب میں الفاظ کا وہی آہنگ رکھا جاتا ہے۔ جیسے کھٹک بڑھئی کی چونچ سے ٹھونگیں لگاتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:۔

سُکھ رے سُکھ
جیون میں سب سُکھ ہی سُکھ
سُکھ سُکھ سکھ
سکھ میں سکھ
دُکھ میں دکھ
سکھ دکھ کے سنگم میں سکھ
سکھ اسر سکھ

بچہ رونے کا اسلوب:۔ اس اسلوب میں الفاظ میں وہی اتار چڑھاؤ اور موسیقانہ ترنم رہتا ہے جو ایک بچے کے رونے میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر:۔

ماں او ماں
سا سا سا ماں
سا ماں سا ماں
او ماں او ماں
را را ہا را
ما را ہا را
او ماں او ماں
تیرا بیٹا

اسی طرح "کیڑا چال اسلوب" ۔ "کوہ پیما اسلوب" ۔ "بگلا قطار اسلوب" اور "کتھک ناچ اسلوب" وغیرہ کئی اسلوبوں کی مثالیں دی گئیں تھیں۔ اسلوبوں سے توجہ ہٹا کر میں ۵۵ — ۱۹۵۴ کے موضوعات کی فہرست دیکھنے لگا۔

ایک تپائی پر ایک پھٹا ہوا جوتا، ریشمی رومال میں لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ منسلکہ کارڈ پر اس کا عنوان دیا گیا تھا "سنسکرتی"۔ دوسری تپائی پر دو سونے کے دانت اور موم بتیاں اور دو بارہ سنگھے کے سینگ دھرے تھے۔ عنوان دیا گیا تھا۔ "خواب" اس سے آگے والی تپائی پر ایک سلگتی ہوئی انگیٹھی رکھی ہوئی تھی جس کے پیر کے ساتھ غرّاتے ہوئے کتے کی رسی بندھی تھی۔ عنوان تھا۔ "زندگی" اس سے اگلی تپائی پر پاؤ بھر روٹی، ایک تھرمامیٹر اور صابن کی ایک ٹکیہ رکھ کر لکھا گیا تھا۔ "ماتا"

اچانک میری نگاہیں ایک آدمی پر جم گئیں۔ جو ایک کونے میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔ اردگرد اور کوئی آدمی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اندازہ لگایا کہ یہی اس اسٹال کا مالک ہے۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ تپائیوں پر رکھے ہوئے موضوعات اور عنوانوں کا مفہوم مجھے کچھ سمجھا سکے۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ لیکن میرے قریب جانے سے اس کے انہماک میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور وہ اسی طرح کتاب پر آنکھ گاڑے ہوئے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ مجھے لمحہ بھر کے لئے شک ہوا کہ وہ شاید موم کا بنا ہوا ہے۔ میرا دل چاہا کہ اس کے چٹکی کاٹ کر دیکھوں۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ چٹکی کاٹنے کے بجائے اس سے کتاب چھین لینا زیادہ نتیجہ خیز رہے گا — میں نے کتاب کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس نے غصیلی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور ہاتھ کی پنسل سے سامنے کی طرف اشارہ کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر اس کتاب کے صفحوں میں کھو گیا۔

اس نے جس طرف اشارہ کیا تھا۔ وہاں ہاتھی دانت کا ایک بڑا سا بورڈ رکھا تھا جس پر الفاظ کھدے ہوئے تھے۔ ایک تو ہاتھی دانت پر کھدے ہوئے الفاظ ویسے بھی نہیں پڑھے جاتے۔ اس پر وہ الفاظ اتنے باریک تھے کہ میں بڑی مشکل سے انہیں پڑھ سکا۔ لکھا تھا۔

۵۵ — ۱۹۵۴ء ——————

"یہ معلوماتی تخلیقات کا سال ہے، اس سال ہمیں ادب کی اس نئی روایت کو زور و شور سے آگے بڑھانا ہے۔ دوسرے تمام ازموں سے لوگ واقف ہو چکے ہیں۔ نوجوان شاعروں کے لئے اس نئے ازم کی تخلیقات سے عوام کو متاثر کرنے کا پروگرام ہے۔ یہاں جتنے موضوعات دئے گئے ہیں وہ سب علامتی ہیں۔ "سنسکرتی" میں پھٹا ہوا جوتا ہماری تمدنی بدحالی کا ثبوت ہے۔ ریشمی رومال ہماری اس بدحالی کو ڈھانپنے کی کوشش کا اظہار ہے۔ "خواب" میں سونے کے دانت آدمی کی لالچ کا۔ موم بتیاں اس کی امید کا اور سینگ اس کے خوف کی گواہی دیتے ہیں۔ "زندگی" میں انگیٹھی زندگی کی آخری حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور کتا انسان کی زندگی کی حفاظت کا مظہر ہے۔ "ماتا" کی اسکیم ایک لطیف خیال کا اظہار کرتی ہے۔ روٹی، تھرمامیٹر، صابن کی ٹکیوں میں ایک ماں کے سارے کام کاج کا اشارہ مل جاتا ہے — اس کی آدھی زندگی باورچی خانے میں اور باقی وقت بچوں کی دیکھ بھال اور گھر کی صفائی میں گذر جاتا ہے — کونے میں بیٹھے ہوئے صاحب مطالعہ کی علامت ہیں" مطالعہ میں جس انہماک اور سرگرمی کی ضرورت رہتی ہے۔ وہی . . . . "

یہ معلوم کرکے کہ وہ آدمی بھی ایک موضوع ہے میری نظر یکایک بورڈ سے ہٹ کر اس آدمی کی طرف اُٹھ گئی۔ اس وقت وہ اپنی کتاب پڑھتے ہوئے نوٹ بک کی شکل کے سے کیڑے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ وہ کیڑا بھی یقیناً کسی نہ کسی چیز کی علامت ہے۔ شاید وہ اسی شخص کے اپنے نقطۂ نظر کی علامت ہے۔ ویسے مجھے ہر چیز اس وقت علامتی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے چھت سے لٹکتا ہوا بلب بھی قدرتی طاقت کی علامت ہے۔ سامنے لٹکتا ہوا کیلنڈر بھی زندگی کی رفتار کی علامت ہے۔ مکڑی کا جالا بھی ماضی کے بندھنوں کی علامت ہے۔ اور ان سب کو دیکھتے ہوئے میں خود تیر انداز ارجن کی علامت ہوں۔ اور پھر میری نظر چوری چھپے ڈبل روٹی پر دانت چلاتے ہوئے چوہے پر پڑی اور میں سوچنے لگا کہ وہ چوہا کس چیز کی علامت ہو سکتا ہے — ؟

وہاں سے نکل کر میری آنکھیں اس سٹال کی طرف کھچ گئیں جس کے باہر بہت سے لوگ "کیو" لگائے ہوئے کھڑے تھے۔ اس سٹال کے باہر یہ بورڈ لگا تھا۔

"بیسویں صدی کی تنقید"

اس سٹال کے باہر "کیو" میں کھڑے ہوئے سبھی لوگ لباس اور چال ڈھال سے معزز دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہروں پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے امتحان گاہ کے باہر طالب علموں کے چہروں پر ہوتے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کی خواہش تو یہ معلوم ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ جتنا وقت اس "کیو" میں گذار سکیں، اتنا ہی اچھا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ وہ اندر جاکر کیا کرتے ہیں۔ میں بھی "کیو" میں کھڑا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ کیو آگے بڑھتا گیا اور چند منٹ بعد سٹال کے پاس پہنچ کر میں نے اپنے آپ کو ایک پتلے دُبلے سے آدمی کے سامنے کھڑا ہوا پایا۔ جو جومیٹری کے قد آدم اوزار لئے ان سے ہوا میں دائرے، تکونیں اور چوکور بنا رہا تھا۔ مجھے فوری طور پر پتہ نہ چلا کہ وہ تنقید کے سائنٹفک اُصولوں کے مطابق میری قسمت کا اندازہ لگا رہا ہے۔ مجھے پتہ جب چلا جب اس نے ایک پرزے پر مجھے لکھ کر دے دیا کہ میرا زاویۂ نگاہ زندگی کے بارے میں سائنٹفک نہیں۔ اس لئے مجھے فلاں فلاں کتاب پڑھنی چاہیئے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے پرزہ جیب میں ڈال لیا۔ اور ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ ایک بھلے آدمی نے مجھے بازو سے پکڑ کر ایک بڑے سے ترازو کے پلڑے میں بٹھا دیا۔ ترازو کے دوسرے پلڑے میں اس نے بڑی بڑی کتابیں بھر رکھی تھیں۔ مجھے ان کتابوں کے برابر تول کر اس نے کچھ حساب کیا اور بتایا کہ میں ضرورت سے زیادہ کتابی آدمی پایا گیا ہوں اس لئے مجھے وسیع عوامی زندگی سے واقف ہونے کے لئے کچھ دن بمبئی جاکر رہنا چاہیئے۔

وہاں سے چل کر میرا جس آدمی سے سامنا ہوا وہ ریشمی چادر اوڑھے — اور ہاتھ میں سونے کا ننھا سا ترازو لئے کھڑا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں سونے ہی کے ننھے ننھے باٹ تھے۔ مجھے دیکھ کر دُور سے ہی اس نے سر ہلا کر فیصلہ دے دیا کہ میں اس کی کسوٹی پر پرکھے جانے کے قابل نہیں ہوں۔ مجھے اس کا چھوٹا سا ترازو اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ اسے لیکر بھاگ جاؤں لیکن اسی وقت اچانک میرا دھیان دوسری طرف چلا گیا۔ کیونکہ قریب ہی دو بھلے آدمیوں میں ہاتھا پائی شروع ہو گئی تھی اور کئی لوگ ان کے آس پاس جمع ہو رہے تھے۔

لڑنے والے دونوں شخص پہلوان تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کھادی کا لنگوٹ لگائے تھا اور ایک ولائتی سلک کا جانگھیا پہنے ہوئے تھا۔ آس پاس کھڑے لوگ بھی انھیں چھڑانے کی بجائے بڑھاوا دے رہے تھے۔ میں نے ایک شاعر نما آدمی سے ان کی لڑائی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ دونوں بڑے بھاری تنقید نگار ہیں۔ اور اپنے اصولی اختلاف کا فیصلہ کر رہے ہیں مجھے ان کی لڑائی کا ڈھنگ بڑا ہی دلکش لگ رہا تھا۔ اور میرا دل چاہتا تھا کہ دیر تک انھیں دیکھتا رہوں۔ لیکن جب انھوں نے اپنی لڑائی میں ایک پاس کھڑے ادیب کو گھسیٹ کر اس کی مرمت کرنا شروع کر دی تو میں نے وہاں سے کھسک جانے ہی میں خیریت سمجھی

۱۶۵۸۰

وہ شاعر بھی جو میرے ساتھ کھڑا تھا میرے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔

باہر آکر ہماری جان پہچان ہوگئی اور ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ یہ جان کر کہ میں وہاں نیا ہی آیا ہوں شاعر مجھے بتانے لگا کہ مارکیٹ میں کس طرح مندہ آرہا ہے۔ شاعری اور ڈرامے کی مانگ کتنی کم ہوگئی ہے اور کہانی کے خریدار کس کس طرح کی کہانی مانگ رہے ہیں۔ اس نے جو کچھ بتایا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مارکیٹ میں رہ کر لکھنے کی بجائے ادیبوں کو پان لگا کر کھلانا زیادہ فائدہ مند ہے۔ وہ شاعر بیچ بیچ وہاں پان کی دوکان کھولنے کی سوچ رہا تھا۔

تھوڑی دُور اور آگے جا کر ایک اور سٹال کے آگے بھیڑ دیکھ کر میں رک گیا۔ وہاں اسی طرح دھکم دھکا چل رہا تھا جیسے سنیما گھر کی چونی والی کھڑکی کے سامنے چلا کرتا ہے۔ اس بھیڑ میں جتنے لوگ تھے۔ وہ بغل میں کتابوں کا ایک ایک بنڈل دبائے ہوئے تھے۔ بورڈ دیکھنے پر مجھے پتہ چلا کہ وہ کورس کی کتابیں مقرر کرنے والے بورڈ کا دفتر ہے۔ وہاں اندر جانے کی کوشش میں دو ایک آدمی تو لہولہان ہوئے جا رہے تھے۔

"معلوم ہوتا ہے آج کورس کی کتابیں مقرر کرنے والے بورڈ کی میٹنگ ہے۔" شاعر نے جدوجہد کرتی ہوئی انسانیت کے نمائندوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"وہ آدمی کون ہے جو سب سے زیادہ لہولہان ہو رہا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے؟" میرے ساتھی نے حیرانی سے کہا۔" یہ شری ستھرا نند ستھرا ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی کتابیں پہلی جماعت سے لیکر ایم۔اے تک میں پڑھائی جاتی ہیں۔ یہ سلیبس دیکھ کر وقت کے مطابق کہانی، ناول، ڈرامہ، مضمون، تنقید وغیرہ سبھی طرح کی چیزیں لکھ لیتے ہیں۔ اپنی تصانیف کی اشاعت بھی خود ہی کرتے ہیں۔ "بال بودھنی" ان کی مشہور کتاب ہے۔ اب تو ان کے تینوں بیٹے بھی اس میدان میں نام پیدا کر رہے ہیں۔"

اور میں نے دیکھا کہ شری ستھرا نند ستھرا لڑتے لڑتے سٹال کے دروازے تک جا پہنچے ہیں۔ لیکن وہاں جا کر بھی ان کی لڑائی جاری تھی۔ کیونکہ ایک شخص پیچھے سے ان کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بھیڑ سے کچھ ہٹ کر ایک آدمی اپنی ایک کتاب میں سے جلدی جلدی ورق پھاڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے شاعر دوست سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور ایسا کیوں کر رہا ہے۔ تو اس نے جواب دیا یہ ایک مشہور ناول نگار ہیں۔ اور جس کتاب میں سے یہ صفحے پھاڑ رہے ہیں وہ ان کا ایک مشہور ناول ہے۔ اس سال کے سلیبس کے مطابق کورس کی کتابیں چننے والے بورڈ کو چار سو صفحات کی کتاب کی ضرورت ہے اور ان کا ناول لگ بھگ سات سو صفحات کا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اندر جانے سے پہلے اپنے ناول کا پاکٹ ایڈیشن تیار کر رہے ہیں۔"

ہم اس بھیڑ میں سے رستہ بنا کر کسی طرح آگے بڑھے۔ میرے ساتھی کو اچانک ایک چھوٹا سا کام یاد آگیا۔ اور وہ مجھے فلمی ہستیوں کے سٹال میں لے گیا۔ ڈائرکٹر صاحب اس وقت اپنے آئندہ فلم کی ہیروئن سے عشق کے بارے میں کچھ ہدایات دے رہے تھے۔ انہوں نے تیوری چڑھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ان کی تیوری دیکھتے ہی میرے ساتھی کی زبان خشک ہوگئی۔ اور وہ "سوری" کہہ کر واپس مڑنے ہی کو تھا کہ ڈائرکٹر صاحب نے یہ الفاظ سنائی دیئے۔

"آپ اپنے گیت کے سلسلے میں آئے ہیں؟"

"جی ہاں" میرے ساتھی نے خشک آواز سے کہا۔ "لیکن اس وقت آپ مصروف ہیں۔ میں پھر کبھی . . . . . ."

"نہیں پھر کبھی آنے کی ضرورت نہیں۔" ڈائرکٹر صاحب بولے۔ "آپ کا گیت ہمارے کام کا نہیں ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ یہ ادبی قسم کے گیت ہمارے یہاں نہیں چلتے۔"

"جی، پر یہ گیت تو ——" میرا ساتھی جرأت کر کے بولا۔

"جی، یہ گیت نہیں چل سکتا۔ ڈائرکٹر صاحب ذرا تیز ہو کر بولے۔ "آپ پڑھے لکھے لوگ ہمارے کام کی چیز نہیں لکھ سکتے۔ ہمارے یہاں فلم دیکھنے والے زیادہ تر ان پڑھ لوگ ہیں۔ ان کے لئے گیت وہی لکھ سکتا ہے جو خود ان پڑھ طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ آپ اپنا گیت لے جائیے اور کسی رسالے میں چھپوا دیجئے۔"

اور انھوں نے خان کو بلا کر حکم دیا کہ منیجر سے کہہ دے کہ ان کا "کالی بدریا" والا گیت انہیں واپس دے دے۔"

"جی پر میرا گیت "کالی بدریا" والا نہیں ہے" میرے ساتھی نے کہا۔ "میرا گیت تو وہ ہے۔ "گوری باجے گھنگروا۔"

"تو منیجر سے کہہ دو کہ انہیں "گوری باجے گھنگروا" والا گیت دے دے" یہ کہہ کر ڈائرکٹر صاحب ہماری طرف پیٹھ کر کے اپنی ہیروئن سے بات کرنے لگے۔ مجھ سے اس وقت نہ رہا گیا۔ اور وہاں سے نکلتے ہوئے ڈائرکٹر صاحب کی میز پر انہی کی چاک سے صفر کا نشان بنا آیا۔

"اب — ؟" میں نے باہر نکل کر اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے مرجھائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں کینٹین میں چل کر کافی کی ایک پیالی پیوں گا۔" اور میں اس کے ساتھ کینٹین کو چل دیا۔ وہاں جا کر میں نے دیکھا کہ کینٹین لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ لوگ چائے اور کافی کی پیالیاں سامنے رکھے زور زور سے قہقہے لگا رہے ہیں۔ لیکن ان قہقہوں میں گھرے ہوئے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے چہرے کی بناوٹ سے ایسا لگتا تھا جیسے کسی ویرانے میں بھٹک گئے ہوں۔ ان کے چہرے ان کی ذہانت کی گواہی دیتے تھے جیسے کسی شیش محل میں بیٹھے ہوں جہاں انھیں اپنے عکس بگڑے ہوئے دکھائی دے رہے ہوں۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ سب مارکیٹ میں نئے نئے ہی آئے ہیں۔

میرے ساتھی نے چند لمحے ادھر ادھر نظر دوڑانے کے بعد میرا ہاتھ ذرا سا دبا کر کہا۔ "آؤ تمھیں ایک جینئس سے ملاؤں" اور وہ الجھی ہوئی کرسیوں میں سے راستہ بناتا ہوا مجھے ایک لمبے دبلے شخص کے پاس لے گیا۔ جو ایک کونے میں اکیلا بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ میں نے جینئس کے بارے میں سن تو بہت رکھا تھا۔ لیکن کبھی انھیں دیکھا نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اسی حیرانی کے ساتھ اس آدمی کو دیکھا جس حیرانی کے ساتھ ایک بچہ زرافے کو دیکھتا ہے۔

اس نے مہین وائل کی دھوتی پر ململ کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ اس کے سر کے آدھے بال اڑ چکے تھے۔ پھر بھی پہلی نظر میں یہ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ عام انسان کے علاوہ کچھ اور چیز ہے اگر مجھے پہلے نہ بتایا گیا ہوتا کہ وہ جینئس ہے تو شاید میں اسے کسی مل کا جابر آنے کا ساجھی دار سمجھ لیتا۔ ہمیں دیکھ کر وہ سنجیدگی سے مسکرایا۔ اور اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہمارے بیٹھنے پر وہ اسی سنجیدگی سے کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔

"کیا بات ہے آجکل دکھائی نہیں دیتے ؟" میرے ساتھی نے پوچھا۔

"پچھلے دنوں ہم "وندھیا پردیش" میں گھومنے اور وہاں کے "لوک گیت" اکٹھے کرتے چلے گئے تھے؟" جینئس نے کہا۔ "انہیں دنوں وہاں ایک تمدنی کانفرنس بھی تھی۔ جس کی وجہ سے آٹھ دس دن زیادہ لگ گئے۔ وہاں سے لوٹتے وقت ایک ادبی جلسے کی وجہ سے کچھ دن بنارس میں رک جانا پڑا۔ اس طرح بہت سا کام رہ گیا تھا۔ مہینہ بھر سے اسے ہی پورا کرنے کی کوشش میں ہوں۔"

"تو کتنا کام کر لیا مہینہ بھر میں ؟"

"دو ناول تو پورے ہو گئے ہیں۔" جینئس نے کہا۔ "لیکن ابھی ادب کی تاریخ کے دو باب لکھنے رہ گئے ہیں۔" "رتو سنہار" کا انگریزی نظم میں ترجمہ دو ایک دن میں پورا ہو جائے گا۔"

"اور اس آٹھ سو صفحات کی آثار قدیمہ سے متعلق کتاب کا کیا ہوا جس کے ڈھانچے کے بارے میں تم پچھلی دفعہ بات کر رہے تھے؟"

"اسے پورا کرنے میں ابھی آٹھ دس دن اور لگیں گے۔"

یہ معلوم کر کے کہ وہ شخص ساڑھے نو صفحات فی گھنٹہ کے حساب سے دن میں پچانوے صفحات لکھ لیتا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی

جینئس ہے۔ اور قومی جائداد کے طور پر اس کی حفاظت کی جانی چاہیئے۔

جینئس کی کافی ختم ہوگئی تھی۔ وہ مصروفیت کی شکایت کرتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور میرے ساتھی کے ہاتھ سے دو انگلیاں چھوا کر کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ بل ادا کر کے اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دو ایک آدمیوں کے سلام کا جواب دیا۔ اور کیفے ٹیریا سے باہر چلا گیا۔

میں آخری سیکنڈ تک اس کے شاندار قد کو دیکھتا رہا۔ اس کے چلے جانے پر میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

"اسے جینئس بنے کتنے سال ہوئے ہیں؟"

"مطلب؟" میرے ساتھی نے پوچھا۔

مطلب کہ کتنے سال مارکیٹ میں رہ کر آدمی جینئس بن جاتا ہے۔"

لیکن میرے ساتھی نے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میرے سے کافی لانے کے لئے کہہ کر وہ مجھے آس پاس کے لوگوں میں سے کچھ اہم اشخاص کی واقفیت کرانے لگا۔

وہ تین میز چھوڑ کر ایک نوجوان دو دو شیزاؤں کے ساتھ بیٹھا مٹن چاپ کھا رہا تھا۔ وہ چھری کانٹا ہاتھ سے رکھ دیتا تو اس کا ہاتھ ایک حسینہ کے جسم کی طرف اس طرح جھکنے لگتا جیسے وہ جسم ہڈی اور ماس کا نہیں بلکہ مقناطیسی پتھر کا بنا ہو۔

نوجوان کے بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ اس کی ٹائی کی ڈھیلی ناٹ کا میل مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میرے ساتھی نے کہا۔

"اس نوجوان کو دیکھ رہے ہو۔ اسے لوگ ہندوستان کا میکسم گورکی کہتے ہیں۔"

"کیوں۔ اس میں اور گورکی میں کیا مشابہت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مشابہت کی بات نہیں ہے۔" میرے ساتھی نے کہا۔ "اس شخص کی روح بہت بیدار رہتی ہے۔ صبح کے اخبار میں جو خبر پڑھتا ہے شام کو اسی پر کہانی لکھ دیتا ہے۔"

اس سے ذرا آگے ایک لمبے قد اور گورے رنگ کا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا تھا۔ وہ پانی کا گلاس سامنے رکھے ایک نوجوان لڑکی سے بات چیت کر رہا تھا۔ دور سے اس کے صرف ہونٹ ہی ہلتے دکھائی دیتے تھے۔ آواز اس سے شاید اتنی ہی نکلتی تھی جتنی ان لفظوں کے لڑکی کے کانوں تک پہنچنے کے لئے ضروری تھی۔ "اور وہ آدمی ہندوستان کا رومان رولاں مانا جاتا ہے۔" میرے ساتھی نے کہا۔

"رومان رولاں؟" میں نے پوچھا۔ "رومان رولاں کس طرح؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا پر یہ رومان رولاں مانا ضرور جاتا ہے۔" اس نے کہا۔

"تم نے کسی سے پوچھا تو ضرور ہوگا۔" میں نے کہا۔

"کئی لوگوں سے پوچھا ہے۔"

"تو پھر۔؟"

"انھیں بھی علم نہیں۔"

"تو تمھیں بھی خود اسی سے پوچھنا چاہیئے۔"

"ایک بار اس سے بھی پوچھا تھا۔"

"پھر۔؟"

"وہ بھی نہیں جانتا۔"

"پھر بھی اس کے رومان رولاں مانے جانے کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیئے۔"

میرے ساتھی نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس کی تصانیف سے ہی کچھ پتہ چل سکتا ہے۔"

اور پھر اس نے وہاں مجھے ہندوستان کے ابسن، شا اور ٹالسٹائی بھی دکھائے۔ وہ سب ریڈیو کے لئے کہانیاں لکھ کر مشہور ہوئے تھے ــــ ٹالسٹائی صاحب تو تنقید نگار بھی تھے اور ان دنوں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے اصولوں کو لے کر پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس لکھ رہے تھے۔

بیرا کافی کی پیالیاں لے آیا تھا۔ میرے ساتھی نے کافی کی پیالی اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہاں کی کافی بہت گرم ہوتی ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم کینٹین سے باہر نکلے تو پھر میری نظر شاہوں سے گھرے ہوئے سفید مندر پر پڑی۔ میں نے اپنے ساتھی سے پوچھا کہ وہ مندر وہاں کیوں بنایا گیا ہے۔ تو اس نے کہا کہ یہاں دیوی سرسوتی کا قیام ہے۔

سرسوتی دیوی کا نام سن کر میرا دل عقیدت سے بھر گیا اور میں نے مندر کے اندر جا کر اس کے درشن کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

"لیکن آج کل وہ یہاں نہیں رہتی۔" میرے ساتھی نے نحوست بھرے انداز میں کہا۔

کیوں؟ میں نے پوچھا۔

"شاید یہاں کا شور اس سے سہا نہیں جاتا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو آج کل وہ کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سُنا ہے کہ کچھ پرانے واقف کاروں کے پاس رہتی ہے۔ اور اپنا گھر بنانے کے لئے نئی زمین کی تلاش میں ہے۔"

راستے میں بھیڑ بہت بڑھ رہی تھی جس سے ہمارا ساتھ ساتھ چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ جلدی ہی کندھوں سے کندھا چھل کر ہم دونوں الگ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جب چاروں طرف بھیڑ کا دباؤ کچھ کم ہوا تو میں نے دیکھا کہ میں بہت سے اور لوگوں کے ساتھ مارکیٹ سے باہر پہنچ گیا ہوں۔ لیکن میرا ساتھی نہ جانے کہیں اندر ہی رہ گیا ہے۔"

عوام

ہمیں آج تک عوام کے وجود کا اعتبار نہیں آیا۔ کبھی آپ نے غور کیا کہ یہ عوام کہاں ہوتے ہیں اگرچہ ہر شخص عوام عوام پکارتا ہے۔ ہمیں ان کا پتہ نہیں مل سکا جو بھی عوام کی بات کرتا ہے اسی انداز سے کرتا ہے گویا وہ کسی تیسرے شخص کی بات کر رہا ہو۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لیڈروں نے اسٹیج پر چڑھ کر اپنے پھیپھڑوں اور بیگانے لاؤڈ سپیکروں کے زور پر عوام کو صلواتیں سنائی ہیں۔ انھیں بد دیانت، بے غیرت، ذلیل بتایا ہے۔ لیکن حاضرین میں سے ہر ایک نے یہی سمجھا کہ روئے سخن اس کی جانب نہیں بلکہ عوام کی جانب ہے۔ نہ صرف یہ کہ سمجھا بلکہ تالیاں پیٹ کر لیڈر سے اتفاق بھی کیا کہ واقعی عوام بد دیانت بے غیرت اور ذلیل ہیں۔ آج تک کسی نے اُٹھ کر یہ نہ کہا کہ اے لیڈر تو اپنے ساتھ ہمیں کیوں شامل کر رہا ہے۔ مگر یوں کسی کو بے غیرت کہا جائے تو وہ اپنی غیرت کا ثبوت چانٹے کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن حاضرین زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں

صاحب، غزل ہوئی ہے!

(۱) جناب لُکنت ہکلانوی۔ (راہگیر سے) :- "کیا غزل ہوئی ہے صاحب، ذرا سُنتے جائیے"

(۲) "میاں! عجیب بدتمیزی ہے۔ ہم غزل سُنا رہے ہیں اور آپ بھاگے جا رہے ہیں"

(۳) "ہاں! اب آپ پوری توجہ سے سُن سکیں گے! تو سُنیئے مطلع عرض ہے۔ ......"

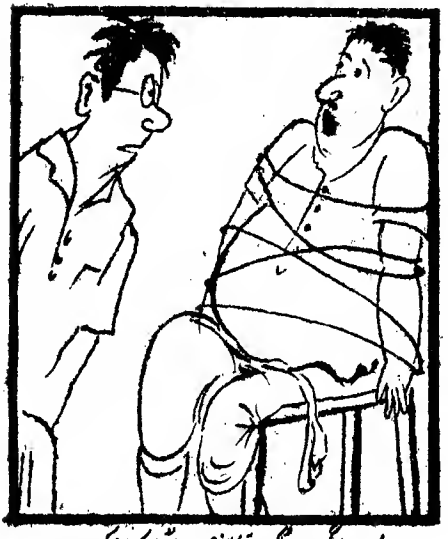

(۴) راہگیر :- (لُکنت ہکلانوی سے) "داد کیا خاک دوں، میرے ہاتھ تو تم نے باندھ رکھے ہیں"

صحبتِ ناجنس

امجد حسین ● مشاعرہ بازی

سوال یہ ہے کہ اگر امجد حسین شاعر نہیں تھے تو مشاعرہ میں غزل پڑھنے کیوں جا پہنچے۔ کیا شعراء حضرات انھیں گھسیٹ کر لے گئے؟ کیا احباب نے انھیں شاعر بننے پر مجبور کر دیا؟ ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا ہوگا لیکن سُنا ہے تالی ایک ہاتھ سے کبھی نہیں بجا کرتی۔ دوسرے ہاتھ کا بھی اس میں ہاتھ ہوتا ہے!

میرے عام ملنے والے اسے میری خوش فہمی سمجھتے رہے اور بعض تو مجھ پر رشک بھی کرتے رہے کہ مجھے ایسے احباب کی صحبت نصیب ہوئی جنھیں عرفِ عام میں شاعر کہا جاتا ہے یا یوں کہیئے جو شاعر مشہور ہوگئے اور غلط العام صحیح کی رو سے شاعر تسلیم کئے جاتے رہے۔ فقط شاعر ہی نہیں۔ مشاعرے کے شاعر مشہور ہوگئے۔ میرے نزدیک عام شاعر اور مشاعرے کے شاعر میں وہی فرق ہے جو عام کریلے اور نیم چڑھے کریلے میں ہے۔ گو یا شاعر اور شاعر تر والی بات۔ یا بقول استاد شاعر اور وہ بھی مشاعرے کا شاعر یعنی بہت ہی شاعر۔

ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ ایک عام شریفانہ شاعر اور مشاعرے کے سکّہ بند شاعر میں فرق ہی کیا ہے، سوائے اس کے دونوں کے طور اطوار ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ اول الذکر لباس اور حلیہ کے معاملے میں زیادہ پابندی کا احترام نہیں کرتا اور موخر الذکر رکھ رکھاؤ کا دھیان رکھتا ہے، جہاں بھی جاتا ہے، لایا جاتا ہے اور بعض اوقات جلوس لایا جاتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ایک عام شاعر اور مشاعرے کے شاعر میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر شعر کہتا ہے اور موخر الذکر شعر سناتا ہے۔ اگرچہ عین ممکن ہے کہ عام شاعر شعر سُناتا بھی ہو اور مشاعرے کا شاعر شعر کہتا بھی ہو لیکن اصل بات وہی ہے کہ اس کے لئے شعر کہنا مقدم ہے اور اس کے لئے شعر سنانا۔ جس طرح اول الذکر کے لئے شعر کہنے کے سلسلہ میں زبان و مکان کی پابندی نہیں، ہر وقت اور ہر جگہ شعر کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح موخر الذکر بھی شعر سنانے کے معاملے میں آزاد ہے۔ لہٰذا اس کے لئے ہر موقع مناسب اور ہر وقت سازگار ہے۔ اس کے لئے ہر اجتماع محفل اور ہر محفل مشاعرہ ہے۔ آپ لاکھ فرمائیں "صاحب محفل جمے گی تو سُنیں گے" لیکن ایک نہ مانی جائے گی اور کارروائی پوری ہوکے رہے گی۔ سراہے کلام سُنائیں گے تو شعر سے شعر نکلتا چلا جائے گا اور اگر محفل منعقد ہوگی تو غزل پر غزل نکلتی چلی آئے گی۔ سراہے ملاقات ہوگی تو کہیں گے۔ جو لطف سراہے شعر سنانے میں ہے محفل میں سنانے میں نہیں، محفل سراسر تکلف بر خلاف اس کے یہ عین بے تکلفی۔ محفل میں اوروں کا بھی حصّہ ہوتا ہے اور یہاں اپنا ہی اختیار رہے۔

ضروری نہیں کہ مشاعرے کا شاعر مشاعرے ہی میں شعر سنائے تو مشاعرے کا شاعر کہلائے۔ یہ ایک ذہنی صورتِ حال کا نام ہے دبستانِ خیال نہیں۔ یہ نہیں کہ اگر آج آپ ادیب ہیں تو کل ترقی پسند ادیب بن گئے ہیں۔ ترقی پسندی راس نہ آئی تو توبہ کی اور پھر ادیب کے ادیب رہ گئے۔ برخلاف اس کے اگر ایک دفعہ مشاعرے کے شاعر ہوگئے تو ہمیشہ کے لئے مشاعرے کے شاعر ہی ہے خواہ کوئی مشاعروں میں شرکت کے لئے مدعو کرے یا نہ کرے، خواہ کوئی شعر سُنے یا نہ سُنے، خود بھی خواہ شعر کہے یا نہ کہے، کوئی اور

اسے شعر کہہ کر دے یا نہ دے۔ وہ بدستور مشاعرے کا شاعر رہے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ پیشے میں تبدیلی کی ضرورت ہوئی تو زیادہ سے زیادہ نعت خواں بن جائے گا اور بس۔

مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میرے احباب جو مشاعرے کے شاعر مشہور ہیں وہ اوائل عمری میں نعت خواں کیوں نہ بن گئے۔ گٹھلیوں کے دام بھی وصول کرتے اور دنیا کے ساتھ اپنی عاقبت بھی سنوار لیتے۔ ہمارے احباب میں سے بعض ایسے مشاعروں کے شاعر ہیں جو شعر برائے عافیت کے بھی قائل ہیں اور اگرچہ چوری چھپے ہی سہی، موقع ملے تو دور کے شہروں سے گٹھلیوں کے دام وصول کرلاتے ہیں۔ ہمارے حلقۂ احباب میں ایسے بھی شامل ہیں جو دن بھر یتیم خانے کے بچوں کی سرکردگی کے سلسلے میں گلی گلی گھومتے ہیں اور شام کو مشاعرہ ہوا تو اس میں بھی شریک ہو جاتے ہیں، ایک دفعہ ایک شاعر نے انھیں ٹوک دیا کہ دن بھر یتیموں کی سرکردگی کرتے رہو اور شام کو مشاعرے میں چلے آتے ہو، ایک طرف رہو، یا یتیم خانہ چلاؤ یا مشاعرہ کماؤ۔ دونوں نہیں چلیں گے۔ کہنے لگا، اگر تم دن بھر کرائے کے تانگہ میں کھڑے ہو کر مقوی بصر سرمہ بیچ سکتے ہو تو میں اپنے یتیم بچوں کے لئے کیوں نہیں گھوم سکتا۔

بات چلی تھی میرے احباب کی اور پہنچی مشاعرے کے شاعروں تک۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجھے ایسے احباب کی صحبت نصیب ہوئی جو مشاعرے کے شاعر مشہور تھے۔ مجھ سے معمولی جان پہچان کے —— لوگوں نے ایک انگریزی ضرب المثل کی مدد سے یہ نتیجہ نکلا کہ میں بھی نعوذ باللہ اسی قماش کا ہوں۔ حالانکہ سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے ان کی صحبت تو ضرور نصیب رہی لیکن حاشا وکلّا میرا رشتہ ان سے ایسا نہیں جو ان کا مشاعروں سے ہے بلکہ ان سے میرا رشتہ وہی ہے جو خود ان کا شعر سے ہے۔ اگر ان کا کوئی واسطہ شعر سے گردانا جا سکتا ہے تو میں بصد خوشی یہ الزام قبول کرنے کو تیار رہوں کہ میں بھی ان ہی میں سے ایک ہوں۔ لیکن افسوس کہ بعض حضرات نے مجھے اس ضرب المثل کا ہدف بنایا کہ

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

میں نے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ عرض کیا حضور اگر آپ علامہ اقبال کو بڑا شاعر سمجھتے ہیں تو اس کی کہی ہوئی بات کو بھی حق تسلیم کرنا پڑے گا کہ ؎

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں　　　شاہیں کا جہاں اور ہے زرگس کا جہاں اور

جواب ملا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش۔ تم چاہتے ہو تمہاری بات مان لیں اور ضرب المثل کو صحیح نہ گردانیں جن کی صداقت باپ دادا کے وقت سے مسلم چلی آرہی ہے۔ ہوش کرو، کبھی کبوتر بھی بازوں میں اُڑے ہیں۔ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ کبوتر با کبوتر باز با باز۔ لہٰذا تم بھی مشاعرے کے شاعر ہو اور تمہیں ماننا ہوگا۔" اس کے بعد میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

میں آپ کے سامنے تو جھوٹ نہیں بول سکتا نا۔ آپ یقین فرمائیں جب بعض کوتاہ اندیش مجھے اسی فرقہ کا فرد سمجھ کر میرا احترام کرتے ہیں تو مجھے سخت ندامت ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ من آنم کہ من دانم، لیکن انھیں کیا وہم ہے۔ بس بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت میری حالت کیا ہوتی ہے کہ ایک طرف تو میرا احترام کیا جاتا ہے اور دوسری طرف میرے احباب کے فقرے میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ تف ہے تجھ پر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ بھی رنگ پکڑ لیتا ہے لیکن تم کورے کے کورے ہی رہے۔ ہماری صحبت کے باوجود تم میں شعر کا ذوق پیدا نہ ہوا۔ ذوق تو ایک طرف شعر ادا کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوئی۔ وہ کہا کرتے ہیں یاد رکھو ہم لوگوں کے لئے شعر کہنا اتنا ضروری نہیں۔ اس کا انتظام تو ہو جاتا ہے، شعر ادا کرنا ازبس ضروری ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہیں اور اگر یہ صلاحیت پیدا نہ ہوئی تو تم ہماری صحبت کے لائق نہیں۔

ایک آدھ دن نہیں ایسی خفت قریب قریب ہر روز اٹھانا پڑتی۔ چنانچہ میں نے نہایت سنجیدگی اور خلوص سے کوشش شروع کردی کہ شعر ادا کرنے کی مشق ہو جائے تاکہ اگر کہیں قابو آ جائیں تو نجات کی صورت بن جائے۔ خدا گواہ ہے میری مدد کرنے میں دوستوں

نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور میں نے خود بھی بے حد محنت کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ غسل خانے میں نہانے سے قبل کئی شعر صحیح طور پر ادا ہو جاتے لیکن وہی شعر اگر احباب کے روبرو ادا کرنے پڑے تو آخر نگاہیں جھکانی پڑیں اور معافی مانگنی پڑی۔ چنانچہ شعر کا استعمال اشد ضروری ہوتا اور مصرع کے چند الفاظ کہتے اور ساتھ ہی "والا معاملہ ہے" سے بات ختم کر دی جاتی بالکل ایسے ہی جس طرح کسی کی زبان میں لکنت ہو اور وہ "جی ہاں" کہہ کے کٹھن منزل سے گذر جائے۔ ہم ایسے جملے اکثر استعمال کرتے تھے "جی ہاں۔ رہیئے اب ایسی جگہ چل کر والا معاملہ ہے"۔۔۔۔۔ "ارے صاحب قصہ وہی ہوا نا کہ لٹا تا نہ گھر کو میں"۔۔۔۔۔ "یہ تو بنا تری رضا کیا ہے والی بات ہوئی"۔۔۔۔۔ علیٰ ہذا۔ قصہ مختصر میرے احباب نے بہت جتن کئے لیکن میں تھا کہ فعلن فعلن فع ہی کا چکر پورا نہ کر سکا۔ مجھ میں ہم قافیہ الفاظ کا احساس پیدا نہ ہوا۔ میری حالت یہ رہی کہ ایک دوست غزل سنا رہے ہیں اور باقی دوست بآواز بلند مصرع اٹھا رہے ہیں لیکن میں ہوں کہ ہر شعر پر لفظ کو ہلائے جا رہا ہوں۔ اگر شاعر نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مصرع دہرایا تو اول تو میں نے آنکھیں ہی پھیر لیں اگر اس کا موقع نہ ملا تو زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ لب ہلانے شروع کئے گویا منہ میں مصرع اٹھا رہا ہوں۔ ایک دفعہ غیر دانستہ طور پر بآواز بلند مصرع اٹھایا تو شاعر شعر سناتے ہوئے رک گیا اور ہم سے یہ کہہ دیا گیا تم پان اور سگریٹ لے آؤ۔ ہم اتنی دیر میں غزل ختم کر لیں گے میں بھی تاڑ گیا اور خوشی خوشی پان اور سگریٹ لینے روانہ ہو گیا۔

لیکن ایسا واقعہ فقط ایک دفعہ ہی ہوا۔ میرے احباب یوں مجھ پر مہربان ہی رہے۔ ایک روز حسب معمول ہم اپنے قہوہ خانے میں بیٹھے تھے کہ اپنے ہی حلقۂ شعرا کے شاعر آئے۔ آتے ہی کہا "غزل ہوئی ہے۔ سنو"۔ غزل سنائی تو ظاہر ہے تعریف بھی ہوئی اور یار لوگوں نے خوب داد بھی دی۔ ان دوستوں کی صحبت کی وجہ سے مجھے داد دینے کا ڈھنگ آ گیا۔ کوئی شاعر پہلا مصرع پڑھے تو میں اس کے پاس بیٹھنے والوں کے چہروں کا جائزہ لیتا ہوں اور مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ شعر داد کے قابل ہے یا نہیں۔ صرف یہی نہیں مجھے اتنی مشق ہو گئی ہے کہ مجھے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس شعر پر فقط سبحان اللہ کہا جائے گا یا واہ واہ کی گردان کی جائے گی یا ہاتھ پھیلا کر اچھل اچھل کر داد دی جائے گی۔ ادھر شاعر نے شعر پڑھا۔ اس کے اعتماد سے کچھ اندازہ لگایا اور کچھ سننے والوں کے تیور پہچان لئے کہ داد کی اٹھان کیا ہو گی۔ چنانچہ اسی کے مطابق تیاری کر لی۔ میں نے آزمایا ہے کہ داد دینے کے معاملہ میں اس قدر ماہر ہو گیا ہوں کہ مجھے شعر نہ بھی سنایا جائے جب بھی سننے والوں کے تیور دیکھ کر موقع کی داد دے سکوں گا۔ تو جب وہ شاعر غزل سنا رہے تھے تو میں نے موقع کے مطابق داد دی۔ داد کا دور ختم ہوا اور وہ غزل بھی سنا چکے تو مکمل خاموشی طاری ہو گئی۔ میرے منہ سے نکلا "سبحان اللہ۔ کیا غزل تھی"! خاموشی تھی اسلئے یہ فقرہ شاعر تک پہنچ گیا شاعر نے کہا: "یہ غزل تمہیں پسند ہے؟" میں نے جواب دیا "یقیناً پسند ہے، بہت اچھی ہے"! بولے "اچھا پسند ہے تو تم لے لو"! اور ساتھ ہی وہ کاغذ کا پرزہ جس پر غزل لکھی تھی میرے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔۔۔ "لے بھی لو"۔۔۔۔۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی اپنے دوست کی تھالی کی تعریف کرے اور وہ دوست وہی تھالی اتار کر دے دے۔ میں نے انکار کیا۔ دوستوں نے کہا تکلف نہ کرو لے لو۔ ایک اور صاحب نے کہا "ارے یار کیا ہے، غزل ہی تو ہے، کوئی حویلی تو نہیں دے رہا تمھیں، لے لو نا"! بس مجبور ہو گیا، ایک شاعر نے وہ کاغذ کا پرزہ اٹھا کے میری جیب میں ٹھونس دیا "ہمارا کیا ہے، ہم ایسی غزل روز لکھتے ہیں، ایک تم نے لے لی تو کیا فرق پڑے گا"!

بات آئی گئی ہو گئی۔ چند روز کے بعد ایک اور قہوہ خانے میں بیٹھنے والے حلقۂ شعرا کے ایک شاعر ہمارے قہوہ خانے میں آئے۔ ہمارا بھی تعارف کرایا گیا کہ آپ ہیں۔۔۔۔۔ "جناب شاعر کوٹ رادھا کشنوی" (اسی شاعر نے جس نے مجھے غزل دی تھی میرا تخلص شاعر ہی رکھ دیا تھا۔ اور کوٹ رادھا کشن میں چونکہ ہمیں زمین الاٹ ہوئی تھی اس لئے اسے بھی ساتھ شامل کر لیا تھا) احباب نے معزز مہمان شاعر کی خاطر تواضع اپنی غزلوں سے کی اور انھوں نے اپنی غزل سنائی۔ جب ایک دور ختم ہوا تو مہمان شاعر نے میری طرف رجوع کیا۔ ہم نے سگریٹ پیش کر دی۔ سگریٹ لے لی اور کہا شکریہ! لیکن غزل سنائیے"! میں سچ بولا کہ میں غزل نہیں کہتا تو وہ ہنسے۔ میں انکار کرتا اور وہ اصرار کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ وہ شاعر جس نے اپنی غزل مجھے بخشی تھی، بول اٹھا "بھئی وہی سنا دو جس کی ردیف ہے

،جائے دیکھ لیا اور پا کے دیکھ لیا؟" دوسرے احباب نے بھی "سناؤ سناؤ" کہنا شروع کر دیا۔ عجب مشکل درپیش ہوئی۔ میں نے عذر پیش کیا کہ نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہوں جب بھی اپنی غزل سنانے لگتا ہوں تو زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ بلا ٹل جائے گی لیکن وہی شاعر جس نے غزل ابھی تھی کہنے لگے۔ "اچھا مجھے تمہاری وہی غزل یاد ہے، میں سنائے دیتا ہوں"، اور ساتھ ہی اپنی وہی غزل سنانی شروع کر دی جو مجھے دی تھی۔ ہر شعر کو دہراتے اور خود ہی داد دیتے اور وصول بھی کرتے۔ جوں جوں غزل کو داد زیادہ ملتی تھی میری ندامت میں اضافہ ہوتا تھا اور جب مقطع پر بہت داد ملی تو اس شاعر نے میری طرف دیکھا جو غزل سنا رہا تھا وہ زیر لب مسکرایا اور میری نظریں جھک گئیں۔ محفل ختم ہوئی تو میں بگڑا۔ احباب نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ہماری صحبت میں رہو گے تو شاعر مشہور ہونا پڑے گا۔ اور خصوصاً اس وقت تو غزل سنانا ہی پڑے گی جس وقت غیر حلقہ کا کوئی شاعر ہمارے پاس آئے گا —— چنانچہ رفتہ رفتہ میں بھی شاعر مشہور ہو گیا۔

آپ دریافت فرمانا چاہیں گے کہ آخر ان احباب کی صحبت ہی کیوں اختیار کی۔ ہمیں مشاعرے سننے کا بے حد شوق تھا۔ اور ان شعرا سے دوستی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی وساطت سے نہ صرف مشاعرے میں شرکت کا موقع ملتا تھا بلکہ بڑے احترام سے اچھی جگہ پر بٹھایا جاتا ہے۔ اور چونکہ میں اپنے پہناوے وغیرہ میں خاص احتیاط برتتا تھا کہ مجھ میں اور شعرا میں کوئی فرق نہ ہو لہذا مجھے بھی پان سگریٹ بافراط ملتے تھے۔ سگریٹ اور پان مفت اور بافراط ملیں تو میرا وقت اچھا کٹ جاتا ہے۔ ایک روز شعرا کی ایک ٹولی کی معیت میں حسب معمول آداب بجالاتا ہوا اسٹیج پہ پہنچا تو میرا غیر معمولی طور پہ استقبال کیا گیا۔ کوئی صاحب میری طرف اشارہ کر رہے تھے اور منتظمین بچھے جا رہے تھے۔ خیر مجھے بٹھا دیا گیا اور حسب معمول پان سگریٹ کا دور چلا۔ مشاعرہ ہوتا رہا۔ میں مشاعرے کی اسٹیج پہ بیٹھ کر اپنے اوپر شاعرانہ کیفیت طاری کر لیتا ہوں۔ سگریٹ کا گہرا سرمئی دھواں نکالتا ہوں اور لگاتار سگریٹ پیتا ہوں۔ ایک سے دوسرا جلاتا ہوں۔

میں سگریٹ کے دھوئیں میں گم تھا کہ میرے ایک احباب نے میرا گھٹنا دبایا، میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے صاحب صدر کی طرف اشارہ کر دیا۔ میں نے کرسیٔ صدارت کی طرف دیکھا تو اسٹیج پہ مکمل خاموشی تھی سبھی شعرا میری طرف دیکھ رہے تھے۔ صاحب صدر کے قریب کرسی پہ وہی شاعر بیٹھے تھے جو ہمارے قہوہ خانے میں "میری" غزل سن چکے تھے۔ وہی میری طرف اشارہ کر رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ صاحب صدر نے فرمایا: "آئیے نا شاعر کوٹ رادھا کشنوی صاحب تشریف لائیے گا۔" میں نے آنکھیں جھپکیں۔ سر ہلایا۔ پھر صاحب صدر کی طرف دیکھا۔ وہ میرا ہی تخلص پکار رہے تھے میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا، انھوں نے ماشاءاللہ کا نعرہ لگایا اور حاضرین نے "تالی پیٹ دی"۔ میں پسینے میں شرابور ہوں، میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ شاید بہت بڑا شاعر ہے تکلف برت رہا ہے۔ چنانچہ حاضرین میں سے "تشریف لائیے تشریف لائیے" کی آوازیں آئیں۔ ایک دوست نے کاغذ کا پرزہ میری جیب میں ڈالا اور کہا جاؤ۔ میں صاحب صدر کے قریب جا کھڑا ہوا معذرت کی۔ حاضرین نے کہا انکسار کی ضرورت نہیں، ارشاد فرمائیے۔ گویا وہی "کند ہم جنس با ہم جنس" والی بات —— جیب میں ہاتھ ڈالا اور پرزہ نکالا۔ حاضرین نے کہا "غزل ساتھ لائے تھے تکلف فرما رہے تھے" اور اب معاملہ صاحب صدر کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور حاضرین نے مجھ سے براہ راست تعلق پیدا کر لیا تھا اور مجھے اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ صاحب صدر نے فرمایا "ارشاد" حاضرین نے کہا "ترنم سے" اور صاحب صدر نے خود ہی حاضرین کے مطالبے کو منظور کر لیا اور اعلان کر دیا "جی ہاں ترنم ہی سے ارشاد فرمائیں گے"۔ میں نے کس بےبسی کے عالم میں صاحب صدر کی طرف دیکھا اور انھوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ مجھے تو خیر معلوم نہیں میرے احباب کی روایت ہے کہ اس وقت تک مجھ پہ لرزہ طاری ہو چکا تھا اور اس کا ایک ثبوت ملتا بھی ہے کہ میں نے سہارا لینا چاہا اور میرا ہاتھ مائیکروفون کے ڈنڈے پر پڑا، مائیکروفون نیچے آ گرا۔ قہقہہ بلند ہوا، مائیکروفون سیدھا کیا گیا اور اس عرصہ میں میں نے اسی شاعر کو بلایا جس نے میری جیب میں کاغذ کا پرزہ ٹھونسا تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور اس نے اعلان کیا کہ جناب شاعر کوٹ رادھا کشنوی کے گلے کا آپریشن ہوئے چند روز گذرے ہیں ڈاکٹر نے حضور کو منع کر رکھا ہے کہ حضور بآواز بلند یا ترنم سے شعر نہ پڑھیں لہذا حضور کی اجازت سے حضور کا نیازمند حضور کی غزل پیش کرتا ہے، حضور پاس کھڑے رہیں گے۔" اس نے میری طرف دیکھا میں نے پھر آنکھوں آنکھوں سے اشارہ کیا اور اس نے اعلان کیا کہ حضور تشریف رکھیں گے۔ جونہی میں اپنی جگہ پہ آیا تو اس نے ترنم سے اپنی غزل سنائی اور خود داد وصول کی۔ اور یہ ان سے میری صحبت کا آخری دن تھا۔ آپ شاید تسلیم نہ فرمائیں لیکن ضرب المثل کی صداقت سالہا سال سے مسلم ہے کہ بد سے بدنام برا۔

ماڈرن آرٹ

• دیویندر اِسّر

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

• یا تصویر مفہوٗن

دیویندر اِسّر نے اس مضمون میں مصوری کے سرریلزم سکول کا مذاق اُڑاکر اچھا نہیں کیا۔ ہم چاہتے ہیں کہ سرریلزم سکول والے اِس مضمون کا مُنہ توڑ جواب دیں۔ لیکن جواب دیتے وقت اتنی احتیاط ضرور رکھیں۔ کہ وہ سمجھ سے بالاتر نہ ہو۔ سمجھ میں آنے والے مضمون کے لئے شاہراہ کے صفحات کھُلے ہیں۔

ماڈرن آرٹ سے میری دلچسپی کا آغاز ایک دلچسپ، مگر دلخراش واقعہ سے ہُوا۔ میری پچیسویں یا ستائیسویں سالگرہ تھی۔ یار دوستوں نے کچھ شکوے کئے، کچھ گالیاں دیں، کچھ لطیفے سُنائے، کچھ تحفے دیئے، کچھ کیک اُڑائے، اور چلتے بنے۔ ان دوستوں میں میرے مصور دوست للت کمار بھی تھے۔ وہ سارا یوُرپ گھوم آئے تھے۔ وہ تین سال پیرس کی آرٹ گیلریوں کا طواف بھی کر چکے تھے۔ اور ماڈرن آرٹ میں مشق کرتے کرتے اب ہمیں تختۂ مشق بنا رہے تھے۔ ہندوستان میں وہ خود بھی کسی نئے رجحان کے موجد تھے۔ اس رجحان کا نام مسمریزم یا ہپنا ٹزم وغیرہ سے ملتا جلتا تھا۔ اُنھوں نے میری سالگرہ پر ایک تصویر پیش کی۔ جو اُن کے رجحان کی پختگی میں ایک نئے موڑ کا شاخسانہ تھی۔

یہ تصویر نہ فوٹو تھی نہ کارٹون۔ جیومیٹری کی بے ربط اور غیر متوازن اشکال کو بے ترتیبی سے کاغذ پر جمع کر دیا گیا تھا جس میں زرد رنگین تحفور ہیں اِس سیاہ اور رنگین تصویر کو دیکھ کر حالت دگرگوں ہونے لگی۔ میں نے سوچا وہ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ گویا یہ بھی کوئی تصویر ہے لیکن جب اُنھوں نے اِس حقیقت کا انکشاف کیا کہ یہ تصویر دراصل میری ہے تو انگشت بدنداں رہ گیا میں نے اُس تصویر کو دائیں بائیں، اوپر، نیچے ہر حالت سے دیکھا لیکن اپنی صورت کسی سمت سے نظر نہ آئی۔ للت کمار سے پوچھنے کی جسارت نہ کر سکا۔ کہ یہ کس زاویہ سے میری تصویر ہے۔ مجھ میں اور اِس تصویر میں کونسی مماثلت ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ وہ ماڈرن آرٹ پر ایک جامع اور مفصل تقریر فرما دیں گے اور ماڈرن آرٹ کے جدید ترین رجحانات کے نفسیاتی محرکات پر بحث کریں گے جس میں شعور، لاشعور، غیر شعور، بے شعور، تحت الشعور، عدم شعور، کم بیش شعور، ماورائیت، داخلیت، خارجیت، انفرادیت، صلاحیت، درایت، بغاوت، مابعد الطبعیات، وجدانیت اور ذہنی کیفیت کے مختلف الفاظ میں زمان و مکان سے بے نیازیت، جسم کی روحانیت اور روح کی جسمانیت تک بات جا پہنچے گی۔ اور اپنی شکل کے ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی مسخ ہو جائے گا۔

میں نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا، اپنا عکس دیکھا۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ پھر آئینے میں جھانکا۔ اور اُسے تین بار صاف کر کے دیکھا کہ کہیں آئینے میں کوئی خرابی نہ ہو گئی ہو۔ لیکن اپنے چہرے کے وہی جانے پہچانے خد و خال تھے اور وہی جلال و جمال تھا۔ اپنی

ایک حالیہ فوٹو دیکھی۔ اپنے چہرے کے وہی متناسب اعضا تھے۔ یار دوستوں سے مشورہ کیا۔ شک ظاہر کیا۔ سب نے کہا کہ نشے میں ہوں۔ آئینے میں اپنے عکس اور فوٹو کا موازنہ کیا۔ سب کچھ اپنا ہی تھا لیکن یہ تصویر —— یااللہ کمار! یہ ماجرا کیا ہے؟ پریشانی اور عاجزی کے عالم میں اس تصویر کو caricature سمجھ کر قبول کر لیا۔ اور اسے اُس خاتون کو دکھلایا جس سے میں وعدہ فردا کے تحت کچھ راز و نیاز کی باتیں کرنے کا خواہشمند تھا۔ اور تحت الشعور کے تحت اپنی خوبصورتی کی تعریف چاہتا تھا۔ تصویر دیکھتے ہی وہ خاتون اُچھل پڑی۔ اور میرے اوپر گرتے گرتے بچی۔ حالانکہ میں لاشعور میں اس حادثے کا کب سے منتظر تھا۔

"حیرت انگیز!" اُس نے کہا۔ آرٹسٹ نے تمہاری روح کو چھو لیا ہے۔ یا پکڑ لیا ہے اور پھر اُسے نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے۔"

روح کے نکلنے کا نام سن کر جیسے میری روح نکل گئی۔

"میں نے بار ہا سوچا" وہ بولی۔ تمہاری روحانی اور جسمانی (شاید ذہنی بھی کہا تھا) تشکیل میں وہ کونسا مخصوص خلا ہے جس کے باعث تمہارے اور میرے درمیان ایک دیوار چین، حائل ہو گئی ہے"۔ (حالانکہ میرے اور اُس کے درمیان دیوار چین کی بجائے میری نسوانیت اور اُس کی پارسائیت حائل تھی) اُس خاتون نے مزید انکشاف کیا کہ یہ تصویر میرا صحیح اور فنکارانہ عکس ہے۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ کیسا آرٹ ہے؟ جس سے وہ خاتون میری جسمانی، روحانی، ذہنی اور بے سروسامانی کی تشکیل کے راز کو پا گئی ہے۔ اور للت کمار نے میری روح نکال کر کاغذ پر رکھ دی ہے (واہ اچھی دوستی نبھائی ہے، اور صاحب آئینے میں اپنی صورت دیکھ رہے ہیں اور اپنا سا منہ لے کر رہ گئے ہیں۔ خیر اب تو یہ بھی مشکوک ہے۔ کہ اپنا منہ کونسا ہے۔ اور کہیں ہم کسی دوسرے کا منہ لے کر نہ رہ گئے ہوں۔ آڑی ترچھی لکیروں کو مختلف زاویوں سے اس طرح کھینچ دینا کہ جیومیٹری کی تمام اشکال میں مزاجی بغاوت کا گمان ہونے لگے ماڈرن آرٹ کا کمال نہیں۔ بلکہ ان لکیروں کے پس پردہ ہزاروں راز چھپے ہوئے ہیں۔ اس لئے لکیروں کی زبان سیکھنی چاہیئے بہرکیف آپ کاغذ پر میری روح اور میرے بے روح کے گوشت پوست کے مجسمے اور ہڈیوں کے ڈھانچے کو ملاحظہ فرمائیے۔ اور مجھے بتائیے کہ میں وہ ہوں جو اپنے آپکو سمجھتا ہوں جو میرے فوٹو میں منعکس ہے یا جو آئینے میں نظر آتا ہوں یا وہ ہوں جو للت کمار کی تصویر میں ہے۔ یا اُس خاتون کے لاشعور میں ہے)

اب آپ اس تصویر پر غور فرمائیے۔ سر کے درمیانی حصے سے بال غائب۔ حالانکہ میں اپنے گنجان بالوں کے باعث زلف پریشان بنا رہتا ہوں۔ گنجا پن مفکر ہونے کی نشانی ہوتا ہے۔ اور للت کمار مجھے مفکر سمجھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے میری حجامت کر کے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ یہ کام اُن کی امداد کے بغیر ایک نائی بھی کر سکتا تھا جو مکمل طور پر سر صاف کر کے مجھے مفکر کے ساتھ ساتھ ہمرل بھی ثابت کر سکتا تھا۔

عینک کی طرف توجہ فرمایئے اس کا فریم ٹوٹا ہوا ہے ۔ اور اس کے اندر آنکھیں بند ہیں۔ اس کی کئی تاویلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

(۱) شاید آنکھیں اس لئے بند ہیں کہ طلعت گلکار نے میری روح نکال کر کاغذ پہ رکھ دی ہے۔

(۲) جسم کی آنکھ بند ہوگئی۔ اور روح کی آنکھ کھل گئی ہے۔

(۳) مجھ میں وجدانی قوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لئے وہ نظری قوت پر چھا گئی ہے۔

(۴) میں حقیقت سے نظر چراتا ہوں

یا میرا کوئی واضح نقطہ نظر نہیں یا عینک کی طرح میرے شعور کا فریم بھی ٹوٹا ہوا ہے

چہرے کو مجموعی حیثیت سے دیکھئے۔ راس کماری جو ٹھوڑی سے شروع ہوتی ہے۔ وہ کوہ وندھیاچل تک پہنچی ہے جو سر پر ختم ہوتی ہے۔ نیچے چاک گریبان سونے کی لنکا معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کا یہ نقشہ چہرے پر اس لئے بنایا گیا ہے کیونکہ طلعت گلکار نیم ترقی پسند مصور ہیں۔ اور ہر ترقی پسند مصور کی طرح اس مقولہ پر یقین رکھتے ہیں کہ آرٹ کا مواد [illegible] اکی ہیئت بین الاقوامی ہونا چاہئے۔ اور اس کا فارم قومی۔ اس تصویر میں ہندوستان ظاہری ہے اور میرے سر کے پیچھے پیرس کی عریاں خاتون کا خاکہ ان کا بین الاقوامی مواد ہے۔ طلعت گلکار کے خیال کے مطابق سر کے پیچھے دی ترڈ۔ یعنی ننگی عورت اس [illegible] نہیں سکا۔ تصویر میں توازن رکھنے کیلئے بنائی گئی ہے۔ [illegible] میرے ذہنی توازن کے لئے یہ عورت موجود ہے اور [illegible] میرے لاشعور میں جو عورت موجود ہے۔ اس کا اشاراتی عکس ہے۔ تصویر کیا ہوئی ہندوستان کا جغرافیہ ہوگیا۔

لیکن ناک کہاں گئی؟ عجب بات ہے بالکل غائب حالانکہ میں ناک رکھنے کے لئے ہی انہوں نے اپنی جیب پر ڈال کر اسے ساتھ منائی ہے۔ میں نے اپنی ناک کو چھوا جبکہ تصویر کے حساب سے کان چھونا چاہئیں تھے۔ وہاں موجود ہے۔ اپنے دونوں نتھنے غاروں کے ساتھ سامنے سے چھوا۔ پھر سر گھما کر چہرہ ادھر سے ادھر سے نہ چھوا ادھر سے چھوا۔ ناک چہرے پر تھی اور ناک درست ہی چہرے پر موجود تھی۔ ہیں! یہ ناک پر عینک ٹکا نہیں بیٹھنے دیتا۔ سو عینک بھی بیٹھا کے دیکھو۔ لیکن عینک نے بغیر ناک کے بیٹھنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر پھڑ سے اڑ گئی۔ آخر کار ناک کی عدم موجودگی کی تشریح یوں کی گئی کہ میں اپنے افسانوں میں حقیقت سے نظر چراتا ہوں اور اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے ناک اڑا دی جائے تاکہ میں حقیقت نگاری کا فریضہ سر انجام دے سکوں۔ یعنی یہ ناک اڑانا ماڈرن آرٹ میں حقیقت نگاری کے لئے استعمال کرنا ہے۔

ناک کی بات چلی تو ایک واقعہ یاد آگیا۔ ماڈرن آرٹ کے ایک نامور نمائندہ ڈی جی فون نے ایک تصویر بنائی۔ اس تصویر کے بنانے کے بعد وہ گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھا گم سم سوچتا رہا۔ جب وہ متواتر ساڑھے تین گھنٹے اور گیارہ منٹ تک بلا ضرورت تصویر کی جانب دیکھتا رہا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں نے پوچھا۔

آخر اس تصویر میں ایسی کونسی جاذبیت اور خوبی ہے جو تم متواتر تین گھنٹے سے اسے غور سے دیکھ رہے ہو۔

"مجھے اس تصویر میں ناک پسند نہیں،" انہوں نے فرمایا۔

"تو پھر درست کیوں نہیں کر لیتے۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ پتہ نہیں چل رہا کہ ناک ہے کہاں؟" وہ بولے اور پھر تصویر پر جھک کر دوبارہ ناک ڈھونڈنے میں غرق ہوگئے۔

ڈی جی فون وہی تصویر میں اپنے ہاتھوں ناک بنا کر گم کر بیٹھے اور اگر ہم ناک پا کر کھو بیٹھے تو کیا غم ہے۔ یاد رہے کہ ڈی جی فون ہندوستان میں سرریلزم کے مداح اور پیروکار ہیں۔ بات سرریلزم کی چلی تو یہ بات بھی یاد آ گئی کہ میں ڈی جی فون سے ملنے سے پیشتر اس تحریک کو ڈاڈا ازم سمجھتا تھا۔ ان سے ملنے کے بعد یہ بھید کھلا کہ یہ تحریک ڈاڈا ازم نہیں درحقیقت سرریلزم ہے۔ اس طرح ڈاڈا ازم کو میں آرٹ میں غنڈہ گردی سمجھتا تھا۔ وہ درحقیقت ماڈرن آرٹ میں ایک رجحان کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ اس تحریک کا نام ڈکشنری سسٹم سے پڑا تھا۔ جب اس نئے رجحان کا کوئی نام نہیں سوجھ رہا تھا تو لغات کھولی گئی اور جس لفظ پر سب سے پہلے نظر پڑی وہ اس تحریک کا عنوان بن گیا۔ ان دونوں تحریکوں کے بارے میں میں نے سمجھنے کی انتہائی کوشش کی لیکن پوری کی پوری تحریک کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ہو کر رہ گئی۔ اب

سلسلے میں میں نے اپنے دوست للت کمار سے وضاحت چاہی۔ اُنھوں نے کہا کہ تم ماڈرن آرٹ کے معاملے میں بالکل انجان ہو۔ اس کے بعد اُنھوں نے سرریلزم کی تعریف بتائی کہ حقیقت کے شعوری تصور کو تحت الشعور کے راستے لاشعوری اثرات میں سمو کر دجدانی قوت سے انفرادی انداز میں دیکھنے والے کے ذہنی محرکات میں ماورائی احساس تخلیل کرنے کا نام سرریلزم ہے۔

"میں نہیں سمجھا للت کمار جی۔" میں نے مجبوری ظاہر کی۔

"بارہا ایسا ہوتا ہے کہ خود آرٹسٹ بھی نہیں سمجھتا کہ اُس نے کیا بنایا ہے"۔ اُنھوں نے نہایت فلسفیانہ بے نیازی سے فرمایا۔ اگر فن کار خود بھی نہیں سمجھتا کہ اُس نے کیا بنایا تو ہم جو اس آرٹ میں لکیر گھسیٹ کی حیثیت رکھتے ہیں وہ کیا سمجھیں گے۔ بات سرریلزم کی چل رہی تھی۔ کافی عرصہ کی بات ہے میں نے ایک کہانی لکھی تھی۔ "جب رات بہت گہری ہوتی ہے۔ میں نے یہ کہانی للت کمار کو سُنائی۔ اُنھوں نے فوراً ایک کاغذ پر تصویر بنانا شروع کر دی۔

"آپ میری کہانی سُن رہے ہیں یا تصویر بنا رہے ہیں"۔ میں نے کہا۔

"کہانی ہی تو سُن رہا ہوں ورنہ اُس کی یہ تصویر کیسے بن گئی"۔

"کیا یہ اُسی کہانی کی تصویر ہے"۔

"نہیں تو اور کیا"۔ وہ بولے۔

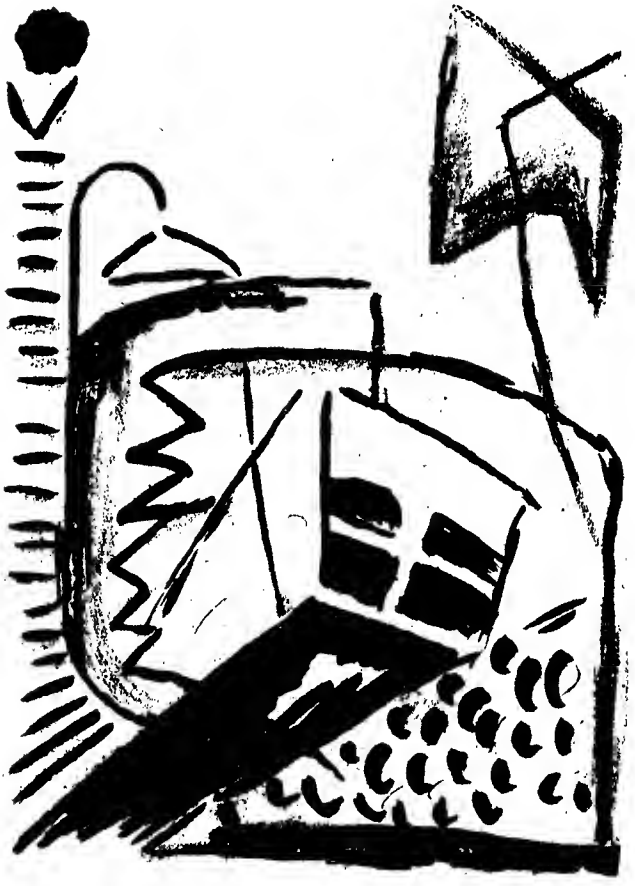

جب اُنھوں نے اُس تصویر سے نقاب اُٹھایا تو ایمان لانا ہی پڑا کہ ماڈرن آرٹ کی معنوی حیثیت اتنی گہری ہوئی ہے کہ فارم پر عبور ہونا لازمی ہے اور کئی بار تو ماڈرن آرٹ میں صرف فارم ہی ہوتی ہے اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جیسے شراب کی خالی بوتل یا مٹی کے تیل کی بوتل پر شراب کا لیبل۔ یہ تصویر جو آپ دیکھ رہے ہیں اُسی کہانی کی عکاسی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ تصویر نمبر ۲۔ کہانی "جب رات بہت گہری ہوتی ہے"۔

اس تصویر میں چاند ہے۔ بائیں جانب سیاہ گولہ ہے۔ اور یہ شاندار باغ نہیں ٹیبل لیمپ ہے جو پرے سر پر لٹک رہا ہے۔ ٹیبل کہاں ہے؟ وہ ٹیبل لیمپ کے لاشعور میں ہے۔ اس لئے نظر نہیں آرہا۔ نیچے ٹیڑھی میڑھی سڑک ہے جو افق کی

جانب جاتی ہے۔ اس کراس کے اوپر افق ہے۔ افق کے ساتھ کھڑکی ہے۔ جو باہر کی طرف کھلتی ہے یعنی کھڑکی کے اندر افق ہے۔ آپ کا یہ سوال جائز ہے کہ کھڑکی کے اندر۔ اُفق کیسے داخل ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ ذہنی افق ہے۔ اور ذہنی افق کو وسیع کیے بغیر روشن چاند کبھی بھی سیاہ چاند ــــ نہیں بن سکتا ــــ اس سے بھی یہ مُراد لی جا سکتی ہے کہ روشنی چاند میں یا کسی خارجی شے میں نہیں دل میں مقیم ہوتی ہے۔ اُردو کے ایک نامور شاعر دس سال پہلے کہا تھا۔ ؎

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

اور آخر دس سال بعد للت کمار نے چاند، کو بھی گل کر کے دکھا دیا۔ اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ماڈرن آرٹ کے کسی نئے رجحان کا ظہور ہمیشہ شعوری نہیں ہوتا۔ عام طور پر آرٹسٹ لاشعوری طور پر ہی کسی نئے رجحان کا اظہار کر جاتا ہے۔ اُس کے آرٹ کے پرستار اپنی، چشم بینا ہے جو عینک کے موٹے موٹے شیشوں کی مرہون ہوتی ہے۔ اُس سے اس نئے رجحان کا پتہ کر لیتے ہیں۔ جو خود آرٹسٹ کی نگاہ سے پوشیدہ رہتا ہے۔ لیکن جسے وہ لاشعوری طور پر ظاہر کر چکا ہوتا ہے۔ ماڈرن آرٹ میں امپریشنزم Impressionism. کا آغاز بھی اسی طرح ہوا ایک نامور آرٹسٹ (اُسکا نام اس وقت ذہن سے اُتر گیا ہے۔ مبہم سا Impression (امپریشن جاتی ہے) کی ایک تصویر نمائش میں آئی۔ ماڈرن آرٹ کے نقادوں نے اس تصویر کی پہلے دل کھول کر اور پھر قلم کھول کر تعریف کی۔ ماہرین فن کی نظر میں اپنے مجموعی تاثر کی گہرائی کے باعث وہ تصویر اُس نمائش کی بہترین تصویر تھی۔ اس آرٹسٹ کو اس تصویر پر اول انعام ملا۔ جب آرٹسٹ کو خبر ملی تو وہ بھی نمائش میں تشریف لایا۔ وہ اپنے مداحوں کے ہجوم کو چیر کر آگے بڑھا۔ اپنی تصویر کی جانب دیکھا جس کی لوگ مدح سرائی کر رہے تھے۔ تو اُس نے سر پیٹ لیا۔ یہ اُس کی تصویر کا دوسرا رخ تھا جو غلطی سے بدل گیا تھا اور جس پر وہ اپنے برش کے رنگوں کو صاف کرتا تھا اور اس کو اصل تصویر سمجھ کر اُسے اول انعام سے سرفراز کیا گیا تھا اس طرح ماڈرن آرٹ میں ... کی تحریک کا آغاز ہوا۔

چنانچہ اپنی تصویر کے بعد ماڈرن آرٹ میں میری دلچسپی جنون کی حد تک بڑھ گئی پچھلے دنوں ہندوستان میں انٹرنیشنل آرٹ نمائش دیکھنے کے لیے آرٹ گیلری چلا گیا۔ دُور دراز ممالک سے ماڈرن آرٹسٹوں کی بہترین تصویریں نمائش کے لیے آئی تھیں میں ایک تصویر کو سمجھنے کے لیے اپنی کور ذہنی کا رونا رو رہا تھا کہ ایک بزرگ اپنے بچوں سمیت تشریف لائے اُن میں ایک بچہ ۱۱/۱۰ سال کا تھا اور نیو آرٹ اینڈ کرافٹ سنٹر میں تربیت پا رہا تھا۔ وہ بزرگ میرے ساتھ ہی آ کر کھڑے ہوئے اور تصویر کی جانب غور سے دیکھنے لگے۔ تصویر یہ تھی!۔

تصویر ۳۔ تین موسیقار

"یہ کیا ہے؟" باپ نے بچے سے پوچھا۔ بچے نے کوئی جواب نہ دیا۔" میں نہ کہتا تھا کہ آرٹ کے لیئے کتنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ دیکھو آرٹ میں پریکٹس کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ڈھنگ سے لکیریں کھینچنا بھی نہیں آتا۔ بچے نے تصویر کی طرف غور سے دیکھا۔ میں نے بھی غور سے دیکھا ——— اور سوچا کہ شاید کسی مبتدی کی تصویر محض خانہ پُری کے لیئے رکھ دی گئی ہے۔ یا کسی بچے کی کاپی سے نکال لی گئی ہے یا کسی پاگل آدمی نے دیوار پر جو نقش بنائے ہیں اُس کا یہ عکس ہے۔ یا کسی ماسٹر آرٹسٹ کا رف سکیچ ہے (بعد میں معلوم ہوا کہ ماڈرن آرٹ کے ایک مدرسہ فکر کے مطابق حقیقت کو بچے، پاگل اور مبتدی کے ذہنی تصورات کی سطح پر لانا بھی ماڈرن آرٹ کا خاصہ ہے)

میں نے اس تصویر کا عنوان اور مصور کا نام جاننے کے لیئے فہرست کھولی۔ ہائیں ——— "تین موسیقار"۔ یہ ایک مشہور آرٹسٹ کی تصویر تھی۔ اب میں پریشان تھا کہ موسیقار کہاں اور ان کے ساز کہاں ہیں۔ اور بائیں طرف یہ نقاب پوش موسیقار ہے یا مشہور ڈاکو آرسین لوپن ——— جو آدمی نظر آتا ہے اس کی آنکھیں نہیں اور جس کی آنکھیں ہیں وہ بوسیدہ دیوار نظر آتی ہے۔

ماڈرن آرٹ اس وقت زوال پذیر ہے کیونکہ یہ اُس نقطۂ عروج تک پہنچ گیا ہے۔ جس کے آگے کوئی جدت اور فن کارانہ ارتقا ممکن نہیں۔ ماڈرن آرٹ میں میں نے اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ میری اولین تصویر ہی ماڈرن آرٹ میں نشانِ منزل بن گئی ہے۔ اور ماڈرن آرٹ میں میری اور دوسرے فن کاروں کے لیئے آخری تصویر ہے۔ اچھے فن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ کم سے کم لائنوں اور موقلم کی جنبش سے ایسے نقوش اُبھارے کہ ذہن میں مکمل عکس اُتر جائے۔ میرا آرٹ الٹرا ماڈرن Ultra modern ہے۔ اس میں کوئی لائن نہیں۔ موقلم کی ہلکی سی جنبش بھی نہیں۔ اس کی معنویت دیکھ کر ماڈرن آرٹسٹ بھی حیران و ششدر ہیں۔ تصویر ملاحظہ فرمایئے۔

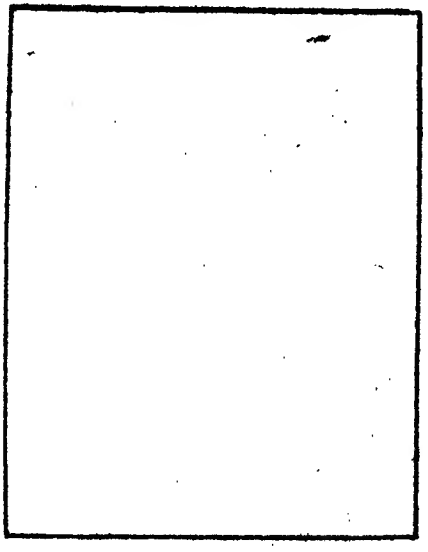

گائے گھاس چر رہی ہے۔

اس تصویر کو دیکھ کر ایک مبتدی آرٹسٹ نے مجھ سے سوال کیا۔ "صاحب یہاں گھاس تو نظر نہیں آتی"۔

"گھاس تو گائے چر گئی"۔

"لیکن گائے کہاں ہے؟"

"گھاس چرنے کے بعد چلی گئی۔ یہاں کیا کرتی؟"

میں نے جواب دیا۔

اب میں اور دوسرے ماڈرن آرٹسٹ فکرمند ہیں کہ وہ اگر سات بار بھی جنم لیں تو ایسی تصویر نہیں بنا سکتے۔ جس میں محض خیال ہے اور اس کا خارجی منظر عنقا ہے

باادب تبسم

چند لطیفے

خدا کے سپرد

دسمبر ۱۸۶۵ء میں نواب خلد آشیاں لفٹننٹ گورنر سے ملنے بریلی جا رہے تھے۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا غالب بھی موجود تھے چلتے وقت نواب صاحب نے سرسری طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد!"

غالب نے جواب دیا "حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر اُن کے سپرد کرنے لگے ہیں!

مدرسہ

سکول ماسٹر:۔ "دیوان غالب کس نے لکھا؟"

طالب علم:۔ "غالب نے۔"

سکول ماسٹر:۔ "دیوان حالی؟"

طالب علم:۔ "حالی نے۔"

سکول ماسٹر:۔ "بال جبریل؟"

طالب علم:۔ جبریل نے۔"

گہرے دوست

ایک مرتبہ جوش ملیح آبادی کے کمرے میں اُن کے کچھ احباب اور گہرے دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ گپ بازی ہو رہی تھی کہ اتنے میں اچانک ایک صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی کہنے لگے۔ "جوش صاحب! یہ حضرت جو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ آپ انھیں جانتے ہیں نا؟"

"ہاں!" جوش صاحب نے نہایت خود اعتمادی سے کہا۔

"یہ آپ کے گہرے دوست ہیں نا؟"

"ہاں ہاں!"

"تو بتائیے ان کا نام کیا ہے؟"

جوش صاحب نے فوراً ان حضرت کی طرف رجوع کیا اور بولے۔ "ارے ہاں بھائی! آپ کا نام کیا ہے؟"

ایک رائے

ایک ادیب سے کسی نے پوچھا: "ماڈرن ادب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

"اس دور کی سیاست سے ماڈرن ادب بہتر ہے۔"

"اور سیاست کے بارے میں؟"

"وہ ماڈرن ادب سے بہتر ہے!"

ٹیبل والے

• مجید لاہوری • ہوٹلیات

مجید لاہوری، موٹے مساموں کا مالک ہے۔ مگر نکتے نہایت باریک نکالتا ہے۔ اُس کا ڈیل ڈول بھی مُسکراہٹ کی دعوت دیتا ہے۔ اور اُس کی تحریریں بھی ——— یہی وجہ ہے کہ اس کی دونوں چیزیں مقبول ہیں۔ بھاری بھرکم جسم اور ہلکا پُھلکا مزاح ——— اللہ کی دین ہے بھائی! ———

ہوٹل میں جاتے ہی سب سے پہلے جو آواز آپ کا خیر مقدم کرتی ہے وہ اُس شخص کی ہوتی ہے جسے "ہوٹلی زبان" میں "ٹیبل والا" کہتے ہیں۔ ٹیبل والے اور کرکٹ کے کھلاڑی میں فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ یہ ——— ہوٹل کے باورچی خانہ سے ٹیبل تک ——— ٹیبن سے باورچی خانہ تک ——— آتا ہے جاتا ہے ——— اور وہ "باؤنڈری" لگا کر "دوڑیں" بناتا ہے یا گیند کو ہٹ لگا کر دوڑتا ہے۔ ایک ماہر کھلاڑی کا خیال ہے کہ ایک "ٹیبل والا" تھوڑے دنوں کی مشق کے بعد کرکٹ کا بہترین اتفاقی کھلاڑی بن سکتا ہے۔

ٹیبل والا صرف ہوٹل ہی میں نہیں دوڑتا بلکہ زندگی کے میدان میں بھی دوڑتا ہے۔ تاریخ میں آپ کو کوئی ایسی مثال شاید ہی پیش کر سکیں کہ کسی "ٹیبل والے" نے ایک جگہ جم کر کام کیا ہو۔ ایک "ٹیبل والا" آج "قدرت کا تماشہ" ہوٹل میں نظر آئے گا۔ کل "الم غلم" ہوٹل میں اور پرسوں آپ اُسے دس میل دور کسی "دوراندیش" ہوٹل میں پائیں گے۔ دو دن بعد اگر آپ اتفاق سے کسی جنازے کے ساتھ قبرستان جائیں گے تو وہی "ٹیبل والا" آپ کو قبرستان کے کسی ہوٹل میں ملے گا۔ ہاں تو "ٹیبل والا" ہوٹل میں بھی دوڑتا ہے اور زندگی کے میدان میں بھی۔

رمضانی کہتا ہے ——— کہ میں پچیس برس سے ہوٹلوں میں "ٹیبل والے" کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ آپ یہ درست فرماتے ہیں کہ مجھے جم کر کام کرنا چاہئے۔ لیکن صاحب ہم کیا کریں مجبوریں عجیب عجیب لوگوں سے پالا پڑتا ہے ——— یہاں کام کرنے والوں کو چھٹی نہیں ملتی ——— اگر چہ کاغذوں میں باقاعدگی سے ہماری چھٹی درج ہوتی ہے۔ اگر کوئی "ٹیبل والا" کسی مہمان کو سینما دکھانے کے لئے چھٹی کرے یا ایک آدھ دن سمندر کی سیر کے لئے چلا جائے اور دوسرے دن آئے تو ہوٹل والا اُسے اس طرح آزاد کر دیتا ہے جس طرح انگریزوں نے ہندوستان اور پاکستان کو آزاد کر دیا ہے۔ میں جب "اللہ کی قدرت کا تماشہ" ہوٹل میں کام کرتا تھا تو ایک دن ذرا پانچ منٹ دیر ہو گئی مجھے گھر سے آتے آتے ——— بات یہ تھی کہ ذرا افیون کے ٹھیکہ پر بھیڑ تھی۔ یہ کمبخت نشہ تو جی کا جنجال ہو گیا ہے یہ کافر ایسی منہ لگی ہے کہ بس چھٹتی ہی نہیں۔ ہاں تو پانچ منٹ جو دیر سے آیا تو ہوٹل والے نے کہا جاؤ بیٹا سیر کرو۔ تم حرام کی روٹیاں کھا کھا کر مست ہو گئے ہو۔ اب تم سے کام نہیں ہو گا۔ اُس کے بعد میں "ڈن گیر ہوٹل" میں آ گیا۔ یہاں اتفاق سے دو تین پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ بات یہ ہوئی کہ باہر دو چار "ریشمیں غرارے" نظر آ گئے۔ میں نے اُدھر جو دیکھا تو سامنے کی میز سے ٹکرایا۔ پلیٹیں گریں اور ٹوٹ گئیں۔ صاحب یہ تو پلیٹیں تھیں، آدمی

مر جاتا ہے ۔ اب اگر آدمی مر جائے۔ کیا ہم ملک الموت پر جرمانہ کر دیں گے کہ تو نے کیوں بھلا چنگا آدمی مار دیا۔ لیکن صاحب "دلگیر ہوٹل" کا مالک دل کا بڑا سخت آدمی تھا اُس نے جرمانہ کر دیا یعنی میری دو دن کی تنخواہ چلی گئی۔ تنخواہ بھی چلی گئی اور "ریشمی غرارے" بھی چلے گئے اور ——— دیکھتا ہی دیکھتا رہ گیا۔

——— اور کیا کیا بتاؤں صاحب ۔ بڑی مصیبت ہے تنخواہیں بہت کم ملتی ہیں۔ اگر کسی وقت ہم کھانا ذرا زیادہ کھالیں تو آفت ——— اور بعض ہوٹلوں کے مالک تو نوکروں کے لئے دال پکاتے ہیں۔ کتنا ظلم ہے بابو جی ——— جس طرح ڈاکخانہ کے "پوسٹ مین" منی آرڈر کا روپیہ اپنے ہاتھ سے دیدیتے ہیں لیکن کیا مجال کہ ان روپیوں میں سے کبھی دو پیسے کی "مونگ پھلی" ہی کھالیں ۔ ہم مرغ۔ بریانی کوفتہ گاہک لوگوں کو خود لا کر دیں اور جس وقت .... کوئی آئے تو ہم کھانوں کی فہرست ——— مرغ ۔ مغز۔ کباب ۔ چانپ ۔ بریانی ۔ آلو گوشت ۔ ٹماٹر گوشت ۔ کوفتہ ۔ اسٹو ۔ کیک پلیٹ ——— وغیرہ اُسے سنائیں۔ وہ آرڈر دے تو ہم سب چیزیں میز پر لاکر رکھیں لیکن ہمیں کھانے کے لئے دال ملے ۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں ۔ کیا ہوا جو "ٹیبل والے" بن گئے ——— یہ جو کرسیوں پر بیٹھے ہیں ہم ان سے کم نہیں ہیں ۔ بدقسمتی یہی ہے کہ ہم "ٹیبل والے" ہیں ——— رمضانی نے بڑی سنگتائی اور ایک لمبا کش لگانے کے بعد کہا ——— بابو جی کبھی کبھی تو ہم سوچتے ہیں کہ چوری کر کے جیل چلے جائیں ۔ وہاں کھانے کا اس سے بہتر سرکاری انتظام ہے ۔ کم از کم یہ بات تو ہے کہ سب کو وہاں ایک سا کھانا ملتا ہے ۔ اگرچہ وہاں بھی بڑے لوگوں کو سُنا ہے خاص کلاس میں وہی کچھ ملتا ہے جو یہاں ہوٹل میں ملتا ہے اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ ایسا کھانا تو ہم غریبوں کو جنت میں ملے گا۔ لیکن اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے جو ایک سا کھاتے ہیں۔ ایک سا پہنتے ہیں۔ ایک جگہ رہتے ہیں۔ یہاں ہوٹل میں زندگی وبال جان ہو گئی ہے ۔ اگر کبھی چوری چوری اندر "چائے بنانے والے" کو "چرس کا سگریٹ" پلا کر بالائی لائیں، چھپ کر کھائیں۔ اور ہوٹل کا مالک دیکھ لے تو سمجھ لیجئے کہ اُسی دن ہمارا بوریہ بستر گول ہو جاتا ہے ۔

جب تک ہم میں سکت ہے کام کرتے ہیں اور جب بیمار ہو جائیں تو ہوٹل کا مالک اس ڈر سے کہ کہیں اس کا علاج نہ کرانا پڑ جائے ۔ یا یہ مر گیا تو مفت میں بدنامی ہوگی ——— کہتا ہے کہ لے جاؤ اس کو ہسپتال میں ——— فوراً لے جاؤ ——— اگر ہوٹل کے مالک کو قانونی طور پر اس بات کی اجازت ہوتی کہ ناکارہ گھوڑے کی طرح وہ بوڑھے "ٹیبل والے" کو "شوٹ" کر دیتا تو ہر ہوٹل سے ان عاشقوں کے جنازے بڑی دھوم سے نکلتے ۔

ہاں تو بابو جی ہم چھ بجے صبح سے رات کے گیارہ بجے تک کام کرتے ہیں ۔ تنخواہ کم ۔ چھٹی بالکل نہیں ۔ کھانے کی تکلیف ۔ نہ جینا نہ مرنا ——— کبھی کبھی انسپکٹر آتا ہے ہماری حاضری کا رجسٹر دیکھنے لیکن وہ ہم سے نہیں بلکہ ہوٹل کے مالک سے ملتا ہے چائے پیتا ہے اور رجسٹر پر کچھ لکھ کر چلا جاتا ہے ... ——— اِسے چھوڑئیے ۔ یہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے "ٹیبل والے" یعنی "بیرے" جو ساٹھ برس کی عمر کو پہنچ کر بھی "بوائے" کہلاتے ہیں ۔ چونکہ بڑے آدمیوں کو کھانا کھلاتے ہیں ۔ شراب پلاتے ہیں ۔ اس لئے وہ ہم ایسے عام ہوٹلوں کے "ٹیبل والوں" سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے ۔ ہمیں یوں دیکھتے ہیں جیسے "ڈیم کالا آدمی" کو "صاحب لوگ" دیکھتے ہیں ۔ اور جب کبھی وہ سبزی مارکیٹ کے کسی ہوٹل میں آجاتے ہیں تو "صاحب" کی طرح کرسی پر بیٹھ کر کہتے ہیں "بوائے" ——— "ٹیبل صاف کرنا مانگتا ہے" ——— "دیکھو چائے مانگتا ہے دو آدمی کے واسطے" ۔ گویا وہ بھی "صاحب لوگ" ہیں ———

یہ تو تھیں رمضانی کی باتیں ۔ لیکن ہم نے ایک مالک ہوٹل سے بھی اس سلسلے میں بات کی کہ یہ "ٹیبل والے" کیوں ایک جگہ جم کر کام نہیں کرتے ۔ تو اُس نے کہا کہ یہ ہوٹل اصل میں کبوتر خانہ ہے اور یہ "ٹیبل والے" کبوتر ہیں ۔ ایک کبوتر آتا ہے ۔ بیٹھتا ہے اور اُڑ جاتا ہے ۔ میں برسوں سے یہی دیکھ رہا ہوں ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں کھانا مفت ملتا ہے اور انعام ملتا ہے ۔ تنخواہ پوری کی پوری بچ جاتی ہے ۔ یہ کچھ دن تو جی لگا کر کام کرتے ہیں اور پھر "حرام خور" ہو جاتے ہیں ۔ چرس ۔ گانجہ ۔ چانڈو ۔ سٹہ ۔ ریس اور اس کے بعد بڑی بڑی "بازیاں" شروع کرتے ہیں ۔ پیسے ان کے پاس بالکل فالتو ہوتے ہیں ۔ کیونکہ کھانا تو کھانے کو مل ہی جاتا ہے ۔ اسی لئے تو یہ پھوٹی کوڑی بھی کفن کیلئے اپنے پاس نہیں رکھتے ۔ بعض "ٹیبل والے" جوئے میں بار بار ہارنے کے بعد آمدنی بڑھانے کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہیں ۔ گاہکوں سے مل جاتے ہیں ۔ گاہک نے ڈیڑھ روپیہ کھایا ۔ اٹھنی انہوں نے لے لی اور آواز دی ۔ "چار آنہ" ——— !

گاہک کو بارہ آنے بچے ۔ ٹیبل والے کو آٹھ آنے ——— نقصان کس کا ہوا مالک کا ۔ بعض تو ہوٹل کے برتن چپکے سے اونے پونے داموں بیچ دیتے ہیں ۔ ہر مہینے گلاس گم ——— پلیٹیں گم ۔ اگر ان کے بس میں ہو تو یہ سارا ہوٹل بیچ کر کھا جائیں ۔ صاحب یہ مظلوم نہیں ظالم ہیں ۔ ایسے ظالم ہیں کہ ہمیں بھی تو ننا مرچ لگا کر کچا کھا جائیں ——— یہ تو جنگلی کبوتر ہیں جو ہم نے پال رکھے ہیں ——— ہوٹل کے مالک نے پھر اپنا فقرہ دوہرایا ۔ اور کہا کہ مجھے چالیس

برس ہو گئے اس کراچی میں ہوٹل چلاتے ۔ اس دوران میں سینکڑوں "ٹیبل والے" آئے اور اُڑ گئے ۔ شاید ہی دو ایک آدمی ایسے ہوں جو ہمارے ہاں پڑے ہوں ۔ ورنہ ہر آنے والا جانے کے لئے آتا ہے ۔

یہ تو ہم نہیں کہتے کہ "ٹیبل والے" "جنگلی کبوتر" ہیں ۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ لوگ "پڑھے لکھے" نہیں ہوتے ۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ہر گاہک کا حساب سینے کے بہی کھاتے کی طرح محفوظ رکھتے ہیں ۔ اگرچہ یہ "بقلم مجید لاہوری" کی طرح اُن کا قلمی چہرہ نہیں لکھ سکتے ۔

بہر حال جب گاہک "کونٹر" کی طرف بڑھتا ہے تو یہ پکارتے ہیں ۔ "مونچھوں والا ——— تین آنہ !" ——— "لمبی ٹوپی ——— ساڑھے بارہ آنہ !" ——— "ڈاڑھی والا چھ پیسہ !" ——————— یہ کبھی کبھی شاید حساب بھول جاتے ہوں ۔ لیکن ہمارا تجربہ ہے کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے ۔ بڑے ہوٹلوں میں تو "بل کا سسٹم" ہے وہاں بیروں کو بخشش ملتی ہے لیکن عام ہوٹلوں جہاں چار آنہ کی روٹی اور چار آنہ کا سالن کھانے والے ننانوے فیصدی لوگ آتے ہیں ۔ ان کو "بخشش" تو نہیں البتہ گالیاں ضرور ملتی ہیں ——— "ابے یہ روٹی ٹھنڈی کیوں لایا ہے ؟" جس وقت کوئی گاہک شراب پی کر آجائے تو "ٹیبل والے" بہت خوش ہوتے ہیں ۔ کیونکہ انھیں بخشش کی امید ہوتی ہے ——— یہ برسوں کام کرتے ہیں ——— اور مر جاتے ہیں ۔ لیکن ان کے پاس کفن کے لئے کوڑی نہیں ہوتی ——— اِس لئے مرنے کے بعد کفن کے لئے بھی انھیں بخشش دینی پڑتی ہے ۔

ایک ضیافت

ایک مرزا صاحب جو دوستوں کے پاس دعوتیں خوب اُڑاتے تھے ۔ مگر اپنے پاس کسی کو دعوت نہیں دیتے تھے ان کے دوست احباب ان سے دعوت کے لئے بے حد اصرار کیا کرتے تھے ۔ مگر وہ خدا کا بندہ کبھی ٹس سے مَس نہیں ہوا آخر کار سب دوستوں نے مل کر یہ تجویز کی کہ سب مل کر مرزا صاحب کو مجبور کر دیں تو یقین ہے کہ مرزا صاحب مان لیں گے ۔ اسی پلان پر عمل کیا گیا اور مرزا صاحب نے آخر دوستوں کی دعوت کرنی منظور کر لی اور دوسرے دن ایک پُر تکلف ضیافت کے دعوت نامے تمام احباب کو بھجوا دیئے ۔ چونکہ مرزا صاحب کے گھر دعوت تھی اور وہ بھی عمر بھر میں پہلی مرتبہ ایسا اتفاق پیش آ رہا تھا ۔ اِس سب دوست بہترین سوٹ زیب تن کئے وقت مقررہ پر پہنچے ۔ مرزا صاحب نے طعام کا انتظام فرش پر کرایا تھا اس لئے تمام مہمان جوتے برآمدہ میں چھوڑ کر اندر ڈائیننگ ہال تشریف لے گئے ۔ ڈائیننگ ہال میں مذاق اور خوش گپیاں جاری تھیں ۔

اِدھر مرزا صاحب نے تمام بوٹ ۔ سینڈل ۔ چپل وغیرہ ایک تھیلے میں بھروا کر بازار میں فروخت کرا دیئے اور اُنھیں اموال سے ایک شاندار ، مقامی ہوٹل سے پُر تکلف سامانِ ضیافت منگوایا گیا ۔ دوست احباب ایک چیز اُٹھاتے اور مرزا صاحب کے ذوق کی داد دیتے تھے لیکن مرزا صاحب نہایت انکساری سے جواب دیتے تھے :-

"اجی صاحب میں کیا اور میری بساط کیا ۔ یہ سب آپ کی جوتیوں کا صدقہ ہے ؟"

تمام احباب جب اس پُر تکلف دعوت سے فارغ ہو گئے تو ڈائیننگ ہال سے باہر نکلے ۔ برآمدہ میں آکر دیکھا کہ سب کے جوتے ندارد"

معلوماتی قاعدہ

محمد خالد اختر

قدرے بڑے بچوں کے لئے

مصنف نے یہ قاعدہ لکھکر ٹیکسٹ بک کمیٹی کو بھیج دیا۔ تاکہ وہ اسے سکولوں کے لئے منظور کرلے۔ مگر کمیٹی کے صدر نے قاعدے کا مسودہ انسپکٹر جنرل پولیس کو بھجوا دیا۔

ہائیڈروجن بم

یہ سائینس کے حیرتناک کرشموں کا زمانہ ہے۔ کوئی دن ہی جاتا ہے کہ ہمارے سائنس دان ہمیں کسی نئی ایجاد سے ششدر نہیں کرتے۔ ان ایجادوں نے ہماری زندگی۔ اور ہماری موت تک کو بھی زحد آسان اور خوشگوار بنا دیا ہے۔ ان کار آمد ایجادوں میں سب سے اچھی اور سب سے مفید جو ایجاد ہے وہ ہائیڈروجن بم ہے۔

کہنے کو یہ محض ایک بم ہے لیکن دراصل یہ ہے بڑے کام کی چیز۔ ہم تو پہلے بھی سُنتے تھے۔ نیپھتا بم۔ ٹڈ ڈال بم مگر ہائیڈروجن بم کی ایجاد کے بعد وہ کھلونے بن کر رہ گئے ہیں۔

بچو! یہ سب تسلیم کر چکے کہ اس کرے پر انسان کے لئے زندگی وبال ہو چکی ہے۔ اناج کی قلت۔ کپڑے کی مہنگائی اور سیاسی لیڈروں نے ہمارا یہاں رہنا دوبھر کر دیا ہے۔ زندگی کے کام بے سود اور باسی ہو چکے ہیں اور ان کا جادو ٹوٹ چکا ہے۔ ویسے دُنیا ہو بھی تو بہت پرانی ہو چکی ہے۔ دس ارب سال یا دس کھرب سال۔ ابھی تک سائینس دان دُنیا کی عمر کے متعلق آخری فیصلہ نہیں کر سکے۔

اور اس وقت ہمیں جس ایجاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہائیڈروجن بم ہی ہے، اور ضرورت ایجاد کی ماں ہے، (یہ محاورہ ہر بم کی ایجاد کے وقت کام آئے گا اس لئے اسے یاد کر لو!) —— یہ تو تم جانتے ہو کہ دُنیا کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یہ بے حد خطرناک بات ہے۔ ہائیڈروجن کی مدد سے دُنیا کے سیاسی لیڈر اس آبادی کو وقتاً فوقتاً گھٹانے اور مناسب حدود میں رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں اب دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی خطرہ میں نہیں رہے گی۔ پُرانے زمانہ میں اللہ میاں اس مقصد کے لئے دنیا پر قحط۔ طاعون اور زلزلے نازل کیا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے وقت مصر میں آٹھ طاعونیں یکے بعد دیگرے بھیجی گئی تھیں۔ شہر کے شہر خالی ہو گئے تھے۔ ان طاعونوں کے باوجود بھی مصر میں چند انسان باقی رہ گئے تھے ہائیڈروجن بم مصر کی آٹھ طاعونوں سے زیادہ کارگر ہے۔ اس کے موجدوں کا دعویٰ ہے کہ یہ بم جس شہر پر گرے گا وہاں انسان تو انسان طاعون تک کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ طاعون اور تاتاریوں کو شہر خالی کرنے اور آبادی گھٹانے کے کام میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ کام پھر بھی خاطر خواہ نہ ہوتا تھا اور ادھورا رہ جاتا تھا۔ آج کل رفتار کا زمانہ ہے ہم سالوں کا فاصلہ گھڑیوں میں طے کر رہے ہیں۔ آجکل ہم انتظار نہیں کر سکتے ہماری خواہش ہے کہ اگر ناشتہ اس جہان میں کریں تو لنچ اگلے جہان میں جا کھائیں۔ ہائیڈروجن بم پل بھر میں بڑے سے بڑے شہر کو نیست و نابود کر دے گا۔ مجال ہے کوئی شخص جیتا رہ جائے سوائے (غالباً) سیاسی لیڈروں کے جو پہلے ہی اس شہر کو خالی کر کے کہیں اور مزے سے لنچ کھا رہے ہوں گے۔

چچا سام کے پاس ہائیڈروجن بموں کا بہت ذخیرہ ہے۔ چچا سام اس پر فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ روس کے پاس بھی ہائیڈروجن بم کے

ڈھیر ہیں۔ لیکن چچا سام کا گمان ہے کہ ان میں محض ہائیڈروجن بھری ہو گی۔

چچا اکثر کہتے سنے گئے ہیں کہ ہمارے ہائیڈروجن بم روسی ہائیڈروجن بموں سے کہیں بڑھیا اور قیمتی ہیں اب ایک اور بم کوبالٹ بم سننے میں آرہا ہے اسے ارجنٹائن کے پریذیڈنٹ سینر پیروں خاص اپنی سرکردگی میں تیار کروا رہے ہیں۔ یہ اب تک تیار ہو چکتا مگر وہ پروفیسر جن کے ذمے یہ کام تھا جعلی ثابت ہوا۔ وہ دراصل ایک کیمیاگر تھا اور سینر پیروں کو اُلّو بنا رہا تھا کہ کوبالٹ بم ہائیڈروجن بم سے دس گنا زیادہ کارگر ہوگا۔ اس کے بعد نائیٹروجن کی ایجاد کی باری ہوگی۔ جو کہ کوبالٹ بم سے سو گنا زیادہ طاقتور ہوگا۔ بچو! اسی لئے اب ہمارا مستقبل بڑا شاندار ہے۔ ہماری نجات اب یقینی ہے۔

نیا سال ۔ آہا! لو نیا سال آگیا۔ یہ سال نئی خوشیاں اور نئی اُمنگیں اپنے دامن میں لے کر آیا ہے۔ ہر نیا سال مبارک اور سعید ہوتا ہے اور ہر گذرا ہوا سال منحوس اور بُرا۔ ہر گذرے ہوئے سال میں اتنے قتل۔ زلزلے اور قحط ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں سوچا تک نہیں جا سکتا۔ تازہ ترین نئے سال کے آغاز کے شگون بڑے مُبارک ثابت ہوئے ہیں سال کے پہلے ہی ہفتے میں یہ خبر آگئی کہ چند بغاوت پسند بندوقچیوں نے پانامہ کے صدر جوشے ریموں کو گولی کا نشانہ بنا دیا جس وقت یہ واقعہ ہوا مرحوم چند معزز خواتین کے ہمراہ گھڑدوڑ کا لطف اٹھا رہے تھے پریذیڈنٹ چنے جانے سے پہلے آپ پانامہ کی پولیس کے ہر دلعزیز چیف تھے اور پولیس ہی کے بوتے پہ پریذیڈنٹ بنے تھے۔ بندوقچیوں نے دھائیں دھائیں چھ سات فائر کئے اور کرنل صاحب کے علاوہ دو تین خواتین کو بھی ڈھیر کرنے کے بعد موٹر میں فرار ہو گئے۔ چچا سام کی رائے ہے کہ یہ سب کمیونسٹوں کی کارروائی ہے اس لئے ہماری بھی یہی رائے ہے۔ ہم ان کے اطاعت گذار بھتیجے جو ہوئے!

ہر نئے سال کے پہلے روز لوگ نئے عہد اور نئے ارادے باندھتے ہیں یہ ارادے اور عہد توڑنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ بچو! تم نے بھی اپنے آپ سے ایسے ہی وعدے ضرور کئے ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ تم آیندہ اپنا سکول کا کام اپنے بڑے بھائی سے کروانے کی بجائے خود کیا کرو گے کہ تم بڑے اچھے لڑکے بن جاؤ گے کہ تم ہمیشہ سچ بولا کرو گے خواہ تمہارا باپ مار مار کر تمہاری تخم اڑا دے وغیرہ وغیرہ۔ بچو! گھبراؤ نہیں اگر تم نے ان وعدوں میں سے ابھی تک ایک بھی پورا نہیں کیا یہ وعدے کئے ہیں اسی لئے جاتے ہیں تاکہ انھیں توڑا جائے۔

آؤ آج تمھیں ایک ایسے آدمی کی کہانی سنائیں جو طبعی طور پر بے حد کاہل ہے۔ ہر نئے سال کے شروع میں یہ آدمی صدق دل سے عہد کرتا ہے کہ وہ اب اپنی زندگی کا ایک نیا ورق اُلٹے گا۔ وہ علی الصبح اُٹھا کرے گا اور چھڑی ہاتھ میں لے کر ٹہلتا ٹہلتا باغ کو جایا کرے گا۔ وہ نسیم سحری سے اپنے کمزور پھیپھڑوں کو پوری طرح بھرے گا اور ایک ۔ ایک پھول کے قریب ناک لے جا کر سونگھے گا۔ وہ خوش الحان پرندوں کی بولیاں سنے گا اور خود بھی ایک پرندے کی طرح سیٹیاں بجائے گا۔ وہ ایسا سعادتمند اور فرمانبردار لڑکا بن جائے گا کہ دوسرے لڑکوں کے والدین اپنے بیٹوں کے روبرو بطور مثال پیش کیا کریں گے وہ سگرٹ بالکل نہیں پئے گا اور اس کے دوستوں کی اُسے سگرٹ پلانے کی کوششیں اس پر ذرا بھی اثر نہ کریں گی۔ وہ سال میں کم از کم ایک ناول۔ دس علمی مقالے اور پندرہ مختصر افسانے مکمل کرے گا (یہ آدمی اپنے آپ کو مصنف بھی سمجھتا ہے)!

اب بچو! تم سچ مانو اس کاہل آدمی نے اپنا ایک عہد بھی تو پورا نہیں کیا اس سال کی کوئی صبح نہیں دیکھی وہ باغ میں ٹہلنے کے لئے بھی نہیں گیا۔ کیونکہ وہ چھڑی نہیں خرید سکا۔ اس کے والدین اس سے سخت نالاں ہیں اور اس کے روبرو دوسرے والدین کے بیٹوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں لکھنے کا یہ حال ہے کہ دنوں کے پہلے دو ہفتے کے علاوہ اس نے ایک سطر بھی نہیں لکھی حالانکہ ایڈیٹر اس کے دوست ہیں وہ اس کی ہر چیز چھاپ دیتے ہیں یہ سست اور کاہل آدمی ہر روز ایک نہر کے کنارے دھوپ میں لیٹ کر لاتعداد سگرٹ پیتا ہے اور زندگی کے بیش قیمت لمحوں کو رائگاں جانے دیتا ہے۔ اس آدمی سے سبق لو۔

دہبر آدمی نئے سال کا استقبال بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتے ہیں۔ ان کی تصویریں ہمارے فیشن کے رسالوں میں چھپتی ہیں۔

ڈنر سوٹ پہن کر یہ بڑے آدمی کسی شاندار ہوٹل میں جمع ہوتے ہیں اور وہاں دوسرے امیر آدمیوں کی خوبصورت بیویوں کے ساتھ ڈانس کرتے ہیں بارہ بجے جب نئے سال کے پہلے دن کا ورود ہوتا ہے تو یہ دمکتی ہوئی سکاچ کے جام سے ہیپی نیو ایر بکتے ہیں نئے سال کی آمد کو منانے کا اصل طریقہ یہی ہے وہ ہزاروں لوگ جو سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے فٹ پاتھوں کے پتھریلے بستر پر نئے سال کا استقبال کرتے ہیں وہ نئے سال کی توہین کرتے ہیں۔ اسی لیے نیا سال ان سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کے لئے در اصل نیا سال طلوع ہی نہیں ہوتا۔

بچو! ان کے لئے شاید یہ سال بھی طلوع نہیں ہوگا۔ تم کبھی غریب نہ بننا!

ڈاکٹر

بچو! جب ہم بیمار پڑتے ہیں تو فوراً ڈاکٹر کے ہاں بھاگے جاتے ہیں یا ڈاکٹر کو اپنے ہاں بُلوا لیتے ہیں۔ ڈاکٹر کو اپنے ہاں بلوانا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکٹر کو اور بھی تو کئی کام ہوتے ہیں اس کو بلانے کے لئے سواری بھی بھیجنا ضروری ہے ورنہ ڈاکٹر نہیں آئے گا۔

ایلو! ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔ وہ پہلے ہماری نبض ٹٹولتے ہیں پھر ہماری زبان نکلوا کر دیکھتے ہیں۔ پھر اپنے سانس دیکھنے کے آلے سے ہمارے سینے کا معاینہ کرتے ہیں ہونہہ، کہہ کر وہ ایک ٹھنڈا سانس لیتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو اس وقت بلایا ہے جب کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے کھڑے نسخہ لکھ دیتے ہیں کچھ ہدایات دیتے ہیں مثلاً مریض کو حقیقہ مدردں کے علاوہ کھلانے کے لئے اور کچھ نہ دیا جائے جب انھیں فیس دی جاتی ہے تو وہ قدرے حیرانی ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ انھیں اس تکلف کی توقع نہ تھی لیکن وہ فیس چھوڑتے کسی صورت میں بھی نہیں۔

بچو! ہر ایک شخص ڈاکٹری کے کالج سے سند حاصل کرکے اپنا مطب کھول سکتا ہے اس سند سے اسے لوگوں کا علاج کرنے کا پروانہ مل جاتا ہے۔ کوئی شخص ڈاکٹر کے علاج سے مر بھی جائے تو ڈاکٹر کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یورپ میں کئی ایک ایسے ڈاکٹروں کی مثالیں ہیں جنھوں نے کئی اچھے بھلے آدمیوں کو چپکے سے قتل کر دیا ہے لیکن ان کی بابت کوئی بھی نہیں جانتا۔

ایک بار کسی ڈاکٹر کے ہتھے چڑھ جاؤ تو پھر تمہاری آسانی سے خلاصی نہ ہوگی ایسی صورت میں بچاؤ کا واحد طریقہ یہی ہے کہ آدمی اس شہر سے چلا جائے جس میں وہ ڈاکٹر رہتا ہے۔ تمھیں کوئی معمولی شکایت ہے تم ایک ڈاکٹر کے پاس جاتے ہو وہ تمہارے جسم اور دماغ میں کئی اور عارضے دریافت کرے گا اور تمھیں یقین دلا دے گا کہ تمہارا اس وقت تک زندہ رہ جانا ایک معجزہ ہے وہ ایک علاج تجویز کرے گا جو کافی لمبا چوڑا ہوگا ڈاکٹر عموماً بھائی چارے سے مل جل کر کام کرتے ہیں مثال کے طور پر تم ڈاکٹر گاما کے پاس زکام کے علاج کے لئے جا نکلتے ہو یہ تمہاری بدقسمتی ہے ڈاکٹر گاما تمھیں لٹا کر سٹیتھوسکوپ سے تمہارے سینے کا معاینہ کرتا ہے اور اپنے سر کو تشویش سے ہلاتے ہوئے اپنی رائے دیتا ہے کہ تمہارے پھیپھڑے بالکل گل چکے ہیں اور ان کا فوراً ایکس رے ہونا چاہیئے۔ اپنی فیس وصول کرنے کے بعد وہ تمھیں ایکس رے کے لئے اپنے دوست ڈاکٹر لیڈا کے پاس بھیجتا ہے ریڈیا لجسٹ کے ڈاکٹر لیڈا کے ایکس رے ہمیشہ صاف اور سپاٹ ہوتے تھے۔ اس کی ایکس رے مشین خراب ہے اور اس کی چوکھٹا داڑھی ہمیشہ کسی نہ کسی طریقہ سے مریض اور ایکس رے کا پلیٹ میں حائل ہو کر فوٹو کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر لیڈا تمہارے پھیپھڑوں کا ایکس رے لیتا ہے جو در اصل اس کی داڑھی کا ایکس رے ہے۔ اچھی موٹی فیس لینے کے بعد ڈاکٹر لیڈا ایکس رے کی عکسی تصویر تمہارے حوالے کرتا ہے اور تمھیں ڈاکٹر تھیٹا کے گھر کا پتہ بتاتا ہے جو ایکس رے فوٹوؤں کو پڑھنے کا ماہر ہے ڈاکٹر تھیٹا تمھیں یہ بتا سکتا ہے کہ آیا تمہارے دونوں پھیپھڑے بے کار ہیں یا صرف ایک۔ تھیٹا ایکس رے کو بغور دیکھنے کے بعد تمھیں منہ کھولنے کا حکم دیتا ہے اور اپنا سر ہلاتا ہے، اپنے دانت فوراً نکلواؤ، وہ کہتا ہے تم احتجاج کرتے ہو کہ ایکس رے پھیپھڑوں کا ہے دانتوں کا نہیں۔ مگر تھیٹا پر خاک اثر نہیں ہوتا۔ اپنی فیس لیکر وہ تمھیں ڈاکٹر گھسیٹا کی طرف بھیجتا ہے۔ گھسیٹا دندان ساز ہے وہ تمھیں فوراً کرسی پر بٹھا کر تمہارے دانت نکالنے شروع کر دیتا ہے گھسیٹا دس روپے فی دانت کے حساب سے دو سو روپیہ فیس وصول کرتا ہے تم قسم کھاتے ہو کہ تم پھر کبھی کسی ڈاکٹر کا منہ نہ دیکھو گے۔

ڈاکٹروں کی ایک مرض کی تشخیص ہمیشہ مختلف ہوتی ہے ایک ڈاکٹر کے نزدیک اگر تمہارا مرض ہسٹیریا ہے تو دوسرا اُسے

ہائیڈروفوبیا بتائے گا۔ نئی دواؤں کی ایجاد کے بعد ڈاکٹروں کے نسخوں میں کوئی فرق نہ ہوگا پینسلین کے انجکشن ہسٹیریا کے لیے بھی اتنے ہی مفید ہیں جتنے ہائیڈروفوبیا کے لیے پنسلین کی ایجاد کے بعد مرض کی تشخیص ایسی اہم نہیں رہی۔ ہر ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر ——— کا بیری ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرے ڈاکٹر کو میڈیسن کی الف بے بھی نہیں آتی۔

بچو! تمھیں یقین آئے یا نہ آئے۔ ہے یہ سچی بات کہ ڈاکٹر خود بھی بیمار پڑ جاتے ہیں۔ اور تو اور میں نے دو تین ڈاکٹروں کو مرتے بھی دیکھا ہے۔ بیماری میں ڈاکٹروں جیسا بزدل کوئی ہوتا ہوگا۔ وہ ہاتھ پاؤں چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنا علاج خود کبھی نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ دوسرے ڈاکٹروں سے کراتے ہیں۔ ایلوپیتھ ہومیوپیتھ سے رجوع کرتے ہیں اور ہومیوپیتھ ایلوپیتھ سے۔ میرے ایک ڈاکٹر دوست کا قصہ سنو۔ ایک روز اُسے معمولی سلیریا ہوا۔ اس کی حالت نہ پوچھو۔ اُسے یقین تھا کہ وہ دو گھڑی کا مہمان ہے۔ وہ مجھ سے بڑے درد بھرے لہجے میں بار بار کہتا "اب کیا بنے گا"، وہ اپنے بیوی بچوں کو وصیت کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے سمجھا بجھا کر تھوڑی دیر اور انتظار کرنے پر راضی کیا۔ اس حالت میں اُس نے کئی بار اللہ اور خدا کو یاد کیا۔ ویسے تو خدا کو یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن یہ ڈاکٹر دہریہ ہونے کا دعویدار ہے۔

بچو! بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں جو مریض کا معاینہ کرتے وقت اس سے باقاعدہ سانس لینے کی ورزشیں کراتے ہیں۔ مثلاً وہ ڈبل نمونیا کے مریض کو کہیں گے سانس روک لو، اب لمبا سانس لو۔ اور لمبا، اپنا دایاں بازو اوپر اُٹھاؤ، اب بایاں اُٹھاؤ، اُٹھ کر بیٹھو اور بیٹھے بیٹھے اپنے پاؤں کو چھوؤ" وہ مریض کی قوت برداشت آزمانے کے لئے اس کے پیٹ میں زور کا گھونسا رسید کر کے اس سے پوچھیں گے "یہاں درد تو نہیں ہوتا" ایسے ڈاکٹروں کو بار بار بلانا اچھا نہیں۔ میں ایک ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو مریض سے ورزش نہیں کراتا وہ صرف اُسے ننانوے تک گنتی کرانے سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

اب ڈاکٹروں کی ایک قسم اور بھی ہے ان کا دوا دارو سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ مختلف علوم کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علم الہندسہ کے ڈاکٹر، علم و ادب کے ڈاکٹر، فلسفہ کے ڈاکٹر، سیاسیات کے ڈاکٹر، یہ لوگ ایک دو سال کسی یونیورسٹی میں بسر کر کے چار پانچ سو صفحے کا تھیس لکھتے ہیں جس کو سوا ایک دو بوڑھے پروفیسروں کے کوئی نہیں پڑھتا۔ ان پروفیسروں کی سفارش پر انھیں ڈاکٹری کی سند مل جاتی ہے۔ میرا ایک دوست علم و ادب کا ڈاکٹر ہے اس نے "چندر گپت مراریہ کے زمانہ میں شاعری کے ترقی پسند رجحانات" پر ہزار صفحے کا تھیس لکھا تھا اس کے پروفیسر نے اس تھیس سے اپنی انگیٹھی کو جلانے کا کام لیا اور میرے دوست کے لئے ڈاکٹری کی سند کی سفارش کر دی۔ یہ تھیس عربی زبان میں تھا۔ یہ ڈاکٹر بڑے بور ہوتے ہیں ان کے نظر آتے ہی اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک معزز خوش پوش نوجوان کو ایک دیوار پھاندتے دیکھا وہ ایک ڈاکٹر سے بچ کر بھاگ رہا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر ڈاکٹر بن جانے کے بعد بھی تھیس سوچتے اور لکھتے رہتے ہیں۔

ہاں بچو! اب تم سوال کرو گے کہ یہ جو سلطان آف زنجبار ڈاکٹر بنے بیٹھے ہیں تو کیا انھوں نے بھی زنجبار کی مچھلیوں اور ان کی گوتوں پر کوئی محققانہ مقالہ قلمبند کر کے کسی یونیورسٹی میں پیش کیا ہوگا۔ نہیں یہ سلطان آف زنجبار دوسرے کئی ملکوں کے سیاسی لیڈروں کی طرح اعزازی ڈاکٹر ہیں۔ پچھلے سے پچھلے سال یہ کانوں کے آپریشن کے لئے (آپ سُنتے ہیں) چچا سام کے ملک میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں کو ایسا موقعہ خدا دے انھوں نے سلطان پر ڈاکٹری کی ڈگریاں نچھاور کرنے میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اب آپ خدا کے فضل سے کم از کم آدھ درجن علوم کے ڈاکٹر ہیں۔ کیلی فورنیا یونیورسٹی کے آپ علم و ادب کے ڈاکٹر ہیں۔ مچیگان یونیورسٹی کے سماجی قوانین کے ڈاکٹر۔ اوٹاوا کے کیمسٹری کے ڈاکٹر ٹیکساس سے جنسیات کے ڈاکٹر۔

بچو! قوم کے لئے ہر قسم کے ڈاکٹر ضروری ہیں یہ نہ ہوں تو دوسرے ملک ہمیں اجڈ اور غیر مہذب سمجھنے لگیں۔

بلے بلیوں کے بارے میں

آؤ بچو! تمھیں بلے بلیوں کی باتیں سنائیں۔ بلے بلیوں اور ہم انسانوں میں بہت سی عادتیں ایک سی ہیں تم نے کئی ایک بلے دیکھے ہوں گے جن کی شکلیں اور زندگیاں بعض آدمیوں کی شکلوں اور زندگیوں سے بڑی مشابہ ہوتی ہیں

یہ بلّے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو جائیں اور کپڑے پہن لیں تو ہو بہو انسان لگنے لگیں گے۔ اسی طرح اگر بعض انسان اپنے گھٹنوں کے بل پر اپنے بازو آگے ٹیک دیں تو ان میں اور بلوں میں فرق بتانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن بلے کو قدرت نے ایک ایسی شے دی ہے جو آج تک کسی انسان کو میسّر نہیں آسکی۔ وہ شے ہے بلے کی صاف شفاف اور چمکیلی پشم۔ تم نے ضرور ایسی عورتیں دیکھی ہوں گی جو پشم کے کوٹ پہن کر بلیوں کی ہمسری کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مگر وہ بات پیدا نہیں کرسکتیں۔

اس پشم کو دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیئے بلّے بہت کم نہاتے ہیں۔ زیادہ ہوا تو زبان سے اپنی پشم کو چاٹ لیا اور وہ پھر ویسے کی ویسی شفاف۔ پانی میں بھیگنے سے بلے ناخوش ہو جاتے ہیں۔ بھیگی بلی کی مثل اسی سے تو بنی ہے۔ انسان بھی نہانے کے معاملے میں بلوں سے سبق حاصل کر سکتا ہے۔ ہم بلا وجہ نہاتے اور منہ دھوتے ہیں اگر ہم غسل نہ کیا کریں تو ہمارے جسم پر میل کی تہیں جمتی جائیں گی اور خوبصورت پشم بن جائیں گی پھر ہمیں کپڑوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ تم نے اپنے شہر کی گلیوں میں ایسے کئی آوارہ آدمی دیکھے ہوں گے جن کے جسم پر یہ میل کی پشم چڑھی ہوتی ہے وہ کپڑے نہیں پہنتے۔

افریقہ کے ایک زولو فلاسفر کا قول ہے کہ نہانا ایک فضول رواج ہے۔ تم خود دیکھو ہمیں دُنیا میں آنے اور یہاں سے رخصت ہونے پر دو غسل دیئے جاتے ہیں یہ بالکل بیکار ہیں۔ ان کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بیچ میں نہانے کی بات آپڑی ہیں تمھیں بتا رہا تھا بلے بلیوں کے بارے میں۔ میری زندگی میں دو تین بلے بلیاں آئے ہیں آؤ تمھیں ان کی کہانیاں سُنائیں تاکہ تم عبرت پکڑو اور تمھیں معلوم ہو کہ ان میں اور انسان میں کوئی خاص فرق نہیں۔

مجھے ایک بلی یاد آتی ہے جب میں چھوٹا تھا تو یہ بلی ہمارے باورچی خانہ میں چولھے کے پاس بیٹھ کر آگ پر رکھی ہوئی دودھ کی دیگچی کی رکھوالی کیا کرتی تھی۔ یہ میری خالہ کی چہیتی تھی اور بالکل قابل اعتبار بلی تھی۔ عام بلیوں کی سی چوڑ پنے کی عادت اُسے چھو تک نہ گئی تھی۔ یہ بلی اپنے روز کے چھیچھڑوں اور رکابی میں چار بھر دودھ پر شاکر تھی میرا خیال ہے کہ یہ دُنیا میں واحد بلی تھی جو دودھ کی رکھوالی تھی میں نے ایسی بُردبار اور شریف نفس بلی کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی پشم برف کی طرح سپید تھی اور اُبلتے ہوئے دودھ کی دیگچی کے پاس اپنی پچھلی ٹانگوں پر بیٹھی ہوئی یہ ایک وضعدار۔ سن رسیدہ خاتون کی مکمل تصویر نظر آتی تھی۔ میں نے ایسا وقار اور رکھ رکھاؤ صرف دو تین خواتین میں دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قدر نیکی اور شرافت اس کی عمر کی وجہ سے نہ تھی وہ ضرور بلیوں کی کسی شاہانہ اور عمدہ نسل سے تھی۔ اس میں امیرزادیوں اور شاہزادیوں کی خوبو تھی وہ ایک پارسا جوگن تو ضرور لگتی تھی لیکن میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے بارے میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اپنے الھڑپن کے زمانے میں بھی اس نے تو سو چوہے نہیں کھائے ہوں گے۔ چوہے اس نے کھائے ضرور ہوں گے۔ کون بلی اس کمزوری سے پاک ہے۔ مگر اس نے یہ کام اپنی خانہ داری کے فرض کے طور پر کیا تھا۔ اور اب اپنے کیئے پر سچے دل سے پشیمان تھی تو یقیناً ایک قابل مثال بلی تھی

اِس بلی کے انجام کے متعلق مجھے کچھ یقین نہیں۔ میں بڑا ہوا تو میرا چھوٹا بھائی ایک دن کہیں سے ایک بلونگڑا پکڑ لایا اس کے دھڑ کا پچھلا حصہ اور ٹانگیں سیاہ مائل ملگجی رنگ کے تھے اور سر اور گردن کا حصہ سفید یہ بلونگڑا 'آدمی' تھا۔ ہم نے اس کا نام ٹام رکھا۔ ٹام جلد ہی سارے گھرانے کا لاڈلا بن گیا۔ گھر میں ہر کوئی اُسے گود میں اُٹھا لیتا اور اُسے چمکارتا۔ اس بے جا لاڈ پیار نے ٹام کی عادتوں کو بالکل بگاڑ دیا۔ ٹام میں ایک پیدائشی شکاری کی سی خصلت تھی اور ابھی یہ دو تین مہینے کا ہی تھا کہ یہ ہمارے صحن میں اُگے ہوئے بڑے پیپل کے نیچے بیٹھ کر گلہریوں اور چڑیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے تاکا کرتا اور اپنے پنجے تیز کرتا۔ ان دنوں میری والدہ کو مرغیاں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ جب چھوٹے ملائم چوزے اون کے گیندوں کی طرح اُچھلتے اور پھدکتے ہوئے صحن میں پھرتے تو ٹام میری والدہ کے ، بیٹھے ، کے ساتھ دبک کر انھیں دلچسپی اور حسرت سے گھورا کرتا۔ میری والدہ کو یقین تھا کہ ٹام ایک اچھا بلا ہے اور گھر کے چوزوں کا رکھوالا ثابت ہو گا۔ ہم جو ٹام کے منہ میں خون کی مہک آتے دیکھتے تھے اُس کی بھگتی کے متعلق اتنے پُر یقین نہ تھے۔ ہم نے پیش گوئی کی کہ ٹام

کسی دن چوزوں پر جھپٹ جائے گا۔ لیکن میری والدہ نے ہمیں شام کے بارے میں اس طرح سوچنے پر ڈانٹا۔ شروع شروع میں اس قدر ترغیب کے سامنے شام کے اس جبر اور صبر نے ہمیں واقعی حیران کر دیا۔ اور ہم خیال کرنے لگے کہ شاید اس کی چوزوں میں دلچسپی ان کی رکھوالی کی وجہ سے ہے۔

آخر ہماری پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ میری والدہ باورچی خانہ میں مصلے پر نماز پڑھ رہی تھیں۔ شام ان کے ساتھ حسب دستور دبکا بیٹھا تھا ایک مرغی اپنے ننھے چوزوں کو لئے باورچی خانہ میں آ گئی۔ چوزے بار بار پھدکتے ہوئے شام کے سامنے سے گذرتے۔ ان کے نزدیک شام جیسے تھا ہی نہیں میں نے دیکھا کہ شام کی آنکھیں خونی ہو گئیں وہ اپنی زبان کو باہر نکال کر ناک پر پھیرتا۔ وہ اپنے کو بڑی مشکل سے قابو رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاتا تو وہ بالکل گربہ مسکین بن جاتا اور دوسری طرف دیکھنے لگتا جیسے کہ اسے چوزوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اب شام کو لحاظ تھا تو صرف والدہ کا۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ آخر شام سے نہ رہا گیا۔ یکلخت وہ ایک چھوٹے چوزے پر جھپٹا جو پھدکتا ہوا بالکل شام کے ناک کے قریب آ گیا تھا شام اُسے دبوچ کر باہر بھاگا۔ ہم سب اس کے پیچھے بھاگے اور اُسے زخمی چوزے کو چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ ہمیں شام کی اس ناشکرگذاری اور ندیدے پن پر بڑا غصہ آیا۔ ہم سب بھائی بہنوں نے عہد کیا کہ اب ہم شام کو بالکل منہ نہ لگائیں گے۔ ہم اس کی بگڑی ہوئی عادات کو سنوارنا چاہتے تھے۔ شام پر ہماری بے رخی کا ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا۔ اس نے اب بلا دھڑک اور بے شرمی سے میری والدہ کے مرغی خانہ کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کے طور طریق بالکل خراب ہو گئے۔

آخر میرے چھوٹے بھائی اور میں نے اس پر ایک جرگہ بٹھایا اس میں فیصلہ کیا کہ شام کو جھوٹ موٹ پھانسی کی سزا دی جائے۔ شام کے گلے میں پھندا ڈال کر اُس کے دوسرے سرے کو پیپل کی ٹہنی سے باندھ دیا گیا مگر شام ہوا میں نہیں لٹک رہا تھا اس کی پچھلی ٹانگیں زمین پر تھیں۔ ہم نے ایک مرے ہوئے چوزے کو جسے ہم نے اسے چھوڑنے کے لیے مجبور کر دیا تھا ملزم سے دو گز کے فاصلے پر رکھ دیا تاکہ شام کو روحانی سزا بھی ملے۔ گھر کے سب لوگوں نے اُسے بے حد شرمندہ کیا اور میرے چھوٹے بھائی نے جس کا اصلی دست و بازو وہ بلا تھا اسکا منہ کالا کر کے اُسے آئینہ بھی دکھایا۔ اس سزا کے بعد بھی شام کی اصلاح نہ ہو سکی۔

جب ہم کو یقین ہو گیا کہ وہ قطعی خراب ہو گیا ہے تو ہم نے ایک دن اُسے چند اونٹ والوں کے حوالے کر دیا ہم نے انہیں کچھ پیسے دئے اور انھیں ہدایت کی کہ اسے شہر سے چھ سات میل دُور لے جا کر ٹیلوں میں چھوڑ دیں۔ اونٹوں والے شام کو لے گئے، مگر اس کے چھٹے یا ساتویں دن شام صاحب پھر گھر میں موجود تھے۔ شام پہلے سے فربہ اور موٹا ہو گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے واپسی کے سفر میں اس نے چوہوں کا خوب شکار کیا تھا۔ اس کے بشرے پر ندامت کے آثار تک نہ تھے ہمارے لئے اس کا دس بارہ میل دُور سے گھر کا راستہ ڈھونڈ کر پہنچ جانا معمہ تھا۔ ہم نے پھر اسے اپنے دلوں میں جگہ دی۔ وہ ہمارا بلا تھا اور ہمارے پاس ہی لوٹ آیا تھا اس کی اس سیاحی نے اس کی دھاک بٹھا دی اور ہم اسے اس رشک اور عزت سے دیکھنے لگے جیسے بغداد میں پُرامن شہری سندباد جہازی کو دیکھتے ہوں گے۔

جب شام سنِ بلوغت کو پہنچا تو وہ کافی اوباش اور آوارہ مزاج ہو گیا۔ اب وہ گھر سے کئی کئی دن غائب رہنے لگا شہر سے دور دراز حصوں میں اس کے بُری صحبت میں گھومنے کی ایک دو خبریں ہمیں ملیں۔ لیکن ہفتے یا مہینے کے بعد وہ گھر آ کر ہمیں شکل ضرور دکھا جاتا۔ ایک دفعہ شام چھ مہینے تک نہ آیا۔ ہمیں خیال ہونے لگا کہ کہیں کسی کتے یا ظالم آدمی نے اسے ارہی نہ دیا ہو۔ ایک شام ہم صحن میں بیٹھے شام کے مارے جانے کا افسوس ہی کر رہے کہ شام سر جھکائے اور مسکین صورت بنائے دروازے میں سے اندر داخل ہوا۔ اسے شاید کچھ ندامت تھی کہ اس نے اتنا عرصہ گھر سے فرار رہ کر اچھا نہیں کیا اور شاید اس نے یہ بھی تاڑ لیا کہ ہم اُسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایک شرمسار مجرم کی طرح ہماری طرف دیکھے بغیر وہ سیدھا سیڑھیوں کی سمت گیا اور چڑھتا ہوا میرے چھوٹے بھائی کے کمرے میں جا چھپا۔

شام کے یہ لچھن کتنی ہی مدت تک رہے۔ ایک بار جب وہ اسی طرح گھر سے بھاگا ہوا تھا۔ ہمارے ہمسایوں کی مرغیاں اور مرغے

پُر اسرار طور پر غائب ہونے شروع ہو گئے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان کو کون لے جا رہا ہے اور ان کا چور کون ہے۔ محلے بھر میں کہرام مچ گیا اور دلی سے آئے ایک چھدری داڑھی والے حکیم صاحب نے جن کی آٹھ نو مرغیاں ایک ایک کر کے غائب ہو چکی تھیں۔ محلہ کی مسجد میں بذریعہ اشتہار یہ اعلان کیا کہ مرغیوں کے چور کا پتہ لگانے والے کو شربت انار کی ایک بوتل اور پانچ روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ بڑے عرصے تک ہوشیار چور کا کوئی کھوج نہ لگ سکا۔ پھر کسی نے ایک کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کے پاس ایک مرغی کی پچکی ہوئی گردن اور پر دیکھے اس سے سب پر بھید کھلا کہ یہ کسی چور کا کام نہ تھا اور یہ کہ مرغیوں کو کوئی بلا کھا رہا ہے۔ ٹام کی شہرت کی وجہ سے ٹام پر شک کیا گیا۔ یہ تاجی ام ورود ایک دفعہ اپنے اس خطرناک مشغلے کے جرم میں پکڑا بھی گیا جب محلے کی تمام مرغیاں ختم ہو گئیں اور ڈربے نہ رہے تو ٹام ایک اچھے لڑکے کی طرح پھر گھر میں لوٹ آیا وہ اب بڑا موٹا تازہ اور چاق و چوبند ٹام تھا اور پہچانا نہ جاتا تھا۔

ایک دفعہ میں کالج میں تھا کہ ٹام پھر غائب ہو گیا۔ اس دفعہ وہ کوئی ایک سال لاپتہ رہا۔ لیکن اس کی مکاری اور حیلہ سازی کو جانتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہوگا اور ضرور واپس لوٹے گا اس عرصہ میں میں نے اسے صرف ایک دفعہ دیکھا۔ گرما کی ایک شام کہ میرا ایک دوست اور میں شوقینی کی خاطر دھاری دار نکٹائی ہری بوئیں لگائے اور سیاہ سوٹ ڈانٹے سینما جا رہے تھے۔ جب ہم فوجی افسروں کے کلب کے پاس سے گذرے تو اکیلے درجن کالے، مور، چتکبرے بڑے بلیاں کلب کے پھاٹک سے بھاگتے ہوئے نکلے۔ ان میں ایک چھوٹی کالی بلی بھی تھی جو دبکائے ہوئے تھی اور باقی تھی۔ وہی ایک خاتون تھی باقی غالباً سب "مرد" تھے۔ ان میں ہمارا ٹام بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً نظر چرالی۔ یہ لوگ کلب کے کسی ڈنر سے لوٹ کر آتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا دوست اور میں اس خیال پر بے حد ہنسے۔ ظاہراً ٹام اب فیشن ایبل سوسائٹی میں گھومنے پھرنے لگا تھا۔ مجھے اس پر فخر کا احساس ہوا۔

ٹام اب بھی ہمارے پاس ہے۔ وہ اب بوڑھا ہو چلا ہے اور اب اس نے غائب ہونا چھوڑ دیا ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے شادی کر لی ہے۔ اور اپنی ہی قسم کی ایک چھوٹی بلی کے ساتھ ایک پُر امن گرہستی زندگی گذار رہا ہے ٹام اب بے حد موٹا اور سست ہو چکا ہے اور اس کے نخریلے پن کا تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔ وہ سنگترے کی قاشیں اور تربوز تک کھا لیتا ہے اس کی بینائی بھی کچھ کمزور ہو گئی ہے۔

یہ ہے ٹام کی کہانی یہ بڑی لمبی ہو سکتی تھی۔ مگر مجھے اسے چھوٹا کرنا پڑا ہے۔ بچو! اس کہانی سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری ساری تہذیب اور رسم و رواج کے باوجود اصل میں انسان کی اور ایک بلے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں اسی افریقہ کے زولو فلاسفر کا (جسے میں نے پہلے نقل کیا ہے) کہنا ہے کہ انسانوں کی طرح بلے بلیوں کے بھی سماجی تعلقات اتنے ترقی پا چکے ہیں اور الجھ چکے ہیں کہ اگر ایک بیسویں صدی کا بلا چار سو سال قبل مسیح کے بلے کو دیکھے تو حقارت سے منہ پھیر لے۔ پھر بھی اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو عیش و آرام بلے بلیوں کو قدیم مصر میں میسر تھے وہ آجکل ہمارے دیس میں بھی نصیب نہیں۔ قدیم مصری بلیوں کی پرستش کرتے تھے۔ ہر مصری کے گھر میں بلیوں کے کئی کئی خاندان پرورش پاتے تھے۔ اور بلی کو مارنے والے کی سزا قتل ہوتی تھی۔ آج کل بلے بلیوں کی وہ قدر کہاں۔ جائے عبرت ہے۔

سوالات؟

(۱) اگر ایک طاعون ایک بڑے شہر کو چار مہینے اور دس دن میں خالی کر سکتا ہے تو بتاؤ اس شہر کو خالی کرنے کے لئے ایک ہائیڈروجن بم کو کتنی مدت درکار ہوگی؟

(۲) نیا سال کیوں مبارک ہوتا ہے۔ اسے منانے کا صحیح اور مناسب طریقہ کیا ہے: 'مرزا' اور 'آن ٹکر' کی تصویروں کو دیکھ کر لکھو؟

(۳) ڈاکٹر قوم کے لئے کیوں ضروری ہیں۔ قسم نمبر دو کے ڈاکٹر بننے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟

(۴) بلے بلیوں سے ہمیں کیا سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔ اپنے کسی جاننے والے کی زندگی کو سامنے رکھ کر بتاؤ کہ اس کی زندگی بلے سے کس لحاظ سے مختلف ہے؟

دیوتا کا دان

● ظہور بخش ● لوک کتھا

حیرت ہے صاحب، کہ دیوتا لوگوں کو بھی ہماری زمین پر آکر طنز و مزاح سوجھنے لگتا ہے، جب میں نے یہ لوک کتھا پڑھی تو دیوتاؤں کی متانت اور سنجیدگی کی جتنی قدر و منزلت ذہن میں تھی وہ سب ختم ہوگئی۔

گاؤں کے باہر برگد کا ایک پیڑ تھا جس کے قریب ہی گنیش جی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ گاؤں میں اور کہیں مندر نہ تھے۔ اس لئے سبھی لوگ اسی مندر میں پوجا کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ گاؤں میں ایک بھکاری بھی رہتا تھا۔ بھیک مانگنا ہی اس کا کام تھا۔ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ بھکاری کو کافی بھیک نہیں ملتی تھی۔ اس لئے یہ اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر مندر کے دروازے پر بیٹھنے لگا اس نے سوچا لوگ یہاں دھرم کرنے آتے ہیں اور کچھ نہیں تو پیٹ بھرنے لائق بھیک ہی مل جایا کرے گی۔

بھکاری دن بھر مندر کے دروازے پر بیٹھا رہتا اور جب وہاں کسی کو آتے دیکھتا تو شوشو رٹنے لگتا تھا۔ اسی طرح بیچارہ دن بھر گنیش جی اور شو جی کا نام لیا کرتا تھا۔ مگر شام تک اُسے بھیک ملتی تھی ـــــ صرف دو چار مٹھی اناج اور کچھ پھول پھل اور کبھی کبھار چھ پیسے۔ بھلا اتنی تھوڑی آمدنی سے کسی کی گذر کیسے ہوسکتی ہے؟ پھر بھکاری کو اپنا ہی نہیں اپنی بیٹی کی بھی چنتا کرنی پڑتی تھی۔ اس کی بیٹی کا نام تھا کملا اور وہ بڑی عقلمند اور سیانی تھی۔ مگر گھر داری اور سیانے پن سے تو پیٹ کی آگ نہیں بجھتی۔ اسے تو کھانا چاہیئے۔ اس لئے کملا کبھی کبھی اپنے باپ کو بھوجن پانی کے لئے تنگ کرنے لگتی تھی۔ اس وقت بھکاری کے دل پر بڑی چوٹ لگتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ وہ چنتا کے سمندر میں ڈوبنے اُبھرنے لگتا تھا۔

گرمی کے دن تھے۔ دوپہر کا سمے تھا۔ اوپر آسمان اور نیچے دھرتی بھڑ بھڑا کر جل رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ایسے ہی سمے میں مہادیو پاروتی لوگوں کا دکھ سکھ دیکھنے اس سنسار میں آئے۔ چلتے چلتے وہ اسی گاؤں میں پہنچے اور گنیش جی کے مندر کے سامنے سے نکلے۔ بھکاری انھیں دیکھ کر زور سے جے شو۔ جے شو کی رٹ لگانے لگا۔

بھکاری کی یہ حالت دیکھ کر پاروتی کو بڑی دیا آئی۔ انھوں نے مہادیو جی سے کہا۔ اُف، اس بھکاری کی طرف دیکھو! بیچارا کتنا دُکھی ہے۔ دیکھو تو کتنے پریم سے تمہارا نام جپ رہا ہے۔ لیکن ایک تم ہو کتنے کٹھور۔ تم نے آج تک اس پر دیا نہ کی۔ میں نے سُنا تھا کہ لوگ اب بڑے پاپی ہوگئے ہیں۔ وہ اب دیوتاؤں کی پُوجا نہیں کرتے۔ مگر نہیں۔ آج معلوم ہوا کہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ سب اپرادھ دیوتاؤں کا ہی ہے۔ اسی آدمی کو لو۔ بچارے کو تمہارا نام لیتے برسوں بیت گئے۔ اس پر بھی بدقسمت پیٹ بھر بھوجن تک نہیں پاتا۔ جب دیوتا ہی ایسے کٹھور ہو جائیں تو کوئی کاہے کو ان کی پوجا کرے گا۔

مہادیو کو پاروتی کی بات لگ گئی۔ وہ پاروتی سے بولے۔ اصل بات کیا ہے۔ یہ تم نہیں جانتیں۔ جان بھی نہیں سکتیں

کیونکہ تمہارا ہردے اتنا کومل ہے مگر تم رنج نہ کرو۔ میں آج ہی کچھ بندوبست کرائے دیتا ہوں۔ جس سے اس بھکاری کا دُکھ دُور ہو جائے گا۔

اتنا کہہ کر مہادیو پاروتی کے ساتھ مندر میں پہنچے، ماتا پتا کو آتے دیکھ کر گنیش جی اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بڑے پریم سے اُن کو پرنام کیا۔ مہادیو جی نے گنیش جی کو آشیرباد دیا اور کہا۔ دیکھو بیٹا یہ بھکاری برسوں سے تمہارے دوار پر بیٹھا میرا نام جپا کرتا ہے مگر تم نے اب تک اس پر دیا نہیں کی اب ایسا کچھ اُپائے کرو جس سے اس بچارے کا دکھ دُور ہو جائے۔ گنیش جی نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔ اچھی بات ہے پتا جی سات دن کے اندر اس کا دکھ دُور ہو جائے گا اُسے کہیں نہ کہیں سے ایک لاکھ روپے مل جائیں گے۔ گنیش جی کا جواب سُن کر مہادیو اور پاروتی آگے چلے گئے۔

اسی سمے ایک بنیا مندر میں پوجا کرنے آیا ہوا تھا۔ وہ اوٹ میں چھپا ہوا مہادیو اور گنیش جی کی باتیں سُن رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ اگر تھوڑی سمجھداری سے کام لوں تو آسانی سے ایک لاکھ کا مالک ہو سکتا ہوں۔ چنانچہ وہ بڑی خوشی سے بھکاری کے سامنے پہنچا اور اُسے پرنام کرکے ایک طرف بیٹھ گیا۔ بھکاری کو آج تک کسی نے نہ پرنام کیا تھا نہ کوئی اس کے پاس آکر بیٹھا ہی تھا بنیئے کے اس کام سے بھکاری نے سمجھا کہ بلاشبہ یہ کوئی بھلا مانس ہے۔ وہ من ہی من میں خوش ہوا اور بنیئے سے بولا۔ بابا! آپ بہت دیالو جان پڑتے ہیں۔ کہیئے میرے پاس آنے کی کرپا کیوں کر ہوئی۔ آپ نہیں جانتے ہیں ایک غریب بھکاری ہوں۔

بنیئے کو تو اپنا مطلب نکالنا تھا۔ میٹھے لہجے سے بولا "آپ بھکاری ہیں! کون کہتا ہے کہ آپ بھکاری ہیں؟ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ پہنچے ہوئے مہاتما ہیں اور آپ کے درشن سے لوگوں کے پاپ کٹ جاتے ہیں۔ میں بھی آپ کے درشن کرنے چلا آیا ہوں مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے اگر اجازت ہو تو پوچھوں!

بھکاری نے کہا۔ خوشی سے پوچھیئے!

بنیا بولا بھلا دن بھر میں آپ کو کتنی بھیک مل جاتی ہے؟

بھکاری کہنے لگا۔ بھئی ملنے کی کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ روزانہ دو چار مٹھی اناج مل جاتا ہے۔ کبھی دو چار پیسے بھی مل جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح دن کاٹ ہی لیتا ہوں۔

بنیا کہہ اُٹھا۔ رام رام! آپ جیسے مہاتما اور یہ کشٹ! اس گاؤں کے آدمی بھی کیا آدمی ہیں؟ آپ کی تھوڑی بھی مدد نہیں کرتے! آپ کیسے یہ کشٹ سہہ لیتے ہیں۔ مجھے تو آپ پر بڑی دیا آتی ہے۔ میرے جی میں آتی ہے کہ آپ کی کچھ سیوا کروں۔ پر کہنے میں ڈر معلوم ہوتا ہے۔

بھکاری نے پوچھا۔ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟

"ہیں ہیں ہیں!" بنیا دانت نکال کر بولا۔ میری اتنی حیثیت کہاں! جو آپ کی کچھ سیوا کر سکوں۔ مگر ایک بات ہے۔ آج سے آپ کو جو کچھ بھی ملے وہ مجھے دیدیجیئے۔ اس کے بدلے میں میں آپ کو سو روپے دوں گا۔

سو روپے کا نام سُنتے ہی بھکاری مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ اس نے سوچا اگر سو روپے مل جائیں تو کیا کہنا۔ یہاں تو سات دن میں سات آنے کا سامان بھی نہ ملے گا۔ تب تو سو روپے چھوڑ دینا سراسر بے وقوفی ہے ـــــ پورا گدھا پن ہے۔

مگر اسی سمے اُسے لڑکی کا خیال آگیا۔ میں سو روپے لے کر گھر پہنچا اور کملا بگڑنے لگی تو! اس کی صلاح بھی لے لینی چاہیئے۔

بس یہ وچار آتے ہی اس نے بنیئے کو جواب دیا۔ آپ نے مجھ پر بڑی کرپا کی۔ مگر میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سوچ وچار کر کل کہوں گا۔

بنیا جب چلا گیا۔ تب بھکاری نے کملا کو بلایا اور اُسے سب حال سُنایا۔ عقلمند کملا فوراً سمجھ گئی کہ اس میں بنیئے کی ضرور کوئی شیطانی ہے۔ اس نے پتا سے کہا۔ بنیا بغیر فائدے کے کیوں سو روپے دے رہا ہے؟ خیر میں کل اس سے سب باتیں طے کر لوں گی

گر تم بیچ میں نہ بولنا۔

ادھر بنیئے کا بُرا حال تھا۔ رات بھر اس کے سر پہ بھیرو ناچتا رہا۔ بڑی مشکل سے سویرا ہوا اور بنیئے کی جان میں جان آئی وہ ہاتھ منہ دھو کر فوراً بھکاری کے پاس جا پہنچا اور چھوٹتے ہی بولا۔ کیا وچار کیا آپ نے؟

کملا بھی بنیئے سے نپٹنے کو تیار بیٹھی تھی۔ بنیئے کی بات سنتے ہی اس نے جواب دیا۔ سیٹھ جی ہم لوگوں نے وچار کر لیا۔ بھلا سو روپے میں کیا ہوتا ہے اتنا سستا سودا ہونا مشکل ہے معاف کیجئے۔ کملا کا جواب سنتے ہی بنیئے پہ گویا بجلی گر پڑی۔ لیکن لاکھ روپے کا لالچ چھوڑنا بھی تو کٹھن تھا۔ وہ دو سو دینے کو راضی ہو گیا۔ اب تو کملا کا شک اور بھی گہرا اور پکا ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ بنیا ضرور کسی بھاری فائدے کے لئے ہی اتنے روپے دینا چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا سیٹھ جی اتنا سستا سودا اور کہیں ہوتا ہوگا۔ سو دو سو یا ہزار دو ہزار میں ہوتا ہی کیا ہے۔ جو چیز آپ کوڑیوں کے مول خریدنا چاہتے ہیں وہ لاکھ روپے میں بھی سستی ہے۔ یہ سن کر بنیا بہت گھبرایا لیکن اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ مارے لوبھ کے وہ اندھا ہو رہا تھا۔ اس کے سر پہ لوبھ کا بھوت سوار ہو گیا تھا اس نے سو دو سو بڑھ کر آخر میں پچاس ہزار لگا دیئے۔

اب کملا نے سوچا اتنے روپے تھوڑے نہیں ہوتے۔ بیٹھے بٹھائے اس فائدے کو چھوڑنا ٹھیک نہیں۔ اس نے بنیئے سے کہا خیر آپ نہیں مانتے تو میں ہی آپ کی بات مانے لیتی ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ روپے ابھی ملنے چاہئیں۔ یہ شرط منظور کرنے میں بھلا بنیئے کو کیا عذر تھا۔ وہ خوشی خوشی گھر لوٹا۔ اس نے سوچا پچاس ہزار روپے لے کر ایک لاکھ لینا بُرا نہیں ہے۔ ایک لاکھ نہ سہی پچاس ہزار کا مالک تو بن ہی جاؤں گا آہا آہا! میری تقدیر بھی کتنی اچھی ہے۔ سات ہی دن میں پچاس ہزار کا فائدہ ہو گیا۔ اس نے گھر آتے ہی بھکاری کے پاس پچاس ہزار روپیہ بھیج دیا۔

اب بنیا ہر روز بھکاری کے پاس آتا اور ان کی دن بھر کی بھیک گھر لے آتا۔ اس طرح چھ دن بیت گئے اب تو بنیئے کو بڑی فکر ہوئی۔ ساتویں دن پھر گنیش کے مندر میں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ آج پھر شو جی اور پاروتی مندر میں پدھارے ہیں۔ بس وہ دیوار سے کان لگا ان کی باتیں سننے لگا۔ [illegible] کا کان دیوار سے چپک گیا۔ اس نے کان چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن کان ٹس سے مس نہ ہو تب وہ داہنے ہاتھ کی مدد سے کان چھڑانے لگا۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی دیوار سے چپک گیا۔

ادھر مہادیو جی نے گنیش جی سے پوچھا۔ بیٹا اس بھکاری کے لئے کچھ انتظام ہوا؟

گنیش جی بولے۔ جی ہاں پچاس ہزار روپے تو دلا دیئے ہیں۔ باقی کے لئے بنیئے کو دیوار سے چپکا دیا ہے۔ اب جب تک یہ بھکاری کو باقی پچاس ہزار روپے نہیں دے گا تب تک اسے دیوار نہیں چھوڑے گی۔

گنیش جی کی باتیں سن کر بنیئے نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آخر جب اس نے گھر سے پچاس ہزار روپے منگوا کر بھکاری کو دیئے تب دیوار نے اسے چھوڑ دیا۔

●

مولانا آزاد نے کہا

کسی زمانے میں ایک صاحب نے مولانا آزاد سے پوچھا "آپ کا ملک الشعرا بہار کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

مولانا نے فرمایا "خدا ان کے کلام کی خزاں سے محفوظ رکھے"

●

صحرا میں شگوفے

مرزا عصمت اللہ بیگ

٭ عربوں کی ظرافت

آپ عرب کو ریگستان کہہ لیجئے، خشک اور بے برگ و گیاہ۔ مگر فطرت نے یہاں بھی اپنا گل کھلایا اور ذہن کو ظرافت کا وجدان بخش دیا۔ صحرا میں سبزہ زار اور جنگل میں منگل شاید اسی کو کہتے ہیں۔

عربوں کا مقولہ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: جس طرح تھوڑا سا نمک کھانے کو خوش ذائقہ بنا دیتا ہے اسی طرح تھوڑی سی ظرافت بھی بات کو چٹخارے دار بنا دیتی ہے۔ منطقی دلائل اور فلسفیانہ انداز میں جو بات چیت کی جائے وہ اتنا اثر نہیں دکھاتی جتنا کہ ظریفانہ رنگ میں دیکھا جاتا ہے۔ عربی زبان میں کثرت سے ایسی کتابیں ہیں جن میں علمی نکات لطیف ظرافت کے چٹخاروں کے ساتھ موجود ہیں اور تلخ ترین مقولے ظرافت کی چاشنی دیکر خوشگوار اور شیریں بنا دیئے گئے ہیں۔

بدیہہ گوئی اور حاضر جوابی عربوں کی گھٹی میں پڑی تھیں اور سچ پوچھو تو یہی باتیں ظرافت کی جان ہیں۔ اس پر بھی عربوں نے اس فن پر کئی مستقل کتابیں لکھیں اور ظرافت کے حدود قائم کر دئے تاکہ وہ اپنے حدود سے آگے بڑھنے نہ پائے، ظرافت اپنے اصلی معنوں میں ظرافت رہے اور وہ ظرافت عامیانہ اور مکروہ الفاظ سے تمسخر اور فحش نہ ہونے پائے۔

عرب میں گفتگو کی نوک جھونک عام طور پر ضلع، جگت اور پھبتی میں ہوتی ہے اور زیادہ تر انھیں صنعتوں میں بات چیت میں مذاق پیدا کیا جاتا ہے۔

چوتھی صدی ہجری میں "ابو سعید منصور ابن الحسن" نے ایک کتاب "نثر الادر فی المحاضرات" لکھی ہے جس میں ظرافت کے مختلف شعبوں پر بحث کی ہے مثال کے طور پر بیسوں حکایتیں خلفائے وقت کے مقولے، مدینہ میں رہنے والوں کی حاضر جوابیاں اور بیسوں دلچسپ قصے بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابیں ہیں مگر ان میں "مستطرف" بہت مشہور ہے۔ جسے آٹھویں صدی میں "شیخ الامام ابو الفتح محمد بن احمد" نے لکھا ہے یہ دونوں نئی کتابیں بے حد مقبول ہوئیں۔ تقریباً ہر زبان میں ان کے ترجمے ہوئے اور بے حد پسند کئے گئے۔ نمونے کے طور پر چند باتیں آپ بھی سُن لیجئے۔ عربوں کا قاعدہ ہے وہ شعراء اور قصہ گو وغیرہ کے حالات بھی بیان کرنے سے پہلے راویوں کا سلسلہ بھی اصلی بیان کرنے والے تک پہنچا دیتے ہیں۔ مثلاً کسی لطیفہ کو بیان کرنے سے پہلے وہ لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کو ایک شخص قاسم نے لطیفہ کو سے سُنا ہے اور قاسم یہ ذکر اپنے باپ "قدیر مغنی" سے سُنا۔ اور "قدیر" نے اپنے والد "اسمٰعیل" سے سُنا۔ اور "اسمٰعیل" نے "جمیل" سے سُنا جس کا خود یہ ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کس قدر محنت اور زبردست تحقیق کرکے اصلی واقعات فراہم کرنے کی کوشش کرتے اور پھر ان میں اگر کوئی راوی مستند نہیں ہوتا تو اس واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے۔

نمونے کے طور پر ان کی حاضر جوابیاں اور ذکاوت طبع کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔ آپ بھی سُنئے اور لطف اٹھائیے۔

ایک مرتبہ کسی شخص کو "کفر" کے الزام میں ماخوذ کرکے خلیفہ ہارون رشید کے دربار میں پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے پوچھا کہ کیا لوگوں نے تجھ پر جو الزام لگایا ہے وہ صحیح ہے؟ جواب دیا کہ لوگ میرے عقیدے سے کس طرح واقف ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں شرع کے حکم کے مطابق نماز پڑھتا ہوں۔ روزے رکھتا ہوں پھر بھلا اور کیا چاہیے؟ خلیفہ نے کہا اگر تو اپنے ملحد ہونے کا اقرار نہیں کرے گا تو میں درے مار مار کر

تجھ سے اقرار کراؤں گا۔ اس شخص نے کہا "خوب! باپ دادا تو دُرّے مار مار کر اسلام کی صداقت کا اقرار کراتے تھے اور آپ اس بات پر اڑے ہوئے ہیں کہ دُرّے مار کر مجھ سے کفر کا اقرار کرائیں ——————"

خلیفہ نے ایک مرتبہ ایک بہلول سے کہا کہ کیا تم خلیفہ بننا چاہتے ہو۔۔؟

اُس نے جواب دیا کہ نہیں۔! خلیفہ نے پھر پوچھا کہ آخر کیوں خلیفہ بننا نہیں چاہتے؟ اس نے جواب دیا کہ اس وجہ سے کہ میں تین خلفاء کے جنازے دیکھ چکا ہوں اور تم نے اب تک ایک بہلول کا بھی جنازہ نہیں دیکھا ہے۔!

ہارون رشید کے زمانہ میں ایک شخص نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ خلیفہ نے پوچھا یہ کیا کہتا ہے۔ جواب دیا کہ میں خدا ہوں۔ میری خدائی کا اقرار کرو! خلیفہ نے کہا کہ چند روز قبل ایک شخص نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا اور میں نے اسے سولی پر چڑھایا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ شاباش تو نے بہت اچھا کیا کیونکہ میں نے اُسے پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا تھا۔

ایک مرتبہ ہارون رشید کو رات میں نیند نہیں آئی۔ اس نے اپنے وزیر جعفر بن یحییٰ برمکی کو بُلایا اور کہا کہ مجھ کو نیند نہ آنے سے تکلیف ہو رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ اتفاق سے اس وقت ہارون رشید کا غلام مسرور وہاں کھڑا تھا وہ ہنس پڑا جس پر رشید کو غصہ آیا اور کہا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ مسرور نے کہا کہ امیر المومنین معاذ اللہ میں کسی اور وجہ سے نہیں ہنسا تھا بلکہ مجھے اس وقت اس وجہ سے ہنسی آئی کہ کل کا ایک واقعہ یاد آگیا اور وہ واقعہ یہ ہے کہ میں محل شاہی سے نکلا اور ٹہلتا ٹہلتا دجلے کے کنارے پہنچ گیا دیکھا کہ ایک زبردست مجمع ہے اور ایک شخص جس کا نام ابن المغازی ہے لوگوں کو کھڑا ہوا ہنسا رہا ہے۔ اِس وقت اس کی کچھ باتیں یاد آگئیں جن پر بے ساختہ ہنسی آگئی۔ خلیفہ نے کہا کہ اچھا جاؤ اور ابھی اس کو جلد بلا کر لے آ۔ یہ حکم پاکر مسرور فوراً اس کے پاس پہنچا اور کہا کہ جلد چل امیر المومنین نے تجھ کو یاد کیا ہے۔ ابن المغازی نے کہا کہ بسم اللہ میں تیار ہوں۔ مسرور نے کہا مگر اس شرط پر میں تمھیں لے چلتا ہوں کہ تمھیں جو کچھ وہاں ملے اس میں سے ایک چوتھائی تمھاری اور تین چوتھائی میری۔ ابن المغازی نے کہا کہ نصف نصف رکھو۔ مسرور نے انکار کیا۔ القصہ معاملہ اس پر طے ہوا ایک ثلث ابن المغازی کو ملے اور دو ثلث مسرور لے۔ جب یہ شرط طے ہو گئی تو دونوں رشید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ابن المغازی نے رشید کو نہایت ادب سے سلام کیا اور پر لطف باتیں کرنے لگا۔ رشید نے کہا کہ اگر اس وقت تو مجھ کو ہنسا دے گا تو تجھے پانسو دینار دوں گا۔ اگر نہ ہنسا یا تو اس کوڑے سے تین ضربیں لگاؤں گا۔ ابن المغازی نے اسے منظور کر لیا اور مذاق کی باتیں اور عجیب عجیب تمسخرانہ حرکتیں کرنی شروع کیں۔ مگر اتفاق سے رشید پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تک بھی نہ آئی۔ یہ دیکھ کر وہ مسخرا اپنے دل میں بہت ڈرا۔ رشید نے کہا کہ تم بجائے انعام کے اب سزا کے مستحق ہو اور یہ کہہ کر اپنا کوڑا اٹھایا جس میں چاندی لگے ہوئے تھے۔ جوں ہی اس کی ایک ضرب پڑی مسخرا زور سے چیخا اور کہا امیر المومنین میرا حصہ مجھے مل چکا اب مسرور کے دو حصے اُسے ملنا چاہئیں۔

مامون کے پاس ایک شخص نے آکر کہا کہ "میں نبی ہوں" مامون نے کہا کہ اس کا کیا ثبوت ہے۔ جواب دیا کہ میں تمھارے دل کی بات جانتا ہوں۔ کہا بتاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ آپ کے دل میں یہ ہے کہ میں جھوٹا ہوں۔

مامون نے کہا کہ تم سچ کہتے ہو اور اس کو قید خانہ بھجوا دیا۔ تھوڑے روز بعد پھر بلوایا اور پوچھا کہ کوئی وحی آئی۔ کہا نہیں۔ پوچھا کیوں نہیں آئی؟ اس نے کہا بلا شبہ قید میں آنا پسند نہیں کرتے۔ مامون اس جواب پر ہنسا اور اس کو چھوڑ دیا۔

ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ لوگ اس کو مامون کے پاس لائے۔ اور مامون نے اس سے معجزہ طلب کیا۔ اس نے کہا کہ میں پانی میں کچھ کنکریاں ڈالتا ہوں اور وہ سب کی سب گھل جائیں گی۔ اس کے بعد اس نے چند کنکریاں اپنی جیب سے نکالیں اور پانی میں پھینک دیں وہ سب کی سب گھل گئیں۔ لوگوں نے کہا: اس کی سند نہیں، ہم تم کو اسپ نکل کر دیتے ہیں ان کو گھلا دو تو جانیں۔ اس نے جواب دیا کہ تم لوگ فرعون سے بڑھ کر نہیں اور میں موسیٰ سے بڑھ کر نہیں۔ جب موسیٰ اپنا عصا نکالتے تھے اور وہ اژدھا بنتا تھا تو کیا فرعون ان سے یہ کہتا تھا کہ ہمارے عصا کا اژدھا بناؤ۔

ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ میں پیغمبر ہوں۔ مامون نے کہا کہ اگر اس وقت ایک تازہ خربوزہ اپنے پاس سے نکالو تو میں تم پر ایمان لے آتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ تین روز کی مہلت دیجئے۔ مامون نے کہا کہ مہلت وہلت کچھ نہیں ملتی میں ابھی چاہتا ہوں۔ اس نے جواب دیا کہ خود اللہ میاں خربوزے کو تین ماہ میں پیدا کرتے ہیں۔ آپ تین دن بھی صبر نہیں کر سکتے۔

کسی شخص نے ایک مدینے کے رہنے والے سے پوچھا کہ یہاں کے لوگ جاڑا کس طرح گزارتے ہیں۔ اس نے کہا کہ امیر لحاف اوڑھ کر اور غریب دانت سے دانت بجا کر۔

کسی عرب نے ایک سستا گھوڑا خریدا اور چلتے وقت تاجر سے پوچھا کہ تجھے قسم ہے خدائے پاک کی سچ سچ بتا کہ اس گھوڑے میں کوئی عیب تو نہیں ہے۔ تاجر نے کہا بخدا کوئی عیب نہیں ہے مگر صرف اس کی ران میں ایک کھجور کے برابر زخم ہے۔ پٹھے پر ایک انگور کے دانہ کے برابر گلٹی ہے اور پیٹ میں ایک چھوٹے خربوزے کے برابر رسولی ہے۔ عرب نے کہا کہ اوگدھے تو گھوڑے بیچتا ہے یا میوہ فروشی کرتا ہے۔

ایک اعرابی نے جس کا نام موسیٰ تھا کچھ درہم چرائے اور ہاتھ میں چھپا کر نماز جماعت میں شریک ہوگیا۔ امام نے قرأت شروع کی: "**وما تلك بيمينك يموسىٰ** (اے موسیٰ تیرے داہنے میں کیا ہے) یہ سن کر موسیٰ کا دل دھک سے ہو گیا اور فوراً درہم امام کے سامنے پھینک کر یہ کہتا ہوا بھاگا کہ واللہ تم لوگ بھی ساحر ہو۔

ایک سائل نے کسی دروازہ پر آکر سوال کیا۔ صاحب خانہ نے کہا کہ برکت ہے۔ اس نے کہا کہ تھوڑے سے جو ہی دیدو۔ کہا کہ نہیں۔ پھر کہا کہ ذرا سا زیتون کا تیل ہی دیدو۔ جواب دیا کہ یہ بھی نہیں ہے پھر کہا کہ اچھا بابا تھوڑا سا پانی پلا دو۔ کہا یہ بھی اس وقت موجود نہیں ہے۔ سائل نے کہا پھر تم لوگ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ آؤ میرے ساتھ چل کر بھیک مانگو تم تو واقعی مجھ سے بھی زیادہ بھیک کے مستحق ہو۔

ایک مؤذن صاحب کو کسی نے دیکھا کہ وہ اذان دیتے جاتے تھے اور کاغذ پڑھتے جاتے تھے لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے جواب دیا کہ اس کا حال قاضی صاحب سے پوچھئے۔ لوگ قاضی صاحب کے پاس پہنچے اور "السلام علیکم" کہا۔ قاضی صاحب نے فوراً ایک کتاب کھولی اس کے صفحات دیکھنے شروع کر دیئے۔ آخر میں ایک مقام کو دیکھ کر جواب دیا "وعلیکم السلام"

ایک چور دکان سے گھڑا چرا کرلے چلا۔ لوگوں نے گرفتار کرلیا۔ اور کہا کہ تجھ پر خدا کی مار۔ دن دہاڑے گھڑا چرا کرلے جا رہا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا گواہ ہے یہ گھڑا تمھارا نہیں ہے۔ یہ تو میرے پاس ایک زمانے سے ہے جبکہ یہ ایک چھوٹا سا پیالہ تھا اور اب یہ بڑھتے بڑھتے ایک گھڑا ہوگیا ہے۔

شاہراہ

عربی زبان میں اس قسم کے بہت سے لطیفے ہیں جن میں نہ پڑھنے والے کو پڑھنے میں تکلیف ہوتی ہے اور نہ سننے والے کو نتیجہ پر پہنچنے کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

بعض عربوں کے گذرے ہوئے واقعات کو کم سے کم الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ جس طرح وہ واقع ہوئے ہیں بلکہ بعض اوقات وہی الفاظ دہرا دئے گئے ہیں جو اس شخص کی زبان سے نکلے تھے۔ مگر ہاں پس منظر پیدا کرنے کے لئے ذرا گردوپیش کو ہلکے رنگ کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ واقعات کارٹون کی مانند ابھرے ہوئے دکھائی دیں۔

بے وقوفوں کے قصوں میں ایک عربی قصہ اس قدر مشہور ہوا کہ تقریباً ہر ملک اور ہر قوم نے اسے پسند کیا اور کچھ خفیف سے لفظی تغیر کے ساتھ اپنا لیا ہے۔

عربی کا اصل قصہ یہ ہے :—

ایک صاحب کی شادی ہوئی۔ قسمت سے دولہا دلہن دونوں بے وقوف تھے۔ دولہا میاں نے اپنے یار دوستوں کو دعوت دی ناچ گانے ہوتے رہے۔ دولہا میاں نے اپنے یار دوستوں کو رخصت کرکے واپسی پر اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کیا۔ میاں نے بیوی سے کہا کہ دروازہ بند کردو۔ بیوی نے میاں سے کہا کہ تم بند کرو۔ میاں نے کہا یہ تمہاری غلطی ہے۔ بیوی نے کہا کہ یہ تمہاری غلطی ہے۔ میاں نے جواب دیا کہ یہ تمہاری غلطی ہے دروازہ تمہیں بند کرنا چاہیئے تھا۔ بیوی نے کہا کہ میں دروازہ بند نہیں کروں گی اسے تمہیں بند کرنا ہوگا۔ میاں نے کہا کہ مگر یہ بولو کہ اب یہ دروازہ کون بند کرے گا۔ بیوی نے کہا کہ اب جو پہلے بولے وہی دروازہ بند کرے۔ پھر کیا تھا دونوں اپنا منہ بند کرکے بیٹھ گئے۔

اب سنئے اُدھر سے ایک چور گذرا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اندر گھس آیا۔ دیکھا کہ میدان خالی ہے نہایت اطمینان سے سامان سمیٹنا شروع کردیا۔ میاں بیوی دونوں نے چور کو دیکھا۔ چور پھرتا پھرتا اس کمرے میں آیا جہاں یہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر دیکھا کہ دونوں بت بنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس کو ایسے عقل کے اندھے اور کاٹھ کے پورے کہاں ملتے۔ دونوں کے نیچے سے دری کھینچی۔ بدن پر سے قیمتی زیور اتارا اور گھر کا سارا سامان سمیٹ لیا۔ مگر ان دونوں خدا کے بندوں نے اپنے منصوبے کے خلاف چوں تک نہیں کی۔

اتفاق سے اسی رات ایک پولیس افسر صاحب مع چند سپاہیوں کے گشت کرتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر اندر داخل ہوئے اور راستہ دیکھتے ہوئے دولہا دلہن کے کمرے میں پہنچے وہاں دیکھا کہ ایک مرد اور ایک عورت بچوں کی طرح ایک دوسرے کو گھور رہے ہیں۔ پولیس افسر نے واقعات پوچھے۔ مگر جواب ندارد۔ وہ بار بار پوچھتے تھے اور یہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیتے تھے۔ آخرکار پولیس افسر نے جھنجلا کر کہا کہ ان دونوں کو کوڑے لگاؤ۔ مگر وہ بے وقوف کوڑے کھا کر بھی کچھ نہ بولے تو افسر نے ایک شخص کو حکم دیا کہ تلوار سے اس مرد کی گردن اتار دے۔ اس نے گردن اڑانے کے لئے تلوار نیام سے کھینچی اور ڈرانے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ عورت تو آخر عورت تھی گھبرا کر بولی کہ خدا کے لئے اسے نہ مارو یہ میرا شوہر ہے۔

بیوی کی آواز سن کر شوہر کے چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ مارے خوشی کے باچھیں کانوں تک کھل گئیں اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ دیکھو میں آخر دم تک نہیں بولا۔ پولیس افسر نے تمام واقعات سنے اور لعنت ملامت کرتے چلتا بنا۔

عورت کو ہار ماننی پڑی اور سارا گھر لٹوا کر گھر کا دروازہ بند کیا گیا۔

اُستاد بنئے

کرشن بلدیو وید

ایک اُستاد کے قلم سے

اس مضمون میں ایک خامی ہے۔ یعنی یہ صرف اُن لوگوں کے لئے ہی عبرتناک اور دلچسپ ہے جو اُستاد بن چکے ہیں لیکن جنھیں ابھی اُستاد بننا ہے۔ وہ تو یہی سمجھیں گے کہ بلدیو کرشن وید ہمیں گمراہ کر رہا ہے۔

پہلے تو آپ فی زمانہ جو چاہیں اور جتنا چاہیں بن سکتے ہیں لیکن اگر بن آئے تو اُستاد بنئے۔ اُستاد سے یہاں مراد محاوراتی اُستاد سے نہیں اور نہ ہی اس اُستاد سے جو اکھاڑے میں جاتا ہے، تانگہ چلاتا ہے، جیبیں کاٹتا پھرتا ہے، مجمع لگاتا ہے، گاتا بجاتا ہے، شاعری کرتا ہے یا اسی قسم کی کوئی اور اُستادی کرتا ہے۔ سنتے ہیں کہ ان دونوں قسموں کے اُستاد بنانے سے نہیں بنتے۔ پیدا ہوتے ہیں۔ آپ کی پیدائش سے انکار نہیں۔ اشارہ کسی اور نقطہ کی طرف ہے لیکن اشارہ شاید آپ کے لئے کافی نہیں۔ ورنہ اس سیدھی سی بات پر آپ اتنا بوکھلا نہ جاتے۔ پھر بھی اُستاد بن جائیے۔ بوکھلاہٹ خود بخود دور ہو جائے گی یعنی آپ کی شخصیت کا ایک جزوِ اعظم بن جائے گی۔ شاید آپ سمجھ گئے ہیں کہ مطلب اس اُستاد سے ہے جو لڑکوں اور کبھی کبھی لڑکیوں کو پڑھاتا ہے اور جسے عام فہم زبان میں قوم کا معمار کہا جاتا ہے اور جسے خوش فہم لوگ پروفیسر کہہ کر بلاتے ہیں۔

لیکن بات کا رُخ دیکھتے ہی آپ کا رُخ بدل گیا ہے۔ جیسے کسی نے آپ کو گالی دے دی ہو۔ شاید آپ بھی اُن بے شمار لوگوں میں سے ہیں جنھیں اس پیشہ کے بارے میں اُتنا ہی علم یعنی لاعلمی ہے جتنا کہ اُن شریف عورتوں کے بارے میں جو پیشہ کرواتی ہیں۔ آپ یا تو اُستاد کو ایک ہوّا سمجھتے ہیں اور یا اسی قسم کی اور کوئی چیز۔ شاید آپ کا خیال ہے کہ اُستاد بننے سے کچھ نہ بننا بہتر ہے۔ یا یہ کہ اُستاد بننے سے کچھ بنتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو یہ خطرہ بھی ہو کہ آپ اُستاد بننے کے قابل نہیں۔ یا پھر آپ کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ پیشہ آپ کے قابل نہیں۔ آپ کو شاید یہ وہم بھی ہو کہ اُستادوں کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں۔ انھیں کام بہت کرنا پڑتا ہے۔ لوگ ان کی قدر نہیں کرتے۔ لڑکے ان کا مذاق اُڑاتے ہیں اور لڑکیاں اُن سے پیار نہیں کرتیں۔ شاید آپ سمجھتے ہوں کہ اُستاد بن جانے کے بعد آپ کی شادی نہیں ہوگی اور اگر شادی ہوگئی تو بچہ نہیں ہوگا اور اگر بچہ ہوگیا تو آپ کا گذارہ نہیں چلے گا۔ آپ کو شاید اس بات کی بھی فکر ہو کہ بس میں سفر کرتے ہوئے یا بس کا انتظار کرتے ہوئے، کسی پارٹی یا دعوت میں، کسی دوست یا دشمن کی شادی پر اگر کسی نے آپ سے پوچھ لیا کہ آپ کیا کام کرتے ہیں۔ تو آپ کیا جواب دیں گے۔ شاید آپ سوچتے ہوں کہ اُستاد بن جانے کے بعد ساری عمر آپ کی نظریں اونچی نہیں ہوسکیں گی۔ کچھ شرم کے مارے اور کچھ مطالعہ کی وجہ سے۔ اب اگر صرف یہ کہہ دیا جائے کہ یہ سب خطرات غلط ہیں اور یہ سب افواہیں بے بنیاد تو آپ مانیں گے نہیں۔ آپ کو دلیل سے منوانا ہوگا کیونکہ آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی عورت کے قابو میں اتنی آسانی سے نہیں آتے جتنی کہ دلیل کے۔ بشرطیکہ عورت خود ایک مجسم دلیل نہ بن جائے۔ اب چونکہ ایسی عورتیں اس پیشے میں قریب قریب نایاب ہیں۔ اس لئے کسی اور ہی دلیل کا سہارا لینا پڑے گا۔

آپ کو سب سے بنیادی اعتراض شاید یہی ہوگا کہ اگر آپ اُستاد بن گئے تو آپ کو تنخواہ بہت کم ملے گی۔ لیکن اگر آپ سچ جانیں تو اس اعتراض

کو دور کرنے کے اتنے طریقے ہیں کہ آپ خود بخود مان جائیں گے کہ یہ اعتراض نہیں بلکہ ایک وہم ہے جو آپ کو ہو گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ خود سوچیں کہ کم و بیش کا کیا پیمانہ ہے۔ جو چیز میرے لئے کم ہے ہو سکتا ہے آپ کے لئے ضرورت سے بھی زیادہ ہو۔ سو بنیادی بات ضرورت کی ہے اور ضرورت ایک ایسی چیز ہے جسے ربڑ کی مانند حالات کے مطابق گھٹایا بڑھایا جا سکتا ہے۔ اب اگر آپ اپنی ضروریات کو ضرورت میں تبدیل کر دیں اور پھر اس ضرورت کو اتنا کم کرتے جائیں کہ بہت سی ضروری چیزیں غیر ضروری نظر آنے لگیں تو آپ کی تنخواہ اسی نسبت سے بڑھ جائے گی۔ لہٰذا تنخواہ کی کمی بیشی آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر تنخواہ کم ہے تو کیا ہوا۔ کام بھی تو کم ہے۔ جی ہاں دن میں صرف دو یا تین گھنٹے انٹ سنٹ، جو جی میں آئے ایک خاص رفتار سے بول دینا اور باقی کا سارا وقت دنیا و مافیہا پر فضول بے سر پیر کی بحث کرتے رہنا۔ اس کے سوا ایک عام اُستاد کو اور کیا کرنا پڑتا ہے۔ اجی نہیں۔ کوئی مطالعہ وغیرہ نہیں کرنا پڑتا۔ جو ایک بار پڑھ لیا سو کافی ہے۔ اگر آپ کی ضمیر کی نوک ذرا تیکھی ہو تو یونہی کالج کی طرف روانہ ہونے سے دس منٹ پہلے یا راستہ میں ایک سرسری نظر کسی کتاب یا کاپی پر ڈال لیں۔ پڑھانے کے لئے پڑھنے کی اتنی ضرورت نہیں جتنی چالاکی کی۔ اور یہ چالاکی کچھ دیر کے تجربہ سے خود بخود آ جاتی ہے اور کوئی تیاری نہیں کرنی پڑتی ہے۔ سوائے اس کے کہ رات کو گلے کی مالش ضرور کر یا کروا لینی چاہیئے کیونکہ آجکل نہ جانے کیا رُوجلی ہے کہ جو اُستاد جتنا اونچا بولے اتنا اچھا سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کے نتائج اچھے رہتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ محض آواز کی اونچائی سے لوگوں کو جگائے رکھنا ہی ان کے لئے آخر میں بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ ورنہ آج کل کے لڑکے امتحان کے کمرے میں بھی اُونگھ اونگھ جاتے ہیں اور اگر شروع شروع میں کچھ مطالعے وغیرہ کی ضرورت یا خواہش ہو بھی تو کچھ وقت پا کر خواہش خود بخود دب جائے گی اور ضرورت کو دُور کرنے کے لئے اور کئی طریقے نظر آنے لگیں گے۔ مثلاً وہ لاتعداد کنجیاں اور نوٹ جن سے مارکیٹ اٹی پڑی ہے۔

اور آپ نے یہ تو سُن ہی رکھا ہو گا کہ سال میں چھ مہینے سکول اور کالج بند رہتے ہیں لہٰذا کام کرتے ہوئے بھی آپ کو یوں لگے گا کہ آپ بیکار ہیں یعنی ایک ہی وقت میں آپ دو ذہنی حالتوں کا لطف اُٹھا سکیں گے۔ یہ کیا اتنا کم ہے کہ تنخواہ کی کمی (؟) ہی کھلتی رہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ تنخواہ کم ہے تو آمدنی کے مزید راستے تو کھلے ہیں۔ کالج میں صرف دو تین گھنٹے کام کرنا ہے، مطالعہ آپ کو کرنا نہیں۔ تو باقی وقت میں منمنانے کے علاوہ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں اور شاید آپ جانتے ہی ہیں کہ نوے فیصدی سے زیادہ اُس وقت اُستاد کیا کیا نہیں کرتے۔ ٹیوشن آپ کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے سیدھے ہاتھ نہ ملیں۔ اس صورت میں تھوڑی سی کوشش کرنی پڑے گی۔ مثلاً دیکھا گیا ہے کہ کچھ اُستاد سال کے شروع میں ہی اُن تمام طالبعلموں کی ایک جامع فہرست تیار کر لیتے ہیں جن کے والدین خرچ کرنے کی توفیق رکھتے ہیں اور جو پاس کسی صورت نہیں ہو سکتے۔ پھر ایسے والدین کو دفتر کی معرفت ایسی چٹھیاں لکھوائی جاتی ہیں جنھیں پڑھ کر ان میں دہشت پیدا ہو جائے۔ اگر وہ اس پر سمجھ جائیں تو بہتر۔ ورنہ انھیں بلوا بلوا کر سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سال ضائع کرنے کی بجائے کچھ پیسے ضائع کر دینا زیادہ اچھا ہے۔

اگر آپ اس گھٹیا پن پر آسانی سے اور براہ راست نہیں اُتر سکتے تو نہ سہی۔ آمدنی کے اور بھی تو طریقے ہیں مثلاً ممتحن بن جایئے۔ بے شک اُس کے لئے آپ کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑے گا۔ لیکن سال میں بیسیوں امتحان ہوتے ہیں۔ اگر آپ کا ٹکل پچو لگ گیا تو آپ کے گھر میں پرچوں کے اتنے اونچے اونچے ڈھیر لگے رہیں گے کہ آپ کا گھر کئی ایسے لوگوں کی زیارت گاہ بن جائے گا جنھیں آپ جانتے تک نہیں۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ سالوں کے تجربے کے بعد بیشتر اُستاد پرچے دیکھنے میں اتنا مصروف رہنے لگتے ہیں کہ انھیں اپنی شکل دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی (جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کافی بدشکل ہو جاتے ہیں) آپ کہیں گے کہ ممتحن بننے کے لئے آپ کو جانے کس کس کی کتنی کتنی چاپلوسی کرنی پڑے گی لیکن چاپلوسی تو آخر ہر ایسے کام کے لئے کرنی ہی پڑتی ہے جس سے کچھ پیسے ملیں۔

اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو آپ کچھ ایسی کتابیں لکھ سکتے ہیں جن کے بارے میں آپ بلند بانگ دعویٰ کر سکیں کہ انھیں پڑھ لینے کے بعد کسی طالب علم کو اور کچھ پڑھنے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں اور ایسی کتابیں ہر کوئی لکھ سکتا ہے۔ ورنہ آپ کوئی ایسے دس اُستاد نکال کر دکھایئے جو اس قسم اور اس پائے کے مصنف نہ ہوں۔ اگر یہ بھی نہ ہو پائے تو صبح شام کسی پرائیویٹ کوچنگ کالج میں پڑھایئے اور دن کو اسٹاف روم میں بیٹھ کر ان کالجوں کو ڈگری کی دکانیں کہہ کر اپنی ضمیر کو شانت کیجئے۔

ان سب کے علاوہ آج کل تو کچھ دلیر قسم کے اُستاد اور بھی کئی کام کرنے لگے ہیں جنھیں اب تک اس عظیم پیشہ کی شان کے منافی سمجھا جاتا تھا۔ مثلاً کچھ اُستادوں نے بھینسیں رکھی ہوئی ہیں اور صبح شام دودھ بیچتے ہیں۔ اُستاد ہونے کے ناطے ان کی ساکھ دوسرے لوگوں سے قدرتی طور پر زیادہ ہوتی ہے اور ان کے دودھ کے خلوص پر کسی کو شک نہیں ہوتا۔ اور لوگ اس بات پر بھی ضد نہیں کرتے کہ دودھ ان کی آنکھوں کے سامنے نکالا جائے۔ کچھ ایک گھی کا بیوپار بھی کرتے ہیں۔ کچھ ایک نے کوئلوں کے اسٹال کھول رکھے ہیں۔ کئی بارسوخ اُستادوں نے اپنی بیویوں اور سالیوں کے نام پر بیمہ کی ایجنسیاں لے رکھی ہیں۔ کچھ ایک سود پر روپیہ اُدھار دیتے ہیں۔ ایسے تو کئی ہیں جنھوں نے درزیوں، حجاموں، پان والوں، سبزی فروشوں، موچیوں یا اسی قسم کے اور ایسے کاریگروں کے ساتھ جنھیں کام شروع کرنے کے لئے تھوڑے سے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساجھے داری کرلی ہے اور نتیجۃً خوب مزے میں ہیں۔

وہ زمانہ گیا صاحب جب اُستادوں کا گذارہ صرف تنخواہوں پر ہی چلتا تھا اور کافی مشکل سے چلتا تھا۔ اب تو حالت یہ ہے کہ اگر تنخواہ بالکل نہ ملے تو بھی کئی لوگ نہ صرف اُستاد بننے پر رضامند ہو جائیں بلکہ ضد بھی کریں۔ لیکن آپ کے خلاف سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر آپ اُستاد نہیں بنئے گا تو اور کیا بنئے گا۔ ایکٹر آپ نہیں بن سکتے کہ اس کے لئے شکل و صورت چاہیئے۔ کنٹریکٹر آپ نہیں بن سکتے کہ اس کے لئے پیسہ چاہیئے۔ کنڈکٹر آپ نہیں بن سکتے کہ اس کے لئے گھنٹوں اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکنے کی طاقت چاہیئے۔ ملٹری میں عام طور پر آپ ایسی ڈیل ڈول کے لوگوں کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا۔ کلرک بننا آپ پسند نہیں کریں گے۔ دکان آپ نہیں کھول سکتے کہ اس کے لئے اور باتوں کے علاوہ دکان چاہیئے۔ کسی مقابلے کے امتحان میں آپ نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ پہلے تین بار بیٹھ چکے ہیں۔ آپ کہیں گے اگر ہم اتنے ہی گئے گذرے ہیں۔ تو ہمیں اُستاد کون بنائے گا۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ یہ پیشہ گئے گزرے لوگوں کی واحد اور آخری پناہ بن گیا ہے۔ دوسری قسم کے لوگ یہاں ٹکتے ہی نہیں۔

دراصل آج کل کے اُستادوں کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ میں وہ لوگ جو مندرجہ بالا طریقوں میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ طریقوں کو اپنانے کی وجہ سے تنخواہ یا اس کی کمی بیشی سے بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں وہ جو اپنے آپ کو آخوش استاد کہلوانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے دوسری سب چیزوں سے بے نیاز ہو چکے ہیں یا کم از کم ایسا ہو چکنے کا بہانہ یا دعویٰ کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے اُستادوں کی تعداد اس تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے کہ کچھ خیر خواہان قوم کو خطرہ ہونے لگا ہے کہ استادوں کی قسم سرے سے ختم ہو جائے تو پھر قوم کی عمارت اب کن کندھوں پر کھڑی رہے گی۔ اسی لئے ایک بار پھر آپ سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ اُستاد بن جائیے کیونکہ آپ کا مظلوم سا شہیدانہ چہرہ آپ کی نیم شکستہ کمر، آپ کی سلگتی ہوئی آنکھیں جن پر خواہ مخواہ ذہانت کا گمان ہوتا ہے۔ آپ کا ڈھیلا ڈھالا لباس آپ کی کانپتی چال اور آپ کی رعب دار آواز یعنی زوردار گلا۔ یہ سب خاصیتیں ایسی ہیں کہ اگر آپ نہ بھی بنے تو بھی ساری عمر اُستاد ہی نظر آئیں گے تو پھر کیوں نہ بن ہی جائیں۔

کہانی کی کہانی

سوویت روس کے ایک عظیم ادیب نے روسی زبان میں ایک کہانی لکھی۔ جو بے حد مقبول ہوئی۔ چند سال بعد وہی کہانی روسی زبان سے انگریزی میں ترجمہ ہوئی۔ اور پھر چند سال بعد ایک ہندوستانی ادیب نے اسی انگریزی ترجمہ کو سامنے رکھ کر اپنے نام سے وہی کہانی اُردو میں ترمیم و اضافہ کے ساتھ چھپوا دی۔ اور اس کے چند سال بعد اسی ہندوستانی ادیب کی یہ کہانی پھر روسی زبان میں ترجمہ ہو کر اس کے نام سے سوویت روس میں شائع ہوئی۔

ادبی، تہذیبی اور سیاسی

غیر ملکی لطیفے

سرریلیزم

فرانس کے ایک مشہور سرریلسٹ آرٹسٹ کے گھر میں ایک بار چور گھس آیا۔ خوش قسمتی سے آرٹسٹ نے چور کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور جب پولیس انسپکٹر نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ چور کو پہچان سکتا ہے تو اس نے جلد جلد اس کی تصویر بنا کر پیش کر دی۔ پولیس کے سپاہیوں نے اس تصویر کی مدد سے تفتیش شروع کی اور نتیجے کے طور پر ایک پنجرہ، ایک پیالے میں دو سڑی مچھلیاں، نپولین کا بت گانے والی لڑکیوں کی ایک ٹولی اور ایک پھٹا پرانا کیلنڈر پولیس کی حراست میں تھا۔

شا اور اس کے نقاد

برنارڈ شا کو چند روز تک ایک نقاد مسلسل خط لکھتا رہا جس میں شا کی تحریروں پر کڑی نکتہ چینی ہوتی تھی۔ ایک روز تنگ آ کر شا نے اس نقاد کو خط لکھا۔

"اپنی تحریروں کے بارے میں میری بھی وہی رائے ہے جو آپ کی ہے لیکن لاکھوں پڑھنے والوں کی رائے کے خلاف میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں؟"

ڈاکٹر، مریض اور نقاد

والتیئر نے ایک بار کہا تھا:۔ "ڈاکٹر لوگ ان دواؤں کو جن کے بارے میں وہ بہت کم جانتے ہیں ان امراض کو دور کرنے کے لئے جن کے بارے میں وہ اور بھی کم جانتے ہیں اُن مریضوں کو دیتے ہیں جن کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔"

لیکن درحقیقت والتیئر نے یوں کہا تھا:۔ "نقاد اُن اصولوں کو جن کے بارے میں وہ بہت کم جانتے ہیں، اُن خامیوں کو دور کرنے کے لئے جن کے بارے میں وہ اور بھی کم جانتے ہیں اُن ادیبوں کے لئے تجویز کرتے ہیں جن کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔"

کون سی بات صحیح ہے اس کا فیصلہ تو ڈاکٹر اور نقاد ہی کر سکتے ہیں۔

گھوڑا اور گدھا

وکٹر ہیوگو نے الگزینڈر ڈیوما کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگر ہم دونوں مشترکہ طور پر ایک ناول لکھیں تو وہ دنیا کا عظیم ترین ناول ہوگا۔

ڈیوما نے جواب دیا۔ واہ گھوڑے اور گدھے کا کیا میل۔

وکٹر ہیوگو نے فوراً کہا۔ تم ناول بے شک نہ لکھو لیکن مجھے گھوڑے کا خطاب تو نہ دو۔

صحیح پسند

برنارڈ شا ہمیشہ اپنی پسند کے مطابق چیزیں خریدا کرتے تھے اور کبھی اس معاملہ میں اپنی بیوی سے مشورہ نہ کرتے تھے۔ ایک روز ان کی بیوی نے تنگ آکر ان سے کہا: "آپ ہمیشہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ کیا ہر بار میری پسند غلط ہوتی ہے؟"

"نہیں۔ ایک بار ٹھیک تھی" شا نے کہا۔

"کب؟" بیوی نے چڑ کر کہا۔

"جب شادی کے لئے تم نے میرا انتخاب کیا" شا نے جواب دیا۔

ٹھیک ہے

ایک بار کا ذکر ہے آین سٹاین اپنے سٹڈی روم میں بیٹھے کام کر رہے تھے، ان کی بیوی غصّے کی حالت میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی "یہ نوکر بڑا نمک حرام ہے۔ اسے فوراً نکال باہر کرنا چاہیئے۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے" آین سٹاین نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اس کا نوکر ان کے کمرے میں آیا اور ان کی بیوی کی شکایت کرنے لگا "مالکن بڑی زباں دراز ہوگئی ہے۔ میں اس کا حکم نہیں مان سکتا۔"

"ٹھیک ہے" آین سٹاین نے کہا۔

ان کی بیوی باہر کھڑی سُن رہی تھی۔ وہ انتہائی غصّے میں بولی "آپ تو بس پاگل ہوگئے ہیں"

"ٹھیک ہے" آین سٹاین نے جواب دیا۔

بُری کہانی

مقامی انڈیا کافی ہاؤس میں دو ادیب محوِ گفتگو تھے۔ آہستہ آہستہ گفتگو میں گرمی آگئی اور وہ ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

"کیا بات ہوئی تھی" کسی نے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں" مسٹر اے کہہ رہا تھا کہ تم نے میری کہانی سے بھی زیادہ بُری کہانی کیوں لکھی" اور مسٹر بی نے جواب دیا کہ "جو جی میں آئے کر لو۔ بُری کہانیاں لکھنا صرف تمہارے اجارہ میں نہیں جو چاہے لکھ سکتا ہے۔ اور اس بات پر بحث ہوگئی اور دونوں میں سے کوئی بھی EXISTENCE کا قائل نہ تھا۔ لہٰذا جھگڑا ہوگیا"

خطرناک آدمی

ایک دفعہ شیلی ایک نوجوان خاتون کے ساتھ ایک کشتی میں بیٹھ کر اٹلی کے نزدیک سمندر کی سیر کر رہے تھے۔ جب کشتی ساحل سے ذرا دُور چلی گئی تو شیلی نے اسی خاتون سے کہا "آؤ سمندر میں چھلانگ لگا کر موت کا راز معلوم کریں" اس خاتون نے گھبرا کر کہا "نہیں مجھے بھوک لگی ہے جلد واپس چلو" اور ساحل پر پہنچ کر اپنے دوستوں سے کہا:۔

"شیلی بہت خطرناک آدمی ہے"

خدا جانتا ہے

براؤننگ کے حین حیات میں ہی ان کی شاعری کو مبہم کہنے کا فیشن ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں ایک دفعہ ایک نوجوان لڑکی براؤننگ کے پاس گئی اور کہا: "براؤننگ صاحب! اپنی اس نظم کا مطلب تو مجھے سمجھا دیجئے" براؤننگ نے اپنی نظم کو تین بار غور سے پڑھا اور پھر سر ہلا کر فرمایا: "جب میں نے یہ نظم لکھی تھی تو دو شخص اس کا مطلب سمجھتے تھے۔ خدا اور براؤننگ۔ لیکن اب تو خدا ہی جانتا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔"

ہنری اور ولیم

ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان کو فتح کیا اور ہنری پنجم نے کوئی تین سو سال بعد انگلستان پر حکومت کی۔ کہتے ہیں ایک دفعہ ولیم شیکسپیر کا مشہور قومی ڈراما "ہنری پنجم" لندن کے ایک تھیٹر میں پیش کیا گیا۔ ایک حسین اور نوجوان خاتون ہیرو کی اداکاری سے بہت متاثر ہوئیں اور ہیرو کا پارٹ ادا کرنے والے اداکار کو رات کے نو بجے اپنے عشرت کدے پر آنے کی دعوت دی۔ شیکسپیر بھی پاس ہی سُن رہے تھے وہ اس خاتون کے مکان پر آٹھ بجے ہی پہنچ گئے۔ جب اداکار صاحب تشریف لائے تو ایک کاغذ کے ٹکڑے پر یہ الفاظ لکھ کر بھیجدیئے "ہنری پنجم آگیا ہے" شیکسپیر نے نیچے یہ الفاظ لکھ کر کاغذ واپس بھیج دیا۔ "ولیم ہنری پنجم سے پہلے آیا۔"

کندھے کے سوار

جارج برنارڈ شا نے ایک بار کہا: "شیکسپیر انگریزی ادب کے کندھوں پر کھڑا ہے اور میں شیکسپیر کے کندھوں پر کھڑا ہوں" یہ فقرہ انگلستان کے اور خاص کر برنارڈ شاہ کے عظیم نقاد چیسٹرٹن تک بھی پہنچا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور کہا۔
"ہاں۔ شا صاحب شیکسپیر کے کندھوں پر اس طرح کھڑے ہوئے ہیں کہ تینوں گر گئے ہیں۔"

قحط کی وجہ

جارج برنارڈ شا بہت دُبلے پتلے تھے اور نقاد چیسٹرٹن بہت موٹے تھے ایک بار چیسٹرٹن نے شا سے کہا۔
"اگر کوئی آپ کو دیکھ لے تو یہ سمجھے کہ انگلستان میں قحط پڑا ہوا ہے۔"
شا نے فوراً جواب دیا: "آپ کو دیکھنے کے بعد اس قحط کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں آجائے گی۔"

ازراہِ تہذیب

۳۶-۱۹۳۵ء میں برٹش پارلیمنٹ کے ایک ہندوستانی ممبر مسٹر سکلات والا روس گئے۔ وہاں انھوں نے تھرڈ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے سکریٹری مسٹر ذی ناف سے ملاقات کی۔ مسٹر سکلات والا روسی زبان اور مسٹر ذی ناف انگریزی زبان سے ناآشنا تھے لہٰذا دو ترجمان بھی اس ملاقات میں شامل تھے۔ مسٹر سکلات والا نے گفتگو کا آغاز کیا۔ جب وہ ۲۰ منٹ تک بولتے رہے تو مسٹر ذی ناف نے اپنے سکریٹری سے کہا "یہ کیا کہہ رہے ہیں کچھ تو بتاؤ تاکہ ازراہ تہذیب ہُوں ہاں تو کرتا رہوں۔" سکریٹری نے جواب دیا: "وہ خاموش ہوں تو کچھ آپ کو بتاؤں بھی۔ فی الحال بات کا سر پیر کوئی نہیں ہے۔" اور اس کے بعد مسٹر ذی ناف اور ان کے سکریٹری ڈیڑھ گھنٹے تک خاموشی سے سُنتے رہے جب مسٹر سکلات والا پونے دو گھنٹے بول کر تھک گئے اور قدرتاً چپ ہوگئے تو مسٹر ذی ناف نے اپنے سکریٹری سے کہا: "انھیں کہہ دیجئے کہ میں نے ان کی باتیں سُن لی ہیں اور ان پر غور کروں گا۔"

صلع جگت

● مرزا عصمت اللہ بیگ ● ایک تشریح

ضلع حیدرآباد ، ضلع اورنگ آباد ، ضلع الہ آباد - جی نہیں ـــــ ضلع جگت ایسے ضلع کا نام نہیں ہے۔ لہٰذا نہ اسے ہندوستان کے نقشہ یا جغرافیہ میں تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ۔

ضلع سے میری مُراد ضلع حیدرآباد۔ ضلع اورنگ آباد۔ یا ہندوستان کے کسی خاص ضلع سے نہیں ہے - بلکہ ضلع سے میرا مقصد اس صنعت سے ہے جسے گھٹیا درجہ کے شعراء اپنے شعروں میں اور بڑھیا درجہ کے خوش مذاق لوگ ظرافت پیدا کرنے کے لئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صنعت کا دوسرا نام رعایتِ لفظی بھی ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایسے لفظ استعمال کئے جاتے جن کو دوسرے لفظوں کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ضلع کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے وہ ایک سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے۔ جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے :-

"جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ ہمچشموں پر چشم عنایت چاہئے۔ جج نے آنکھ مار کر کہا کہ یہ عدالت ہے ہم سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ملزم نے کہا کہ یہ تو حضور کا عین انصاف ہے۔ مگر آپ لوگوں کو مجھ سے چشمک ہے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میرے لئے انصاف کی کہیں دوسری آنکھ بھی بند نہ ہو جائے "

یہاں کانا ہم چشم۔ چشم عنایت - ایک آنکھ سے دیکھنا - عین چشمک یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

اس کی دوسری قسم وہ ہے جس میں الفاظ زبردستی کھینچ تان کر بٹھائے جاتے ہیں۔ مثلاً

کسی کنجوس نے ایک ظریف سے پوچھا کہ میں اپنے بچوں کو کونسا علم پڑھاؤں - ظریف نے جواب دیا کہ صرف نہو (یعنی صرف نحو)

جس طرح اکثر لوگ بیت بازی وغیرہ میں اپنا وقت گذارتے ہیں اس طرح بعض رنگین مزاج اور خوش طبع لوگ ضلع بازی میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ جہاں دو آدمی بیٹھے اور ضلع شروع ہو گیا مثلاً کسی صاحب نے حقہ سرکایا اور یاروں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا - چند ضلع کے الفاظ آپ بھی سن لیجئے :-

واہ رے لڑکے تیری جوانی — سر پر آگ بدن میں پانی !
ابھی سے تیری ایسی خو، — منہ سے آئے دودھ کی بو
دمدمے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی — دم کے ہیں یہ دمدمے جب دم نہیں تو کچھ نہیں

ایں گل دیگر شگفت - بندہ ہر دم تازہ رہتا ہے - دل کی کلی کھلی رہتی ہے - اگر کوئی میرے منہ کو آئے تو منہ نالی میں دیدوں - ایسی دھواں دھار تقریر کی کہ سب کے دھوئیں اڑ گئے - وہ منہ لٹکائے ہوئے چپکے سے سٹک گیا - سر پر تو باندھ کر آؤ - اللہ سے لو لگاؤ وغیرہ -

بظاہر ان الفاظ میں تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم ہے کہ ہنستے ہنسانے کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر یہ بات ضرور ہے کہ برمحل کسی گفتگو کے سلسلہ میں ضلع کے الفاظ بٹھا دیئے جائیں تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے۔ اب آپ اس کی چند مثالیں سُنیئے۔

ایک صاحب کسی جوتے والے کی دوکان پر پہنچے۔

دوکان دار :- کیا حکم ہے۔

خریدار :- ایک خوبصورت اور اچھے جوڑے کی ضرورت ہے۔

دوکاندار :- حضور تو نری کا چاہتے ہوں گے۔

خریدار :- مجھے دِصلی کا درکار ہے۔ ذرا خوش رنگ اور مضبوط تلی کا ہو۔

دوکاندار :- حضور کوئی فکر نہ کریں۔ انشاء اللہ ایسے جوتے دوں گا کہ حضور عمر بھر یاد کریں گے۔ ذرا سر اُٹھا کر دیکھئے۔ وہ جوتے جو بالکل حضور کے سر پر دکھائی دے رہے ہیں نہایت خوش رنگ اور مضبوط ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت سستے پڑیں گے پینے فی جوتہ چار روپیہ۔

خریدار :- آپ آپ بے حساب کھانے لگے ہیں پہلے تو آپ چار آنے جوتا کھاتے تھے اور اب آپ دو دو چار چار روپیہ جوتا کھاتے ہیں۔

دوکاندار :- آپ جو فرمائیں آپ خریدار ہم دوکاندار۔ مگر ہم اپنے جوتے زبردستی کسی کے سر نہیں مارتے اگر آپ کو اچھے لگے تو یہ جوتا حاضر ہے۔ ورنہ جہاں آپ کو کم داموں پڑیں وہاں جا کر لے سکتے ہیں۔

ایک حجام کا لڑکا بڑے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے اپنے دفتر کے منتظم پر جرمانہ ٹھونک دیا۔ منتظم صاحب جوش میں بھرے ہوئے اُن کے مکان پہنچے اور کہا کہ سرکار نے تو اُلٹے اُسترے سے میرا سر مونڈ دیا۔ حجام کے لڑکے نے کہا ذرا سوچ کر بات کرو۔ منتظم نے کہا اب اور کیا سوچوں۔ صاف صاف کہتا ہوں۔ پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری داڑھی موچھیں حقے کے پانی سے مونڈھ دیجئے۔

ایک سفید پوش اپنی شیروانی ہاتھ میں لئے واشنگ کمپنی پہنچے تو منیجر صاحب نے پوچھا کیا حکم ہے۔ فرمایا مجھے استری کی ضرورت ہے۔ منیجر نے کہا کہ اس وقت تو ہمارے ہاں کُندی ہو رہی ہے۔

لکھنؤ کے ایک مُشاعرہ میں شاہ نصیر نے ایک غزل نہایت مشکل طرح میں پڑھی اس کا مطلع تھا۔ ؎

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے شہد کی مکھی   رد رج فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا سبحان اللہ کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے کہا حضور یہ مکھی ٹھیک نہیں بیٹھی۔ ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلاتے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا :- جنہیں چاشنیٔ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اُٹھاتے ہیں۔ ہاں جنہیں صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی بھی متلائے گا اور متلیاں بھی آئیں گی۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختنہ کیا اور احباب کو دعوت دی۔ مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا۔ اُستاد ذوق بھی مدعو تھے۔ کھانا کھا کر صحن میں آ بیٹھے سامنے میں میزبان پان لئے ہوئے آئے۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دستِ مبارک سے گلوری کھانا واجب ہے۔ ذوق نے کہا ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پائے۔ ختنے کی ضیافت کی اور خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا ظرافت یہ کہ کھلایا بھی تو خصتی پلاؤ۔

ادب میں جمود

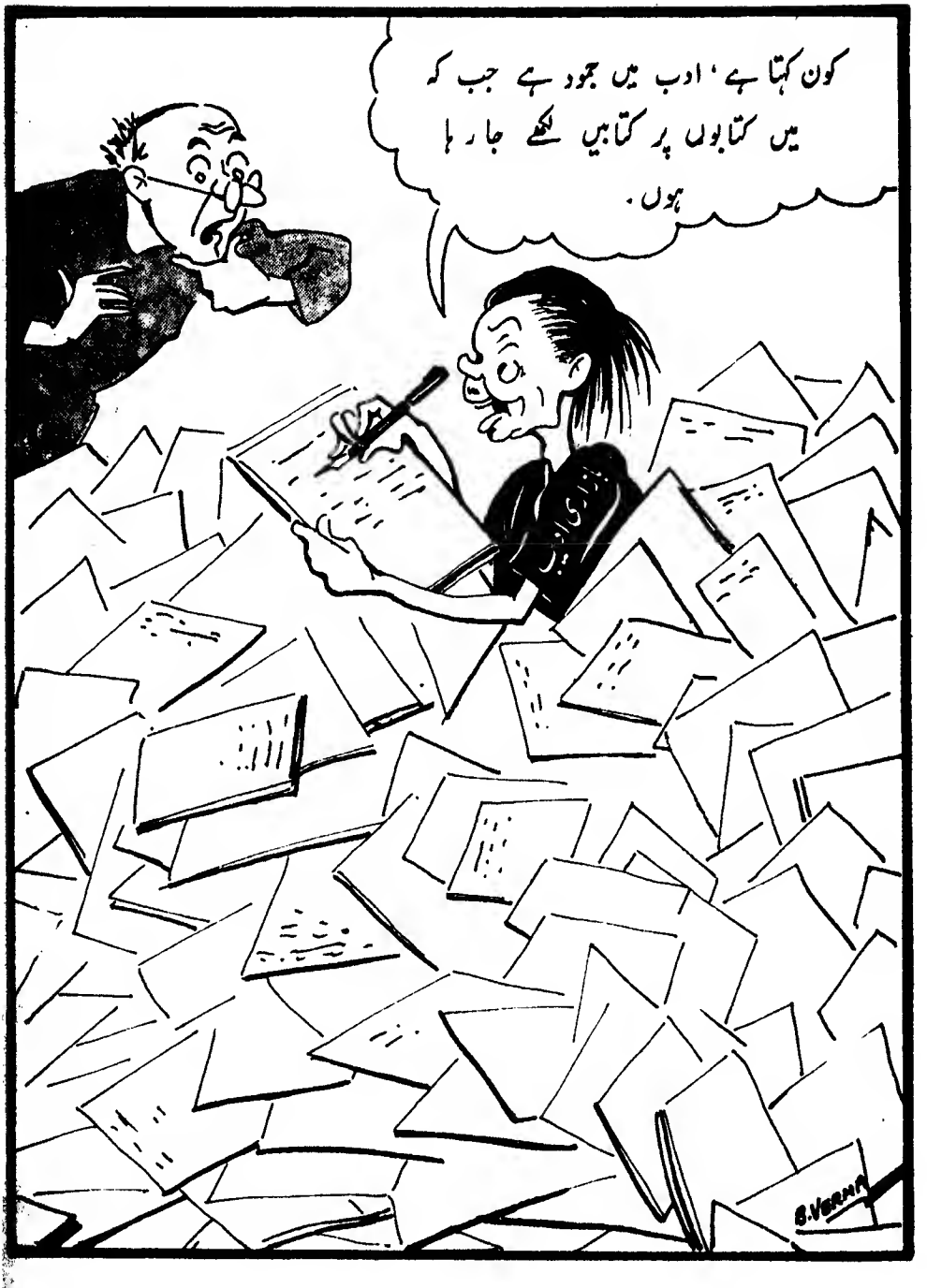
کون کہتا ہے، ادب میں جمود ہے جب کہ
میں کتابوں پر کتابیں لکھے جا رہا
ہوں۔
B.VERMA

نقّاد کی بے چارگی

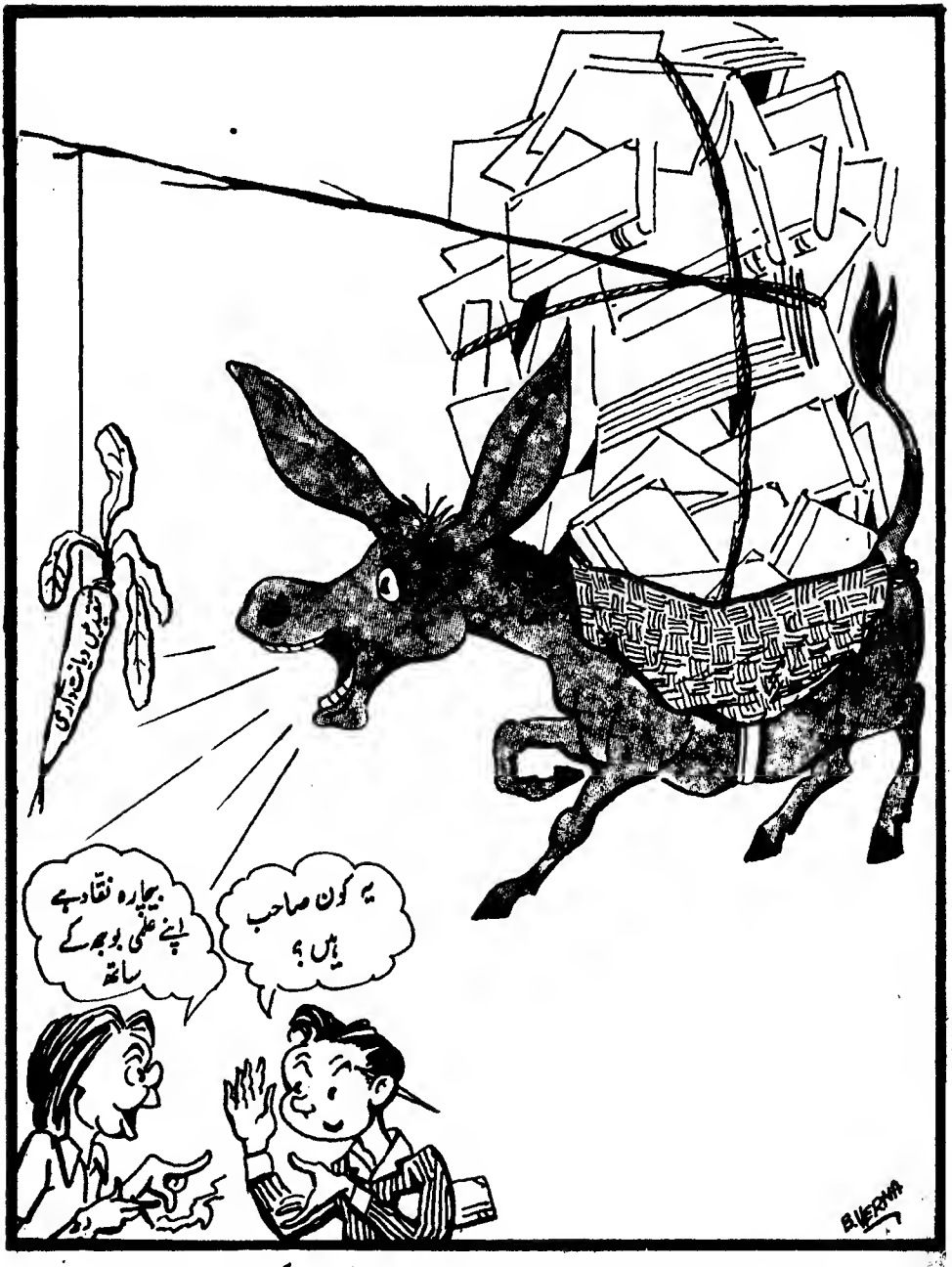

نقاد حضرات ہمیشہ تنقید میں دیانتداری کے لئے چیختے رہتے ہیں جو انھیں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔

ژاں پال سارترے

(ایکٹ ڈرامہ)

ترجمہ: مخمور جالندھری

اک باپ کے دو بیٹے

ژاں پال سارترے اگر ترقی پسند ادیب ہوں تو ہم آسانی سے کہہ دیتے۔ بیچارے کو ریڈ فوبیا ہو گیا ہے۔ اور وہ امریکی نظام پر خواہ مخواہ لٹھ بازی کرتا ہے۔ لیکن آہ! سارترے ترقی پسند نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے یہ ڈرامہ لکھ دیا

کردار:-

لزی

فریڈ

ایک حبشی

جان

جیمز

سینیٹر

قصبے کے لوگ

(اس ناٹک کا منظر امریکہ میں دور جنوب کا ایک قصبہ ہے)

پہلا منظر

دور جنوب کے ایک قصبے کا ایک کمرہ۔ سفید دیواریں تکیہ دار پلنگ۔ دائیں طرف ایک کھڑکی۔ بائیں طرف ایک دروازہ جو غسلخانہ میں کھلتا ہے۔ پچھلی طرف ایک چھوٹا سا عقبی کمرہ جو سامنے کے دروازے تک جاتا ہے۔ پردہ اُٹھنے سے پہلے اسٹیج پر طوفان کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب پردہ اُٹھتا ہے تو لزی تنہا دکھائی دیتی ہے۔ اس نے گھٹنوں تک اونچا لہنگا اور بلاؤز پہن رکھا ہے۔ وہ ایک گرد کش جھاڑو سے کمرہ صاف کر رہی ہے۔ دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے جھجکتی ہے اور غسلخانہ کے دروازے کی طرف دیکھتی ہے گھنٹی پھر بجتی ہے۔ وہ گرد کش جھاڑو کو بجلی کا بٹن دبا کر بند کر دیتی ہے۔ اور غسلخانے کے دروازے کے قریب جاتی ہے۔ اس دروازے کو تھوڑا سا کھولتی ہے—

لزی :- (آہستگی کے ساتھ) دروازہ پہ کوئی ہے۔ باہر مت نکلنا۔ (دروازہ کھولتی ہے۔ پوٹے دروازے میں ایک حبشی کھڑا ہے۔ اس کا قد بہت لمبا ہے۔ اور وہ موٹا تازہ ہے۔ اس کے بال سفید ہیں۔ وہ تن کر کھڑا ہے) کیا ہے؟ تم غلط دروازے پہ آ گئے ہو۔ (وقفہ) اچھا تو بتاؤ۔ تمھیں کیا چاہیئے؟ کیا تمھارے منہ میں زبان نہیں ہے؟

حبشی :- (ملتجیانہ آواز میں) مادام خدا کے لئے۔ خدا کے لئے مادام!

لزی :- خدا کے لئے کیا؟ (وہ اس کو بغور دیکھتی ہے) ذرا ٹھہرو۔ کیا تم ریل گاڑی میں نہیں تھے؟ تم بچ کر نکل گئے تھے نا؟ تمھیں میرا پتہ کیسے معلوم ہوا؟

حبشی :- میں ڈھونڈتا رہا ہوں مادام۔ ہر جگہ تلاش کرتا رہا ہوں۔

(وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے) خدا کے لئے مادام ۔

لزی :۔ اندر مت آؤ ۔ یہاں کوئی ہے ۔ تمھیں کیا چاہیئے ؟

جبشی :۔ کچھ بھی نہیں ۔

لزی :۔ کیا ہے ؟ کیا بات ہے ؟ تمھیں روپیہ چاہیئے ؟

جبشی :۔ (توقف کے بعد) خدا کے لئے مادام ۔۔۔ اس سے کہہ دو کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا ۔

لزی :۔ کس سے کہہ دوں ؟

جبشی :۔ جج سے ۔ مادام اس سے کہہ بھی دو ۔ خدا کے لئے مادام جج سے کہہ دو کہ .....

لزی :۔ سنو ۔ میں اس سے کچھ بھی نہیں کہوں گی ۔ دوسرے لوگوں کے معاملے میں پڑنے کے بغیر ہی میری اپنی مصیبتیں کچھ کم نہیں ہیں ۔ اب جاؤ ۔۔۔

جبشی :۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا ۔

لزی :۔ یقیناً تم نے کچھ بھی نہیں کیا ۔ مگر میں کسی جج کے پاس نہیں جاؤں گی ۔ جج ہوں یا سپاہی ۔۔۔ انھیں دیکھ کر میرا دل بیٹھنے لگتا ہے ۔

جبشی :۔ میری ایک بیوی ہے ۔ بچے ہیں ۔ میں رات بھر چلتا رہا ہوں اب مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا ۔

لزی :۔ اس قصبے سے کہیں دور چلے جاؤ ۔

جبشی :۔ وہ ریل کے ہر راستے پر پہرہ دے رہے ہیں ۔

لزی :۔ کون پہرہ دے رہا ہے ؟

جبشی :۔ سفید لوگ ۔

لزی :۔ کون سے سفید لوگ ؟

جبشی :۔ سبھی سفید لوگ ۔ آپ شاید صبح سے باہر نہیں گئیں ؟

لزی :۔ نہیں ۔

جبشی :۔ سڑک پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہے ۔ کیا بڑھے ، کیا جوان ۔ وہ سب آپس میں باتیں کر رہے ہیں ۔

لزی :۔ کیا مطلب ہے تمھارا ؟

جبشی :۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس وقت تک ادھر ادھر بھاگنا پڑے گا جب تک وہ مجھے پکڑ نہیں لیتے ۔ جب سفید لوگ حبشیوں سے بات کرنے لگتے ہیں تو بس اتنا سمجھ لیجئے کہ کسی کالے آدمی کی موت آئی کہ آئی (توقف) ان سے کہہ دیجئے مادام کہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا ۔ آپ اخبار والے لوگوں سے کہہ دیجئے ۔ شاید وہی آپ کا بیان اخبار میں چھاپ دیں ۔ مادام ان سے کہہ دیجئے ۔۔۔ ان سے کہہ دیجئے نا مادام !

لزی :۔ شور نہ کرو ۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ اندر کوئی ہے ۔ (توقف) اخبار والوں سے کہہ دوں ۔۔۔ تم اگر مر بھی جاؤ تو میں ان سے کبھی کچھ نہ کہوں ۔۔۔ اس وقت میں اپنے آپ کو مشتہر نہیں کرنا چاہتی ۔ (توقف) ان اگر انھوں نے مجھے گواہی دینے کے لئے بلوایا تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں سچی بات کہہ دونگی ۔

جبشی :۔ آپ ان سے کہہ دیں گی کہ میں نے کچھ نہیں کیا ۔

لزی :۔ ہاں ضرور کہہ دوں گی ۔

جبشی :۔ مادام آپ قسم کھائیں کہ آپ ان سے کہہ دیں گی ۔

لزی :۔ ہاں ۔ ہاں ۔

جبشی :۔ خداوند یسوع کی قسم کھائیے کہ آپ ان سے کہہ دینگی مادام ۔

لزی :۔ جہنم میں جاؤ ۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں ان سے کہہ دونگی اور بس اتنا کافی ہے ۔ (توقف) اب جاؤ ۔

جبشی :۔ (دفعتاً گھبرا کر) خدا کے لئے مادام مجھے کہیں چھپا لو ۔

لزی :۔ نہیں چھپاؤں گی ۔

جبشی :۔ کیا آپ مجھے نہیں چھپائیں گی مادام ؟

لزی :۔ تمھیں چھپالوں اور پھر میں ؟ تم زیادہ آگے بڑھ رہے ہو ۔ (وہ دروازہ بند کر دیتی ہے) میرے خدا ! میں کتنی مصیبتوں میں مبتلا ہوں ۔ (وہ غسلخانہ کی طرف دوڑتی ہے) اب تم باہر آسکتے ہو ۔

(فریڈ غسلخانہ سے قمیض پہنے ہوئے باہر نکلتا ہے کار اور ٹائی کے بغیر)

فریڈ :۔ یہ کون تھا ؟

لزی :۔ کوئی بھی تو نہیں تھا ۔

فریڈ :۔ میں سمجھا پولیس آگئی ۔

لزی :۔ پولیس ؟ تو کیا تمھارا بھی پولیس کے ساتھ کوئی جھگڑا ہے ؟

فریڈ :۔ میرا ؟ نہیں تو ۔ میرا خیال تھا کہ تمھارا ضرور ہوگا ۔

لزی :۔ (ناراض ہو کر) خوب ۔ میں نے کبھی کسی کا ایک سینٹ بھی

نہیں چرایا۔

فریڈ :۔ کیا پولیس سے تمھیں کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا ؟

لزی :۔ چوری کے سلسلے میں تو کبھی نہیں ۔

(وہ گرد کش جھاڑو سے پھر کمرہ صاف کرنے لگتی ہے ۔ کانوں کو بہرہ کر دینے والی آواز پیدا ہو رہی ہے)

فریڈ :۔ (آواز سے برہم ہوکر) یہ کیا کر رہی ہو ؟

لزی :۔ (چلا کر بات کرتے ہوئے تاکہ اس کی آواز سُنی جاسکے) کیوں کیا ہوا میری جان؟

فریڈ :۔ (چلاتے ہوئے) تم تو میرے کان بہرے کر دوگی ۔

لزی :۔ بس ایک منٹ کی بات ہے ۔ (توقف) میں تو ایسی ہی ہوں.

فریڈ :۔ (چلاتے ہوئے) کیا کہا ؟

لزی :۔ (چلاتے ہوئے) میں نے کہا کہ میں تو بس ایسی ہی ہوں ۔

فریڈ :۔ (چلاتے ہوئے) کیسی ہو ۔

لزی :۔ (چلاتے ہوئے) بس ایسی ہی ہوں ۔ دوسری صبح کو مجھے اُٹھ کر نہانا اور اس گرد کش جھاڑو سے اس دری کو جھاڑنا پڑتا ہے (وہ گرد کش کو بند کر دیتی ہے)

فریڈ :۔ (پلنگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) جب تک تم دری صاف کر رہی ہو تب تک اس پر چادر ڈال دو ۔

لزی :۔ کیا کہا ؟

فریڈ :۔ پلنگ پر چادر ڈال دو ۔ اس سے گناہ کی بو آ رہی ہے ۔

لزی :۔ گناہ ؟ تم نے یہ لفظ کس سے سیکھا ؟ کیا تم پادری تو نہیں ہو؟

فریڈ :۔ نہیں ۔ تمھیں یہ خیال کیونکر آیا ؟

لزی :۔ تم بولتے تو پادریوں کی طرح ہو ۔ (وہ اس کی طرف دیکھتی ہے) نہیں تم پادری نہیں ہو ۔ تم پادریوں سے زیادہ پاکیزہ ہو ۔ مجھے اپنی ذرا یہ انگوٹھی دکھانا ۔ (تعریفی نگاہ کے ساتھ) اوہ میرے خدا ۔ کیا تم بہت دولت مند ہو ؟

فریڈ :۔ ہاں ۔

لزی :۔ بہت زیادہ امیر ہو؟

فریڈ :۔ ہاں بہت ہی زیادہ ۔

لزی :۔ خوب ۔ (وہ اس کی گردن میں باہیں ڈال دیتی ہے اور اسے اپنے ہونٹ پیش کرتی ہے) کسی کا امیر ہونا بہت اچھی بات ہے ۔ اس سے اعتماد مضبوط ہوتا ہے

(وہ اسے بوسہ نہیں دیتا ۔ ایک لمحہ کے بعد دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے)

فریڈ :۔ پلنگ کو ڈھانپ دو ۔

لزی :۔ اچھا ۔ اچھا ۔ ڈھانپ دوں گی ۔ (وہ پلنگ کو چادر سے ڈھانپ دیتی ہے اور پھر یک بیک ہنسنے لگتی ہے) گناہ کی بو آتی ہے ۔ مجھے تو کبھی اس بات کا خیال بھی نہ آتا ۔ یہ گناہ تمھارا ہی تو ہے (فریڈ ایک قدم آگے اٹھاتا ہے) ہاں ہاں میں جانتی ہوں کہ یہ میرا ہی گناہ ہے ۔ لیکن میرا ضمیر تو گناہوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے ۔ (وہ پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے اور اپنے قریب فریڈ کو بھی بٹھا لیتی ہے) یہاں آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ ۔ دوسری طرف نہ دیکھو ۔ کیا تمھیں مجھ سے ڈر لگتا ہے (فریڈ مجرمانہ انداز میں اسے اپنے سینے سے لگا لیتا ہے) تم تو میری ہڈیاں توڑ رہے ہو ۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے ۔ (فریڈ اُسے چھوڑ دیتا ہے) اوہ میرے خدا تم کس قدر عجیب لڑکے ہو ۔ (توقف) تمھارا نام کیا ہے ؟ بتاؤ بھی ۔ میں تمھارا نام جاننا چاہتی ہوں ۔ وہ مجھے کبھی اپنا آخری نام نہیں بتاتے اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ کیوں نہیں بتاتے ۔ وہ اپنا پہلا نام بتاتے ہیں ۔ تمہیں کہو اگر میں تمھارا نام نہیں جانتی تو میں ایک دوسرے میں تمیز کیونکر کر سکتی ہوں ۔ اپنا نام بتاؤ میری جان!

فریڈ :۔ نہیں میں نہیں بتاؤں گا ۔

لزی :۔ کوئی بات نہیں ۔ تم میرے لئے بے نام ہی رہو گے (وہ اُٹھ کھڑی ہوتی ہے) ٹھہرو ۔ میں ذرا کمرہ صاف کر لوں ۔ (وہ کمرے کے فرنیچر کو مناسب جگہ پر رکھتی ہے) دیکھا، اب کمرہ کتنا صاف ستھرا دکھائی دیتا ہے ۔ میز کے گرد کرسیاں ۔ کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں ۔ اچھا یہ تو بتاؤ تصویروں کی دکان کہاں ہے ؟ میں کچھ تصویریں خریدنا چاہتی ہوں ۔ ایک تصویر تو میرے صندوق میں بھی ہے ۔ بہت ہی اچھی تصویر ہے ۔ اس تصویر کا نام ہے "ٹوٹا ہوا گھڑا" ۔ یہ ایک ننھی سی لڑکی کی تصویر ہے ۔ اور اس کا گھڑا ٹوٹ گیا ہے ۔ یہ ایک فرانسیسی تصویر ہے

فریڈ :۔ کیسا گھڑا ؟

لزی :- میں نہیں جانتی - یہ اُس کا اپنا گھر ا ہوگا - اب میں بوڑھی دادی اماں کی تصویر بنا رہی ہوں گی تاکہ اُس کے مقابلے بڑا اچھی معلوم ہو - اوہ بوڑھی اماں کچھ بُن رہی ہو؟ اپنے پوتے اور پوتیوں سے کوئی کہانی کہہ رہی ہو - میں پردے گرا کر کھڑکیاں کھولتی ہوں - (وہ اُٹھ کر ایسا ہی کرتی ہے) اوہ! کتنی حسین صبح ہے - پورا ایک نیا دن شروع ہو رہا ہے - (وہ انگڑائی لیتی ہے) میں کس قدر تازگی محسوس کر رہی ہوں - یہ ایک تابناک صبح ہے - میں خوب مل مل کے نہائی ہوں اور کل رات میں نے کتنی زوردار محبت کی ہے - میں بہت خوش ہوں - واقعی میں بہت خوش ہوں - آؤ اور میری کھڑکی سے ذرا باہر کا منظر دیکھو - آؤ اور دیکھو - کس قدر حسین منظر ہے - میں کس قدر خوش قسمت ہوں - جب میں اس قصبے میں آئی تو پہلے ہی دن مجھے یہاں کے گنجان آباد محلے میں یہ کمرہ مل گیا - کیا تم یہاں آکر باہر کا منظر نہیں دیکھو گے؟ کیا تم اپنے شہر کو دیکھنا پسند نہیں کرتے -

فریڈ :- دیکھنا پسند کرتا ہوں مگر اپنی کھڑکی سے -

لزی :- صبح صبح کسی حبشی کو دیکھنا بدشگونی تو نہیں؟

فریڈ :- کیوں کیا ہوا؟

لزی :- پٹڑی پر ایک حبشی کھڑا ہے -

فریڈ :- حبشیوں کو دیکھنا ہمیشہ بُری فال ہوتی ہے - یہ حبشی شیطان ہوتے ہیں شیطان - (توقف) کھڑکی بند کردو -

لزی :- تم کمرے میں ہوا نہیں چاہتے -؟

فریڈ :- میں کہتا ہوں کھڑکی بند کردو - بس ٹھیک ہے - پردہ کھینچ دو اور بجلی جلا دو -

لزی :- کیوں کیا حبشیوں کی وجہ سے؟ دھوپ کتنی پیاری ہوتی ہے -

فریڈ :- میں تمہارے کمرے میں دھوپ نہیں چاہتا - میں تمہارے کمرے کو کل رات والی حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں - دھوپ مجھے باہر بستر آسکتی ہے - (وہ اُٹھ کر اُس کے قریب آتا ہے اور اُس کی طرف دیکھتا ہے)

لزی :- کیوں کیا بات ہے؟

فریڈ :- کچھ بھی نہیں - ذرا مجھے میری ٹائی پکڑا دو -

لزی :- بہت اچھا - تمہاری ٹائی غسلخانے میں ہوگی - (وہ اس کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی ہے - فریڈ سرعت کے ساتھ میز کی دراز کھولتا ہے اور کچھ ٹٹولنے لگتا ہے - لزی ٹائی لئے ہوئے آتی ہے) یہ رہی تمہاری ٹائی - ادھر آؤ میں باندھ دوں - ہاں بس یونہی کھڑے رہو - (ٹائی باندھتی ہے) مجھے یہ کبھی کبھار کا بیوپار پسند نہیں - تمھیں کئی نئے چہروں سے واسطہ پڑتا ہے - مجھے تو دو تین باقاعدہ گاہک چاہئیں - ایک سوموار کے لئے - ایک جمعرات کے لئے اور ایک سنیچر کے لئے - میں تمھیں اس لئے بتا رہی ہوں کہ تم نوجوان ہو اور سنجیدہ مزاج ہو - شاید تمھیں میرا یہ خیال پسند آئے - اچھا اب میں کچھ نہ کہوں گی - تم اس کے بارے میں خود سوچو - لو ٹائی تو بندھ گئی - اوہ میرے خدا تم کس قدر خوبصورت ہو - میرے گلفام ذرا بوسہ تو دے - (فریڈ اسے زور سے بھینچ کر بوسہ دیتا ہے اور پھر اُسے دھکا دے کر اپنے سینے سے الگ کر دیتا ہے) اوہ!

فریڈ :- تم چڑیل ہو -

لزی :- پھر پادری کی سی باتیں شروع کر دیں - آخر معاملہ کیا ہے؟

فریڈ :- میں اپنے آپ سے بیزار ہوں -

لزی :- بیزاری کا یہ عجیب اظہار ہے - (توقف) کیا تم خوش نہیں ہو؟

فریڈ :- کس سے خوش نہیں ہوں؟

لزی :- (نقل اُتارتے ہوئے) کس سے خوش نہیں ہوں! تم ایک چھوٹے سے احمق لڑکے ہو -

فریڈ :- اوہ ہاں ——— بہت خوش ہوں - بہت ہی خوش ہوں تمھیں کتنی رقم چاہئیے -

لزی :- میں نے تو تم سے صرف اتنا پوچھا ہے کہ خوش تو ہو ——— تم کیا شائستگی کے ساتھ جواب نہیں دے سکتے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟ کیا میں تمھیں پسند نہیں آئی؟ ——— دیکھو یہ مت کہنا میں تمھیں پسند نہیں آئی -

فریڈ :- چُپ رہو -

لزی :- تم نے مجھے اپنی آغوش میں لیا - زور سے بھینچا اور پھر تم نے نہایت نرم آواز میں مجھ سے کہا تھا کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے -

فریڈ :- تم نے پی رکھی تھی؟

لزی :- نہیں میں نشہ میں نہیں تھی -

فریڈ :- میں کہتا ہوں تم مدہوش تھیں -

لزی :- میں کہتی ہوں کہ میں بالکل نشہ میں نہیں تھی -

فریڈ :- اچھا تو میں نشہ میں تھا - مجھے کوئی بات یاد نہیں -

لزی :- کس قدر افسوس کی بات ہے۔ میں نے غسلخانے میں کپڑے اُتارے اور جب میں باہر آئی تو تم مارے شرم کے سُرخ ہو رہے تھے۔ آیا کچھ یاد۔؟ تمھیں یاد ہوگا میں نے تمھیں اپنا ننھا سا بچہ کہا تھا۔ تم نے روشنی گُل کر دی تھی اور اندھیرے میں مجھ سے محبت کی تھی۔ اس وقت میں نے خیال کیا تھا کہ تمھاری بات کتنی اچھی اور جذباتی ہے۔ کیا تمھیں کچھ بھی یاد نہیں؟

فریڈ :- کچھ بھی نہیں۔

لزی :- اور پھر ہم دونوں نے اپنے آپ کو دو نوزائیدہ بچے خیال کیا تھا ____ یہ بات تو تمھیں یاد ہوگی؟

فریڈ :- میں کہتا ہوں تم چُپ رہو۔ مَرد رات کو جو کچھ کرتا ہے وہ رات کی بات ہوتی ہے۔ صبح کو تمھیں رات کی بات نہیں کرنا چاہئے۔

لزی :- (غصّے میں) مگر میں رات کی بات کرنا پسند کرتی ہوں تمھیں معلوم بھی ہے میں نے بہت حظ اُٹھایا ہے۔

فریڈ :- اچھا تو تم نے بہت حظ اُٹھایا ____ (یہ کہہ کر اُس کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے شانوں پر تھپکی دیتا ہے اور پھر اپنے ہاتھ کی گرفت اُس کی گردن پر ذرا مضبوط کر دیتا ہے) تو کیا تم ہمیشہ جب کسی کو بیوقوف بناتی ہو تو یونہی حظ اُٹھایا کرتی ہو۔؟ (توقف) میں کل کی رات کو بھول چکا ہوں۔ بالکل بھول چکا ہوں۔ مجھے صرف رات کی کلب یاد ہے اور اس کے بعد کی باتیں صرف تمھیں یاد ہیں۔ صرف تمھیں۔ (وہ اس کی گردن کو مروڑتا ہے)

لزی :- یہ کیا کر رہے ہو؟

فریڈ :- میں تمھارا گلا گھونٹ رہا ہوں۔

لزی :- مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔

فریڈ :- تنہا تمھیں تو ہو جسے رات کا قصّہ یاد ہے اور میں اپنی گرفت کو ذرا مضبوط بنا دوں تو پھر اس دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں رہے گا جسے کل کی رات یاد ہوگی ____ (وہ اسے چھوڑ دیتا ہے) بولو تمھیں کیا دوں؟

لزی :- کیا یہ اس لئے پوچھ رہے ہو کہ میرا برتاؤ اچھا نہیں تھا؟ میں اس بات کے لئے کچھ لینا نہیں چاہتی جو اچھی نہ ہو ____

فریڈ :- بکواس بند کرو۔ بولو کیا دوں؟

لزی :- میں پرسوں ہی اس شہر ہی میں آئی ہوں۔ تم میرے پہلے گاہک تھے۔ میں پہلے گاہک سے کچھ نہیں لوں گی محض نیک شگون کے لئے ____!

فریڈ :- مجھے تمھارا عطیہ نہیں چاہئے (وہ میز پر دس ڈالر کا نوٹ رکھ دیتا ہے)

لزی :- مجھے تمھارا پیسہ نہیں چاہئے۔ مگر میں یہ ضرور دیکھنا چاہتی ہوں کہ تمھاری نگاہوں میں میری قیمت کیا ہے ____ ذرا ٹھہرو۔ مجھے اندازہ کرنے دو۔ (وہ نوٹ اُٹھانے سے پہلے آنکھیں بند کرتی ہے) چالیس ڈالر کا نوٹ ہے۔ نہیں یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ دو نوٹ ہوں گے۔ شاید بیس ڈالر ہیں۔ نہیں زیادہ ہیں۔ یہ ضرور چالیس ڈالر سے زیادہ ہوں گے۔ شاید پچاس ہیں۔ نہیں سو ڈالر ہیں (اسی اثنا میں فریڈ بڑی توجہ کے ساتھ لزی کی طرف دیکھتا ہے اور زیرِ لب مُسکراتا ہے) اچھا تو میں اب اپنی آنکھیں کھولتی ہوں۔ (وہ نوٹ کی طرف دیکھتی ہے۔) تم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی؟

فریڈ :- میرا خیال نہیں کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے۔

لزی :- تم جانتے ہو تم نے مجھے کیا دیا ہے؟

فریڈ :- ہاں۔

لزی :- تو اسے واپس لے لو۔ ابھی واپس لے لو۔ (وہ ہاتھ کے اشارے سے انکار کرتی ہے) مجھ ایسی لڑکی ہو اور صرف دس ڈالر کے لئے۔ اسے قبول کرنے سے پہلے تو میں تمھاری موت چاہوں گی۔ تم نے میری ٹانگیں دیکھی تھیں (وہ اُسے اپنی ٹانگیں دکھاتی ہے) تم نے میری چھاتیاں دیکھی تھیں۔ ضرور دیکھی ہوں گی؟ کیا وہ دس ڈالر کی چھاتیاں ہیں۔ اپنے یہ غلیظ ڈالر اُٹھا لو۔ اور اس سے پہلے کہ میرا غصّہ بے قابو ہو جائے۔ یہاں سے نَو دو گیارہ ہو جاؤ۔ دس ڈالر! تم نے مجھے سمجھا کیا ہے۔ تم چاہتے تھے کہ میں تمھیں اپنی زندگی کی کہانی سُناؤں۔ اور آج کی صبح تم اپنے حواس میں نہیں تھے۔ تمھارا پارہ چڑھا ہوا تھا تم مجھ پر حکم چلا رہے تھے جیسے مجھے مہینے کی رقم دے دی ہو۔ یہ صرف دس ڈالروں کے لئے۔ چالیس نہیں۔ تیس نہیں۔ بیس بھی نہیں۔ صرف دس ڈالر۔

فریڈ :- ہاں تم ایسی کسبی کے لئے دس ڈالر بہت ہیں۔

لزی :- کسبی - کسبی - اور تم کیا ہو - میں جاننا چاہتی ہوں کہ تم کیا ہو ؟ تمہاری ماں کس قسم کی عورت ہے کہ اُس نے تمہیں عورت کی عزت کرنا بھی نہیں سکھایا۔

فریڈ :- چپ رہو۔

لزی :- کتیا کے بچے - !

فریڈ :- (پرسکون آواز میں) سُن ری لونڈیا ! ہم لڑکوں سے ہماری ماؤں کے بارے میں کچھ کہنا بہت خطرناک ہوتا ہے - میں تمہاری گردن توڑ دوں گا۔

لزی :- تو پھر دیکھتے کیا ہو آؤ۔

فریڈ :- (پیچھے کی طرف مڑتے ہوئے) بس چپ ہو جاؤ - (لزی گلدان اُٹھا لیتی ہے - جیسے اُس کا بھیجا نکال کر رکھ دے گی -) یہ لو دس ڈالر اور - مگر خدا کے لئے خاموش رہو - نہیں تو میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔

لزی :- تم مجھے جیل بھجواؤ گے - ؟

فریڈ :- ہاں -

لزی :- واقعی جیل بھجواؤ گے ؟

فریڈ :- ہاں -

لزی :- یہ دھونس کسی اور پر جمانا -

فریڈ :- (برہم ہو کر) میں ولسن کلارک کا بیٹا ہوں -

لزی :- کون ولسن کلارک -

فریڈ :- سُنا نہیں میں سینیٹر کلارک کا بیٹا ہوں -

لزی :- خوب ـــــ تو میں ٹرومین کی بیٹی ہوں -

فریڈ :- تم نے ابا سینیٹر کی تصویریں اخباروں میں دیکھی ہوں گی -

لزی :- دیکھی تو ہیں پھر کیا ہوا -

فریڈ :- اِدھر آؤ - (وہ اُسے ایک تصویر دکھاتا ہے) یہ دیکھو میں اس کے پہلو میں کھڑا ہوں - اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا ہوا ہے -

لزی :- (دفعتاً نرم پڑتے ہوئے) یہ تمہارا ابا ہے - (وہ اُس کے ہاتھ سے تصویر چھین لیتی ہے)

فریڈ :- بس اب رہنے دو -

لزی :- کتنا خوبصورت ہے تمہارا ابا - وہ کتنا پیارا اور عقلمند دکھا دیتا ہے - کیا یہ تمہارے گھر کا باغ ہے ؟

فریڈ :- ہاں -

لزی :- اور یہ جو ننھی منھی لڑکیاں ہیں کیا تمہاری بہنیں ہیں (وہ کوئی جواب نہیں دیتا) کیا تمہارا گھر کسی پہاڑی پر ہے - ؟

فریڈ :- ہاں -

لزی :- اچھا صبح جب تم ناشتہ کرتے ہو تو تمہیں اپنی کھڑکی میں سے کیا پورا شہر دکھائی دیتا ہے ؟

فریڈ :- ہاں -

لزی :- کیا تمہیں کھانے پر بلانے کے لئے گھنٹی بجتی ہے ؟

فریڈ :- (مجنونانہ انداز میں) گھڑیال ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا - اچھا یہ تو بتاؤ اگر میرا بھی ایسا ہی کنبہ ہوتا - ایسا ہی گھر ہوتا تو گھر سے باہر رہنے کے لئے مجھے تم بہت کچھ دیتے نا؟ (توقف) مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہاری آماں کی شان میں گستاخی کی - اس وقت میں غصہ میں پاگل ہو رہی تھی - کیا تمہاری اماں اس تصویر میں ہے ؟

فریڈ :- میں تم سے ایک مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میری ماں کا ذکر چھوڑ دو۔

لزی :- اچھا - بہت اچھا - (توقف) میں ایک بات پوچھوں (وہ کوئی جواب نہیں دیتا) اگر تم پیار نہیں کرنا چاہتے تھے تو تم میرے ساتھ میرے گھر میں کیوں آئے ؟ (وہ کوئی جواب نہیں دیتا - لزی ایک سرد آہ بھرتی ہے) خیر چھوڑو - اگر تم باقاعدگی سے یہاں آیا کرو گے تو مجھے تمہارا خوگر بننا ہی پڑے گا - (توقف) (فریڈ آئینہ کے سامنے بالوں میں کنگھی کرتا ہے)

فریڈ :- تم شمال کی رہنے والی ہو نا؟-

لزی :- ہاں -

فریڈ :- نیو یارک کی ؟

لزی :- تمہیں اس سے مطلب ؟

فریڈ :- کل رات تم نیو یارک کی بہت باتیں کر رہی تھیں -

لزی :- نیو یارک کی نوکوئی بھی بات کر سکتا ہے - اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا -

فریڈ :- تم وہاں سے کیوں چلی آئیں ؟

لزی :- پولیس نے ناک میں دم کر دیا تھا۔

فریڈ :- کیا تم کسی مصیبت میں مبتلا تھیں؟

لزی :- بالکل، مجھے تو ہر وقت کوئی نہ کوئی مصیبت گھیرے رہتی ہے۔ بعض آدمی ہوتے ہی ایسے ہیں۔ یہ سانپ دیکھ رہے ہو؟ (وہ اپنے کنگن کی طرف اشارہ کرتی ہے) یہ سب اس کی عنایت ہے۔

فریڈ :- تو پھر تم اسے پہنتی کیوں ہو؟

لزی :- کیا کروں۔ مجبور ہوں۔

فریڈ :- کیا تم وہی لڑکی نہیں ہو حبشی نے جس کی آبرو ریزی کی کوشش کی تھی؟

لزی :- کیا کہا؟

فریڈ :- کیا تم کل صبح چھ بجے کی گاڑی میں سفر نہیں کر رہی تھیں؟

لزی :- ہاں۔

فریڈ :- تو پھر تمھیں وہ لڑکی ہو۔

لزی :- کسی نے میری آبرو ریزی کی کوشش نہیں کی۔ (وہ نہایت تلخ انداز میں ہنستی ہے) میری آبرو ریزی —— میرا مطلب سمجھتے ہو نا؟

فریڈ :- ویبٹر نے کل رات مجھے کلب میں بتایا تھا کہ ....

لزی :- اچھا تو یہ بات ہے —— تمھاری آنکھوں میں کیسی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ تمھارے جذبات بے قابو ہو گئے تھے —— اور تمھارا ابّا کتنا اچھا آدمی ہے۔

فریڈ :- اگر واقعی میں نے یہ سوچا ہوتا کہ تم ایک حبشی کے ساتھ سو چکی ہو تو ....

لزی :- ہاں۔ ہاں کہو۔

فریڈ :- ہمارے ہاں پانچ کالے ملازم ہیں جب ٹیلیفون پر مجھے کوئی بلاتا ہے تو وہ رسیور میرے ہاتھ میں دینے سے پہلے اُسے پونچھتا ہے ——

لزی :- (تعریفی انداز میں سیٹی بجاتے ہوئے) واللہ!

فریڈ :- ہم یہاں حبشیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔ ان سفید فام لڑکیوں کو بھی نہیں جو حبشیوں کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔

لزی :- کوئی بات نہیں —— حبشیوں کے خلاف مجھے کوئی شکایت نہیں۔ مگر میں یہ نہ چاہوں گی کہ وہ مجھے ہاتھ لگائیں۔

فریڈ :- مجھے کیسے اعتبار آئے۔ تم شیطان کی خالہ ہو اور وہ شیطان ہیں۔ (فلیش بیک) اس نے تمھاری آبرو ریزی کی کوشش کی تھی؟

لزی :- تمھیں اس سے مطلب؟

فریڈ :- دو حبشی تمھارے ڈبے میں سوار ہوئے۔ چند لمحوں کے بعد انھوں نے تم پر حملہ کر دیا۔ تم مدد کے لئے پکار اُٹھیں اور چند سفید آدمی موقع پر پہنچ گئے۔ ایک حبشی نے اُسترا نکال لیا۔ مگر ایک سفید آدمی نے ریوالور سے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔ دوسرا حبشی فرار ہو گیا۔ یہی واقعہ پیش آیا تھا نا؟

لزی :- بالکل نہیں —— دونوں حبشی بڑے آرام سے بیٹھے تھے۔ انھوں نے تو میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنے میں چار سفید فام لڑکے ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے دو نے حبشیوں کا مذاق اُڑایا۔ وہ فٹ بال کا میچ جیت کر آرہے تھے اور بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس جگہ سے حبشیوں کی بو آرہی ہے۔ اس لئے انھیں اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دینا چاہئے —— سیاہ فام لڑکوں نے اپنی حفاظت کے لئے پورا زور لگایا۔ آخر کار ایک سفید فام لڑکے کی مُکّہ کی ضرب سے آنکھ سوج گئی۔ اُس نے ریوالور نکالا اور داغ دیا —— بس اتنا سا قصہ ہے۔ دوسرا حبشی چلتی گاڑی سے کود گیا۔

فریڈ :- ہم اُسے جانتے ہیں۔ وہ دیر تک نہیں چھپ سکتا۔ (توقف) تم جج سے یہی قصہ بیان کرو گی؟

لزی :- اس سے تمھیں مطلب۔؟

فریڈ :- مجھے جواب دو۔

لزی :- میں کسی جج کے پاس نہیں جاؤں گی۔

فریڈ :- تمھیں جانا ہوگا۔

لزی :- میں نہیں جاؤں گی۔ میں پولیس کے سپاہیوں سے کوئی واسطہ رکھنا نہیں رکھنا چاہتی

فریڈ :- وہ اگر تمھیں لے جائیں گے۔

لزی :- تو پھر میں اُنھیں وہی کچھ بتا دوں گی جو میں نے دیکھا ہے۔

فریڈ :- تم ایک سفید فام آدمی کے خلاف کالے آدمی کی حمایت

کروگی ؟

لزی :۔ مگر سفید آدمی مجرم ہے ۔

فریڈ :۔ وہ مجرم نہیں ہے ۔

لزی :۔ اس نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے ۔ اس لئے وہ یقیناً مجرم ہے ۔

فریڈ :۔ اُس نے تو صرف ایک حبشی کو گولی کا نشانہ بنایا ہے ۔

لزی :۔ حبشی بھی تو آدمی ہوتا ہے ۔

فریڈ :۔ اگر حبشی کو قتل کرنے پر کوئی مجرم ٹھہرنے لگے تو .....

لزی :۔ حبشی کو قتل کرنے کا سفید آدمی کو کوئی حق نہیں ہے ۔

فریڈ :۔ کیسا حق ۔؟

لزی :۔ یہ کہتی ہوں اُسے کوئی حق نہیں ۔

فریڈ :۔ تم تو امریکیوں کی سی باتیں کر رہی ہو ۔۔ (توقف) وہ مجرم ہے یا نہیں ہے ۔ تم اس چھوکرے کو مجرم قرار نہیں دے سکتیں ۔

لزی :۔ میں کسی کو مجرم قرار نہیں دیتی ۔ اگر وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں نے کیا دیکھا تو میں اصل واقعہ بیان کردوں گی ۔

فریڈ :۔ تمہارا اس حبشی کے ساتھ کیا تعلق ہے ۔۔ ؟ تم اس کی حفاظت کیوں کر رہی ہو ۔ ؟

لزی :۔ میں تو اُسے جانتی بھی نہیں ہوں ۔

فریڈ :۔ تو پھر؟

لزی :۔ مجھے صداقت بیان کرنی چاہئے ۔

فریڈ :۔ صداقت ! جس بیسوا کی قیمت دس ڈالر ہو وہ صداقت بیان کرے گی ۔۔ ! کہیں بھی کوئی صداقت نہیں ہے ۔ یہاں اس شہر میں سفید آدمی ہیں ۔ کالے آدمی ہیں ۔ سترہ ہزار سفید آدمی ہیں اور بیس ہزار کالے آدمی ۔ یہ نیویارک نہیں ہے ۔ ہمیں بولنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے ۔۔ (توقف) ٹامس میرا چچیرا بھائی ہے ۔

لزی :۔ کون ؟

فریڈ :۔ ٹامس ۔۔ وہ لڑکا جس کے ہاتھ میں ریوالور تھا ۔ وہ میرا چچیرا بھائی ہے ۔

لزی :۔ (سمجھتے ہوئے) اوہ !

فریڈ :۔ وہ ایک اچھے گھر کا لڑکا ہے ۔ شاید تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی قیمت نہیں ۔ لیکن وہ ایک بہت ہی اچھے گھر کا لڑکا ہے ۔

لزی :۔ وہ مرد جو ایک بہت ہی اچھے گھر کا ہے ۔ مجھے سینے سے لگاتا ہے ۔ میری آبروریزی کی کوشش کرتا ہے ۔۔۔ میں ایسے اچھے گھر کے مرد سے باز آئی ۔ مجھے کوئی حیرت نہیں اگر تم اس کے رشتہ دار ہو ۔

فریڈ :۔ اس نے تم پر آوازہ کسا ، اس نے ایک حبشی کو گولی کا نشانہ بنایا ، تو اس سے کیا ہوتا ہے ۔ یہ تو ایسی باتیں ہیں جو ہر کوئی سوچے بغیر کیا کرتا ہے ۔ ان باتوں کی حقیقت ہی کیا ہے ۔ ٹامس ایک پیدائشی لیڈر ہے ۔ اور اسی بات کی قیمت ہے ۔۔

لزی :۔ ہوگی ۔۔ مگر حبشی نے کچھ بھی تو نہیں کیا تھا ۔

فریڈ :۔ حبشی تو کسی وقت بھی کوئی بات کر سکتا ہے ۔

لزی :۔ میں کسی بھی آدمی کو پولیس کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ۔

فریڈ :۔ ایک طرف ٹامس ہے اور ایک طرف وہ حبشی ۔۔ تمہیں دونوں میں سے ایک کی قربانی دینا ہوگی ۔۔ اور انتخاب تمہارے بس میں ہے ۔

لزی :۔ اچھا تو یہ بات ہے ۔۔ اب کی تو میں اس معاملہ میں گردن تک دھنس چکی ہوں ۔۔ اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں ۔ (وہ اپنے کنگن کی طرف دیکھتی ہے) یہ حرامی کنگن مجھے کبھی چین لینے ہی نہیں دیتا ۔۔ (کنگن اُتار کر بستر پر پھینک دیتی ہے)

فریڈ :۔ بولو تمہیں کیا چاہئے ؟

لزی :۔ مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے ۔

فریڈ :۔ پانچ سو ڈالر ؟

لزی :۔ ایک کوڑی بھی نہیں ۔

فریڈ :۔ دیکھ لو ۔۔ پھر ایسی کئی راتیں آئیں گی جب تم پانچ ڈالروں سے بھی زیادہ کما سکو گی ۔

لزی :۔ اگر تمہارے جیسے مکھی چوس روز میرے یہاں آنے لگے تو (توقف) اچھا تو بات کہ تم نے مجھے اس لئے انتخاب کیا تھا ۔ ہونہہ یہ بات ہے ۔ تم نے سوچا ہوگا ۔ اس لڑکی کے ساتھ میں اس کے گھر جاؤں گا اور اس کو راہ پر لے آؤں گا ۔۔ ہونہہ یہ بات ہے ۔ تم نے مجھے رات کو فریب تو دے ڈالا ۔۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ میں اسے کس طرح راہ پر لاؤں ۔۔

(توقف) مگر ذرا ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو ـــــ اگر تم رات کو میرے ساتھ اس لئے آئے تھے کہ اپنا یہ معاملہ میرے سامنے رکھو تو تم میرے ساتھ کیوں سوئے؟ ہاں بتاؤ میرے ساتھ کیوں سوئے؟ حرامی کے بچے تو میرے ساتھ کیوں سویا؟

فریڈ :۔ مجھے خود معلوم نہیں ـــــ پانچ سو ڈالر ـــــ بکواس بند کرو۔ اُف میرے خدا۔ پانچ سو ڈالر ـــــ سنو لزی۔ لزی۔ سنو۔ ہوش میں آؤ۔ پانچ سو ڈالر ـــــ

لزی :۔ (سرد آہ بھرتے ہوئے) نہیں مجھے تمہارے پانچ سو ڈالر نہیں چاہئیں۔ میں سچ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں نیویارک چھوڑ جانا چاہتی ہوں۔ میں یہاں سے دور چلی جانا چاہتی ہوں ـــــ (اتنے میں دروازہ پر گھنٹی بجتی ہے ـــــ وہ یک بیک رُک جاتی ہے۔ گھنٹی دوبارہ بجتی ہے) میں دروازہ کھولنا چاہتی ہوں (دروازہ پر زور سے دستک دی جارہی ہے)

ایک آواز :۔ کھولو۔ پولیس۔

لزی :۔ (نرم لہجے میں) پولیس۔ کاش مجھے علم ہوتا ـــ (وہ کنگن اُٹھا کر دوبارہ پہن لیتی ہے۔ (جاؤ اور غسلخانہ میں چھپ جاؤ) (دروازہ پر پھر دستک ہوتی ہے)

آواز :۔ پولیس۔

(فریڈ جہاں کھڑا ہے وہیں کھڑا رہتا ہے۔ لزی اُسے ڈھکیل کر غسلخانہ میں لے جاتی ہے)

آواز :۔ کلارک کیا تم اندر ہی ہو ـــ؟

فریڈ :۔ ہاں میں یہیں ہوں۔

(فریڈ اسے پرے ڈھکیل دیتا ہے۔ وہ اُسے حیرت سے دیکھتی ہے)

لزی :۔ اچھا تو یہ بات ہے۔

(فریڈ دروازہ کھولتا ہے۔ جان اور جیمز داخل ہوتے ہیں اور سامنے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں)

جان :۔ پولیس ـــــ کیا تمہارا نام لزی بیکے ہے؟

لزی :۔ (ان کی طرف دیکھے بغیر فریڈ کو گھورتے ہوئے) تو یہ بات ہے ـــ

جان :۔ جب تم سے کچھ پوچھا جائے تو اس کا جواب دیا کرو۔

لزی :۔ (ہوش میں آکر تلخ لہجے میں) تم میرے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟ (جان اپنا بلّا دکھاتا ہے) اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہ بلّا تو کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔ تم اس لڑکے کے دوست ہو اور مجھے پھسلانے آئے ہو ـــ

(جان اس کی آنکھوں تلے ایک کارڈ بڑھاتا ہے)

جان :۔ اسے پہچانتی ہو؟ ـــ

لزی :۔ (جیمز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اور یہ کون ہے؟

جان :۔ (جیمز سے مخاطب ہو کر) اسے اپنا کارڈ بھی دکھا دو۔

(جیمز جیب سے کارڈ نکالتا ہے۔ لزی اس کارڈ کی طرف دیکھتی ہے اور ایک لفظ کہے بغیر میز کی طرف جاتی ہے اور کچھ کاغذ نکال کر لاتی ہے)

جان :۔ (فریڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیا تم کل رات کو اسے اپنے ساتھ گھر لائی تھیں۔؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس صوبے میں عصمت فروشی منع ہے؟

لزی :۔ کیا تمہیں واقعی اس پر یقین ہے کہ تم کسی دوسرے کے گھر میں دندناتے ہوئے گھس سکتے ہو۔؟ کیا تمہارے پاس وارنٹ ہے؟ کیا تمہیں اس بات کا بھی ڈر نہیں کہ میں تمہیں بڑے گھر پہنچا سکتی ہوں۔

جان :۔ تم ہماری فکر نہ کرو ـــ (توقف) میں نے تم سے سوال کیا تھا کہ کیا کل رات کو تم اسے اپنے ساتھ گھر لائی تھیں؟

لزی :۔ (پولیس افسر کی آمد پر زیادہ سیخ پا ہو چکی ہے اور اس کا انداز گفتگو زیادہ تُرش ہوتا جا رہا ہے) کپڑوں سے کیوں باہر ہوئے جاتے ہو۔ ہاں میں اسے اپنے ساتھ گھر لائی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ مفت محبت کی ہے۔ اس سے میں نے کچھ بھی نہیں لیا ـــــ اب تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو ـــــ!

فریڈ :۔ میز پر تمہیں دس دس ڈالر کے دو نوٹ ملیں گے ـــ وہ میرے ہیں۔

لزی :۔ ثابت کرو کہ وہ تمہارے ہیں؟

فریڈ :۔ (لزی کی طرف دیکھے بغیر) کل صبح یہ میں نے بنک سے

نکلوائے تھے - دوسرے اٹھائیس نوٹ انہی کا سلسلہ وار نمبر رکھتے ہیں - آپ بنک سے ان نمبروں کی پڑتال کر سکتے ہیں۔

لزی :- میں تمھارا غلیظ روپیہ نہیں لوں گی - میں نے تو یہ نوٹ تمھارے مُنہ پر مار دئے تھے -

جان :- اگر یہ روپیہ تم نے نہیں لیا تھا تو تمھاری میز پر کیوں ہے؟

لزی :- (ذرا سی خاموشی کے بعد) اب تو میرے لئے کوئی چارہ نہیں رہا - (وہ فریڈ کی طرف غفلت کے انداز میں دیکھتی ہے اور نرم لہجے میں کہتی ہے - اچھا تو یہ سب کچھ اس بات کے لئے تھا - (دوسروں سے مخاطب ہوکر) ہاں تو بتاؤ تم چاہتے کیا ہو؟

جان :- بیٹھ جاؤ - (فریڈ سے) تم اسے بتا چکے ہو؟ (فریڈ اثبات میں سر ہلاتا ہے) میں تم سے کہہ رہا تھا کہ بیٹھ جاؤ - (وہ اس کو زبردستی ایک کرسی میں دھکیل دیتا ہے) جج نے ٹام کو رہا کرنا منظور کر لیا ہے اگر تم تحریری طور پر ثابت کر دو تم نے تمھاری شہادت کی عبارت کر لی ہے - تم صرف اس پر دستخط کر دو - کل سرکاری طور پر چرچ کی جائے گی - کیا تم پڑھ سکتی ہو؟ (لزی اپنے کندھے جھٹکتی ہے ——— وہ کاغذ اُس کی طرف بڑھاتا ہے - سے پڑھ لو اور پھر دستخط کر دو -

لزی :- یہ تو سراسر جھوٹ ہے -

جان :- تو پھر کیا ہوا ——؟

لزی :- میں دستخط نہیں کروں گی -

فریڈ :- اسے بڑے گھر لے جاؤ —— (لزی سے) اٹھارہ مہینے کی سزا ہوگی -

لزی :- اٹھارہ مہینے — کوئی بات نہیں - جب میں باہر آؤں گی تو تمھاری گردن مار دوں گی -

فریڈ :- جب تک میرے دم میں دم ہے تم ایسا نہیں کر سکو گی - (وہ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں) میرا خیال ہے کہ تم نیویارک تار دو - وہاں سے بھی یہ کچھ کر کے بھاگی ہے -

لزی :- تم تو ایک عورت سے بھی زیادہ کمینے ہو - میرے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ مرد اس قدر کمینہ ہو سکتا ہے -

جان :- جلد فیصلہ کرو - نہیں تو کچہری چلو -

لزی :- لے چلو - میں جھوٹ نہیں بولوں گی -

فریڈ :- تم جھوٹ نہیں بولو گی — اور تم رات بھر کیا کرتی ہو؟ کل رات تم مجھ سے کیا کہہ رہی تھیں — میرے پیارے — میری جان — کیا تم اُس وقت یہ سچ مچ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں - جب تم نے مجھے یہ یقین دلانے کے لئے کہ تمھیں مجھ سے محبت ہے، سرد آہیں بھری تھیں - کیا تم اُس وقت جھوٹ نہیں بول رہی تھیں؟

لزی :- (مقابلے کے انداز میں) شاید تمھاری طبیعت ذرا ٹھکانے نہیں - سنو میں جھوٹ نہیں بولتی رہی ——— (وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں - فریڈ اپنی نگاہیں جھکا لیتا ہے)

فریڈ :- اب اس معاملہ کو ختم بھی کرو — یہ رہا میرا قلم دستخط کر دو -

لزی :- تم سب جہنم میں جاؤ -

(تینوں آدمی گھبرا جاتے ہیں)

فریڈ :- دیکھو بات کہاں تک پہنچی ——— شہر کے بہترین لڑکے کا مستقبل اس کمبخت کے ہاتھ میں ہے -

(فریڈ اٹھ کر کمرے میں ٹہل قدمی کرنے لگتا ہے اور پھر وفعتاً لزی کی طرف پلٹتا ہے) ذرا اس کی طرف تو دیکھو - (تصویر نکال کر لزی کو دکھاتا ہے) تم نے اپنی متعفن زندگی میں بہت سے مرد دیکھے ہوں گے - کیا وہ اس کی طرح کے تھے؟ دس سال کے بعد جب وہ جیل سے باہر آئے گا تو بوڑھا دکھائی دے گا - تم اس بات پر فخر کر سکتی ہو کہ ایک نہایت اچھی بات کر رہی ہو - آج تک تم نے ہماری جیبوں کا روپیہ لیا ہے، اور اس مرتبہ تم نے گلدستہ کا حسین ترین پھول چُنا ہے اور اس کی زندگی پر ڈاکہ ڈال رہی ہو — تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ کیا تمھاری ہڈیاں تک گل سڑ گئی ہیں؟ (وہ اُسے گھٹنوں کے بل جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے) اے فاحشہ - زمین پر اپنی ناک رگڑو -

(کھلے دروازہ میں سے سینٹر کلارک داخل ہوتا ہے)

سینٹر :- چھوڑ دو اسے -

فریڈ :- ابا!

جان :- صبح بخیر سینٹر —

کلارک :- صبح بخیر ——— (لزی سے) اُٹھئے ———

جان :- (لزی سے مخاطب ہوکر) یہ سینٹر کلارک ہیں -

کلارک :- (لزی سے مخاطب ہوکر) صبح بخیر لزی!

لزی :- صبح بخیر۔

کلارک :- ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں ـــــ یہ ایک بہت اچھی بات ہے۔ (وہ لزی کی طرف دیکھتا ہے)۔ اس نوجوان خاتون کو ذرا دیکھیں تو سہی ـــ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سینے میں ایک مہربان دل ہے ـــ

فریڈ :- مگر وہ دستخط تو کرتی نہیں ـــ

کلارک :- وہ راستی پر ہے ـــ تم کسی اختیار کے بغیر اُس کے کمرے میں گھس آئے ہو۔ (جان احتجاج کے طور پر کوئی حرکت کرتا ہے۔

کلارک (اپنی بات پر زور دے کر) تم بلا اختیار اس کے یہاں چلے آئے ہو ـــ تم نے اس کے ساتھ بُرا سلوک کیا ہے۔ اور تم اسے اُس کی ضمیر کے خلاف بولنے پر مجبور کر رہے ہو۔ یہ انتہائی غیر امریکی برتاؤ ہے ـــ میری بچی کیا حبشی نے تمھاری آبرو لوٹی تھی؟

لزی :- نہیں ـــ

کلارک :- بہت خوب ـــ بالکل ٹھیک ـــ ذرا میری طرف دیکھو۔ (وہ لزی کی طرف دیکھتا ہے) مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی ـــ غریب میری! (پھر دوسروں سے مخاطب ہو کر) آؤ لڑکو چلیں۔ اب ہم اور کچھ نہیں کر سکتے ـــ ہمیں بس میکے سے معافی مانگنی چاہئے۔

(فریڈ۔ جان اور جیمز باہر جاتے ہیں)

لزی :- میری کون ہے؟

کلارک :- میری ـــ وہ میری بہن ہے ـــ بدقسمت ٹام کی ماں ـــ ایک بہت ہی پیاری بوڑھی عورت ہے ـــ یہ خبر اُس کو ہلاک کر دے گی ـــ خدا حافظ میری بچی ـــ (وہ جانے لگتا ہے)

لزی :- (گھٹی ہوئی آواز میں) سینیٹر ـــ (وہ اُس کی طرف لپکتی ہے)

کلارک :- کیوں کیا ہے میری بچی؟

لزی :- مجھے بہت افسوس ہے ـــ

کلارک :- تمھیں افسوس کیوں ہو جب تم سچ بول رہی ہو ـــ

لزی :- مجھے افسوس ہے کہ صداقت تو یہ ہونی چاہئے کہ......

کلارک :- ہم میں سے کوئی کچھ نہیں کر سکتا ـــ کسی کو یہ حق نہیں کہ تمھیں جھوٹ بولنے پر مجبور کرے۔ (توقف) نہیں تم اس کے بارے میں کچھ نہ سوچو ـــ

لزی :- کس کے بارے میں۔؟

کلارک :- میری بہن کے بارے میں ـــ وعدہ کرو کہ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچو گی؟

لزی :- میں سوچنے پر مجبور ہوں ـــ

سنیٹر کلارک :- میں تمھاری نگاہوں میں صاف پڑھ سکتا ہوں۔ بتاؤں تم کیا سوچ رہی ہو؟ (لزی کے لہجے کی نقل اُتارتے ہوئے) "اگر میں دستخط کر دوں گی تو سینیٹر اس بوڑھی عورت کے پاس جائے گا اور کہے گا ـــ لزی میکے بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ تمھیں تمھارا بیٹا لوٹا رہی ہے"۔ اور وہ بوڑھی عورت اپنے آنسوؤں میں سے مُسکرائے گی۔ اور وہ کہے گی، "لزی میکے میں کبھی تمھارا نام فراموش نہیں کر سکوں گی"۔ اور میرا کوئی کنبہ نہیں ہے۔ قسمت نے مجھے سماج کے دائرے سے نکال باہر کیا ہے ـــ کم سے کم ایک بوڑھی عورت اپنے بڑے گھر میں بیٹھ کر میرے بارے میں سوچا کرے گی ـــ کم سے کم ایک امریکی عورت تو اپنے دل میں مجھے اپنی بیٹی بنائے گی"۔ غریب لزی ـــ بھول جاؤ ـــ

لزی :- کیا اُس کے بال سفید ہیں؟

کلارک :- برف کی طرح سفید۔ لیکن اس کا چہرہ جوان ہے۔ کاش تم اُسے مسکراتا ہوا دیکھ سکتیں ـــ ....اب وہ پھر کبھی مسکرا نہیں سکے گی ـــ خدا حافظ!

لزی :- کیا تم جا رہے ہو؟

کلارک :- ہاں میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے اُسے جا کر بتانا چاہئے کہ ہمارے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے۔

لزی :- وہ جانتی ہے کہ تم اس وقت کہاں ہو؟

کلارک :- اُس نے تو مجھے بھیجا ہے ـــ

لزی :- میرے خدا ـــ وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے اور تم اس سے جا کر یہ کہو گے کہ میں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس بات کے لئے مجھ سے نفرت کرے گی۔

سینٹر کلارک :۔ (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے) میری غریب بچی ۔ کاش میں تمھاری طرح ہوتا۔

لزی :۔ (متاثر ہوکر) کیا مصیبت ہے ——— موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر کاش حبشی نے میری آبرو لے لی ہوتی۔

سینٹر کلارک :۔ میری غریب بچی۔

لزی :۔ (اُداسی کے ساتھ) تم کس قدر خوش ہوتے۔ اور یہ بات میرے لئے کتنی اہمیت رکھتی۔

سینٹر کلارک :۔ شکریہ (توقف) کاش میں تمھاری مدد کرسکتا۔ (توقف) لیکن صداقت آخر صداقت ہے۔

لزی :۔ (اُداسی کے ساتھ) ہاں ۔ !

سینٹر کلارک :۔ اور صداقت یہ ہے کہ حبشی نے تمھاری آبرو نہیں لوٹی۔

لزی :۔ بالکل درست۔

سینٹر کلارک :۔ ٹھیک ——— (توقف) قدرتاً یہ ایک بنیادی صداقت کا سوال ہے۔

لزی :۔ (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) بنیادی ؟

سینٹر کلارک :۔ ہاں ہاں ۔ میرا مطلب ہے کہ ایک ابتدائی صداقت ہے ۔

لزی :۔ ابتدائی ۔ یعنی یہ صداقت نہیں ہے ؟

سینٹر کلارک :۔ نہیں نہیں حقیقتاً صداقت ہے ..... مگر صداقت کے بھی بہت سے درجے ہوتے ہیں ۔

لزی :۔ تمھارا خیال ہے کہ واقعی حبشی نے میری آبرو لوٹی ہے؟

سینٹر کلارک :۔ نہیں نہیں ۔ اس نے تمھاری آبرو نہیں لوٹی۔ مگر میں ایک بوڑھا آدمی ہوں اور دیر تک زندہ رہا ہوں میں نے بہت سی غلطیاں کی ہیں ۔ لیکن ان آخری سالوں میں میں نے بہت کم غلطیاں کی ہیں ۔ میں اس معاملے کے بارے میں تم سے ذرا مختلف رنگ میں سوچتا ہوں ۔

لزی :۔ کیا مطلب ہے تمھارا ؟

سینٹر کلارک :۔ میں تمھیں کس طرح سمجھاؤں ۔ سنو آؤ ہم یہ خیال کریں کہ اس دروازے سے چچا سام اندر داخل ہوتا ہے ۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ وہ تم سے کیا کہے گا۔

لزی :۔ (خوفزدہ ہوکر) میرا خیال نہیں کہ وہ مجھ سے بہت سی باتیں کہے گا۔

سینٹر :۔ کیا تم کمیونسٹ ہو ؟

لزی :۔ عجیب خیال تمھیں سوجھا ہے ۔ میں کمیونسٹ نہیں ہوں ۔

سینٹر :۔ پھر تو وہ تم سے بہت سی باتیں کہے گا ۔ "لزی تمھیں میرے دو بیٹوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا ۔ اُن میں سے ایک کو مٹ جانا ہے ۔ ایسے معاملہ میں کوئی کیا کرے ۔ ؟ تمھیں دونوں میں سے ایک اچھا ہے اُسے اپنے پاس رکھنا ہوگا ۔ اچھا تو آؤ ہم فیصلہ کریں ان دونوں میں کون سا بہتر ہے ——— کیا ہم فیصلہ کریں ؟

لزی :۔ ضرور ۔ ضرور ۔

:۔ لزی تم جس حبشی کو بچا رہی ہو ۔ اس کا کیا فائدہ؟ خدا جانے وہ کہاں پیدا ہوا؟ میں نے اسے کھلایا پلایا ۔ اور اس کے عوض میں وہ میرے لئے کیا کرتا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں ۔ وہ کام نہیں کرتا ہے ۔ سارا دن گھومتا ہے اور گاتا ہے ۔ وہ بھڑکیلے سوٹ اور رنگ دار نکٹائیاں خریدتا ہے ۔ وہ میرا بیٹا ہے ۔ میں اس اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتا ہوں ۔ لیکن میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ کیا وہ انسانوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے ؟ اگر وہ مر بھی جائے تو مجھے ذرّہ بھر اس کا افسوس نہ ہوگا ۔

لزی :۔ تم کتنی اچھی تقریر کرتے ہو!

سینٹر :۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) میرا دوسرا بیٹا ٹامس ہے ۔ اس نے ایک کالے آدمی کو قتل کر دیا ہے ۔ یہ ایک بہت بُری بات ہے ۔ لیکن مجھے اس کی ضرورت ہے ۔ وہ سو فیصدی امریکی ہے ۔ وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں تعلیم پا چکا ہے ۔ وہ ایک افسر ہے اور مجھے افسروں کی ضرورت ہے ۔ وہ اپنی فیکٹری میں دو ہزار آدمی ملازم رکھتا ہے ۔ اگر وہ مر جائے گا تو دو ہزار آدمی بیکار ہو جائیں گے ۔ وہ لوگوں کا رہنما ہے ۔ وہ یہودیوں کمیونزم اور مزدور سبھاؤں کے خلاف ایک ٹھوس چٹان ہے اس کا فرض ہے کہ وہ زندہ رہے ——— اور تمھارا فرض ہے کہ تم اُس کی جان بچاؤ ۔ بس اتنی سی بات ہے ۔ اور اب تم کیا کرنا چاہتی ہو، اس کا انتخاب کرلو ۔

لزی :۔ تم کس خوبصورتی کے ساتھ تقریر کرتے ہو ۔ !

سینیٹر :۔ تو پھر انتخاب کرو۔
لزی :۔ (اُچھلتے ہوئے) کیا کہا۔؟ اوہ ہاں ———— (توقف) تم نے میرے ذہن میں بہت سی باتیں گڈ مڈ کر دی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں کہاں ہوں۔
سینیٹر :۔ لزی میری طرف دیکھو ——— کیا تمھیں مجھ پر بھروسہ ہے؟
لزی :۔ ہاں — ہاں۔
سینیٹر :۔ تمھارا کیا خیال ہے۔؟ میں تم سے کوئی غلط بات کرنے کے لئے کہوں گا۔؟
لزی :۔ نہیں۔ سینیٹر
سینیٹر :۔ تو پھر تمھیں دستخط کرنا چاہئیں۔ یہ رہا میرا قلم۔
لزی :۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ وہ اس بات کے لئے مجھ سے خوش ہو گی؟
سینیٹر :۔ کون؟
لزی :۔ تمھاری بہن۔
سینیٹر :۔ وہ تم سے بیٹی کی طرح محبت کرے گی۔
لزی :۔ شاید وہ مجھے پھول بھیجے۔؟
سینیٹر :۔ ہو سکتا ہے۔
لزی :۔ شاید وہ میرے لئے تصویر بھیجے۔ جس کے نیچے اس کے دستخط ہوں۔
سینیٹر :۔ ممکن ہے۔
لزی :۔ میں اس تصویر کو دیوار پر ٹانگ دوں گی۔ (توقف) (وہ کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے) کتنا زبردست گھوٹالہ ہوا ہے۔ (میز کے قریب آتے ہوئے) اگر میں دستخط کر دوں تو تم حبشی کے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔؟
سینیٹر :۔ حبشی ——— چھوڑو بھی (وہ اس کو کندھوں سے پکڑ لیتا ہے) اگر تم دستخط کر دو گی تو سارا شہر تمھیں اپنی بیٹی بنالے گا پورا شہر۔ شہر کے سبھی لوگ۔
لزی :۔ لیکن ....
سینیٹر :۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ سارا شہر غلطی کر سکتا ہے۔؟ سارا شہر جس میں پادری ہیں، جج ہیں، ڈاکٹر ہیں، وکیل ہیں، مصوّر ہیں، رئیس بلدیہ ہے اور شہر کے مشیر ہیں اور تمام خیراتی ادارے ہیں۔ کیا تم واقعی یہ خیال کرتی ہو؟
لزی :۔ نہیں۔ نہیں۔
(فریڈ۔ جان اور جیمز داخل ہوتے ہیں اور دروازہ میں کھڑے رہتے ہیں۔)
سینیٹر :۔ لاؤ مجھے اپنا ہاتھ دو (وہ اسے دستخط کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے) شاباش لزی۔ میں اپنے بھانجے اور اپنی بہن کی جانب سے تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اپنے شہر کے تیرہ ہزار سفید آدمیوں کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ چچا سام اور امریکی قوم کی جانب سے میں جس کا نمائندہ ہوں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں تم سے پھر ملوں گا۔ میں تو ابھی ایک دوسرے کو بہت کچھ جاننا ہے۔ آؤ لڑکو چلیں۔ (وہ باہر نکل جاتا ہے)
فریڈ :۔ خدا حافظ لزی۔!
لزی :۔ خدا حافظ! (وہ چلے جاتے ہیں۔ لزی پژمردہ سی رہتی ہے اور پھر دفعتاً دروازے کی طرف بھاگتی ہے) سینیٹر، سینیٹر لوٹ آؤ۔ اس کاغذ کو پھاڑ دو سینیٹر۔ اوہ۔ (دوبارہ کمرے میں آتی ہے اور برقی جھاڑو اٹھاتی ہے) چچا سام — امریکی قوم! (بجلی کا بٹن دبا کر زور سے جھاڑو دینے لگتی ہے)

پردہ گرتا ہے

دوسرا منظر

(وہی منظر ہے ——— بارہ گھنٹوں کے بعد — روشنی ہو رہی ہے۔ کھڑکیوں کے باہر تاریکی ہے۔ باہر شور ہے جو لحظہ لحظہ بڑھ رہا ہے۔ کھڑکی میں حبشی نمودار ہوتا ہے۔ کھڑکی پر چڑھتا ہے اور کمرے میں کود جاتا ہے۔ اور ابھی کمرے کے عین بیچوں بیچ پہنچتا ہے کہ دروازے کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ پردے کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ لزی غسلخانے سے باہر نکلتی ہے۔ باہر کے دروازے تک جاتی ہے اور اسے کھول دیتی ہے)
لزی :۔ اندر آجاؤ ——— (سینیٹر داخل ہوتا ہے) کہو کیا بات ہے؟

سینٹر :۔ ٹامس اس وقت اپنی اماں کے بازوؤں میں ہے میں اس کی جانب سے تمھارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔
لزی :۔ کیا وہ خوش ہے ؟
سینٹر :۔ بہت خوش ہے۔
لزی :۔ تشریف رکھئے۔
سینٹر :۔ شکریہ۔
لزی :۔ اس نے آنسو تو نہیں بہائے ؟
سینٹر :۔ آنسو ۔ وہ کیوں آنسو بہاتی وہ ایک جیالی عورت ہے۔
لزی :۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔
سینٹر :۔ وہ تو بات کرنے کا ایک ڈھنگ تھا۔
لزی :۔ اُسے اس بات کی توقع ہی نہیں ہوگی۔ کیا تھی ؟ وہ سوچتی ہوگی کہ میں حبشی کی حمایت کروں گی۔
سینٹر :۔ اس نے سارا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔
لزی :۔ کیا وہ خیال کرتی ہے کہ میں نے اچھا کام کیا ہے ؟
سینٹر :۔ اس کا خیال ہے کہ تم نے صحیح بات کی ہے۔
لزی :۔ اوہ ـــــ
سینٹر :۔ وہ امید کرتی ہے کہ تم ہمیشہ صحیح بات کیا کروگی۔
لزی :۔ خوب۔
سینٹر :۔ میری طرف دیکھو لزی ۔ (اسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہے) تم ہمیشہ صحیح بات کیا کروگی نا ؟ ۔ تم اُسے ناامید تو نہیں کروگی ؟
لزی :۔ گھبراؤ نہیں میں وعدے پر قائم رہوں گی (توقف) باہر یہ شور کیسا ہے ؟
سینٹر :۔ کچھ بھی تو نہیں۔
لزی :۔ مجھ سے اب یہ شور زیادہ برداشت نہیں ہوتا (وہ کھڑکی کے قریب جاتی ہے) سینٹر!
سینٹر :۔ کیا ہے میری بچی ؟ ۔
لزی :۔ کیا تمھیں یقین ہے کہ ہم نے کوئی غلطی نہیں کی ؟ کیا میں نے واقعی صحیح بات کی ہے ؟
سینٹر :۔ مجھے تو قطعی یقین ہے۔

(باہر شور اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے)

لزی :۔ میں خود نہیں جانتی ۔ تم نے میرے خیال کو اُلجھا دیا ہے۔ تم میرے لئے زیادہ تیزی کے ساتھ سوچتے ہو۔ کیا وقت ہوگا ؟
سینٹر :۔ گیارہ بجے ہیں۔
لزی :۔ صبح ہونے میں چھ گھنٹے باقی ہیں۔ میں آج رات سو نہ سکوں گی۔ (توقف) یہ راتیں دنوں کی نسبت زیادہ گرم ہیں۔ (توقف) اس حبشی کا کیا ہوگا ؟
سینٹر :۔ کس حبشی کا ؟ اچھا اچھا ۔ وہ اس حبشی کو ڈھونڈھ رہے ہیں۔
لزی :۔ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے ۔ ؟ اگر انھوں نے اسے پکڑ لیا ۔ (سینٹر کندھے جھٹکتا ہے۔ شور اور زیادہ بلند ہو جاتا ہے ۔ لزی کھڑکی کے قریب جاتی ہے) یہ شور کیسا ہے! لوگ کتے اور ٹارچیں لئے ہوئے ہیں۔ کیا یہ مشعلوں کا جلوس ہے ؟ مجھے بتاؤ سینٹر یہ سب کیا ہے ؟ مجھے بتاؤ وہ کیا کر رہے ہیں ؟
سینٹر :۔ (اپنی جیب سے لفافہ نکالتے ہوئے) میری بہن نے مجھ سے کہا ہے کہ میں یہ تمھیں دے دوں۔
لزی :۔ اس نے مجھے خط لکھا ہے ۔ (وہ لفافہ چاک کرتی ہے۔ اس لفافہ میں ایک سو ڈالر کا نوٹ ہے ۔ وہ لفافہ میں خط تلاش کرتی ہے اور اسے خط نہیں ملتا) وہ نوٹ کو توڑ مروڑ کر پھینک دیتی ہے ۔ اُس کی آواز بدل جاتی ہے) سو ڈالر ۔ تمھیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ تمھارے بیٹے نے پانچ سو ڈالروں کی پیش کش کی تھی تم نے کافی رقم بچالی ہے
سینٹر :۔ میری بچی ......
لزی :۔ تم اپنی بہن کا شکریہ ادا کرو ۔ اس سے جا کے کہنا کہ میں نے لپ اسٹک کو اس نوٹ پر ترجیح دی ہوتی ۔ کاش وہ مجھے کوئی چیز چن کر بھیج دیتی ۔ (وہ نوٹ کو دور پھینک دیتی ہے) خیال ہی کی قیمت ہوتی ہے ۔ ۔ کیا نہیں ؟ (توقف) تم نے مجھے صفائی کے ساتھ بے وقوف بنایا ۔ (توقف ۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں ۔ سینٹر اس کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے۔
سینٹر :۔ لزی ۔ آؤ ہم آرام سے باتیں کریں ۔ تم ایک اخلاقی بحران سے گذر رہی ہو اور تمھیں میری مدد کی ضرورت ہے۔
لزی :۔ مجھے اسکاچ وسکی کا ایک بڑا جام چاہئے ۔ مگر مجھے توقع

ہے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ جائیں گے۔

سینٹر :۔ تم جانتی ہو کہ تم خوبصورت ہو۔ تم میں ایک ایسی بات باقی ہے کہ جس کو تمھاری بداعتدالیوں نے بھی تباہ نہیں کیا ہے۔ ہاں ۔ ہاں۔ ضرور تم میں کوئی بات ہے ۔ (وہ اس کی پیٹھ سہلاتا ہے ۔ وہ ناک بھوں چڑھاتی ہے اور اسے اپنی پیٹھ سہلانے دیتی ہے) میں پھر آؤں گا ۔ مجھے باہر تک چھوڑ کر آنے کی تکلیف گوارا نہ کرو۔

(وہ باہر چلا جاتا ہے ۔ لزی وہیں کی وہیں بیٹھی رہتی ہے۔ وہ نوٹ کو دوبارہ اُٹھاتی ہے ۔ ایک دفعہ اسے پھر مروڑتی ہے اور باہر پھینک دیتی ہے ۔ اور پھر وہ کرسی میں دھنس کر زور زور سے رونے لگتی ہے ۔ باہر کا شور قریب آرہا ہے اور گولی چلنے کی آواز آتی ہے ۔ حبشی پردے کے پیچھے سے باہر آتا ہے ۔ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ وہ سر اُٹھاتی ہے اور چیخ اُٹھتی ہے)

لزی :۔ آہ ـــــ (توقف) مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے ـــ مجھے یقین تھا ۔ تم اندر کیسے آئے ؟

حبشی :۔ کھڑکی کے راستہ سے ۔

لزی :۔ تمھیں کیا چاہئے ؟

حبشی :۔ مجھے چھپالو ۔

لزی :۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ .....

حبشی :۔ مادام تم اُن کا شور سن رہی ہو ؟

لزی :۔ ہاں !

حبشی :۔ شکار شروع ہو چکا ہے ـــ

لزی :۔ کیسا شکار ؟

حبشی :۔ آدمی کا شکار ۔

لزی :۔ آہ ـــ (ایک طویل وقفہ) کیا تمھیں یقین ہے کہ انھوں نے تمھیں نہیں دیکھا ؟

حبشی :۔ ہاں ۔

لزی :۔ اگر وہ تمھیں پکڑ لیں گے تو تمھارے ساتھ کیا سلوک کریں گے ۔ ؟

حبشی :۔ گیسولین !

لزی :۔ کیا کہا ؟

حبشی :۔ گیسولین (وہ ایک بہت ہی مؤثر اشارہ کرتا ہے) وہ اس میں آگ لگا دیتے ہیں اور آدمی دھڑا دھڑ جلنے لگتا ہے ۔

لزی :۔ میں سمجھی ـــ بیٹھ جاؤ ـــ (حبشی خود کو ایک کرسی میں گرا دیتا ہے) تم میرے پاس آئے ہو ـــ کیا تم میرا کبھی پیچھا چھوڑو گے بھی ؟ (وہ اس کی طرف دھکی کے انداز میں بڑھتی ہے) مجھے مصیبت سے نفرت ہے ـــ سمجھے (وہ اپنا پاؤں زمین پر مارتی ہے) نفرت کرتی ہوں نفرت ـــ نفرت ـــ !

حبشی :۔ ان کا خیال ہے مادام کہ میں نے آپ کو ضرر پہنچایا ہے ؟

لزی :۔ تو پھر ؟

حبشی :۔ اس لئے وہ مجھے یہاں ڈھونڈھنے نہیں آئیں گے ۔

لزی :۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ وہ تمھاری تلاش کیوں کر رہے ہیں ؟

حبشی :۔ اس لئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے تمھیں گزند پہنچایا ہے ۔

لزی :۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہ بات ان سے کس نے کہی ہے ۔ ؟

حبشی :۔ نہیں مادام !

لزی :۔ یہ بات میں نے انھیں بتائی ہے ۔ (طویل توقف ـــ حبشی اس کی طرف دیکھتا ہے)

حبشی :۔ مادام آپ نے ایسا کیوں کیا ؟ آپ نے ایسا کیوں کیا مادام ؟

لزی :۔ یہی سوال تو میں اپنے آپ سے کر رہی ہوں ۔

حبشی :۔ وہ مجھ پر ذرا سا ترس بھی نہیں کھائیں گے ۔ وہ میری آنکھوں پر کوڑے برسائیں گے ۔ وہ مجھ پر گیسولین کے کنستر اُنڈیل دیں گے مادام ! آپ نے ایسا کیوں کیا ؟ میں نے آپ کا کچھ بھی تو نہیں بگاڑا تھا ۔

لزی :۔ تم نے میرا بہت کچھ بگاڑا ہے ـــ تم میری گردن کیوں نہیں توڑ دیتے ـــ ؟

حبشی :۔ وہ اکثر لوگوں کو ایسی باتیں کہنے پر مجبور کر دیتے ہیں جو وہ سوچتے بھی نہیں ۔

لزی :۔ ہاں ـــ اور اکثر ـــ اور جب وہ کوئی بات نہیں کرتا تو ان کے خیالات کو خوبصورت کہانیوں کے ذریعے اُبھار دیتے ہیں ۔ (توقف) اچھا تو تم میری گردن نہیں توڑو گے ۔ ؟ تم نیک آدمی ہو ۔

(توقف) میں تمھیں کل رات تک یہاں چھپائے رکھوں گی۔ (وہ آگے قدم اُٹھاتا ہے۔ نہیں مجھے ہاتھ نہیں لگاؤ۔ مجھے کالے آدمی پسند نہیں۔ (شور قریب تر آتا جا رہا ہے۔) وہ اور بھی نزدیک آگئے ہیں۔ (وہ روشنی گل کر دیتی ہے) اور کھڑکی کے قریب جا کر پردہ ہٹا کر دیکھتی ہے) اب تو ہم پھنس گئے۔!

حبشی :۔ وہ کیا کر رہے ہیں؟

لزی :۔ ہر گلی کے نکڑ پر ایک پہرہ دار کھڑا ہے۔ اور وہ ہر ایک مکان کی تلاشی لے رہے ہیں۔ کیا تمھیں اسی گھڑی میرے گھر آنا تھا۔ تمھیں ضرور کسی نے اس گلی میں داخل ہوتے دیکھ لیا ہوگا۔ (وہ پھر نیچے سڑک پر جھانک کر دیکھتی ہے) اب ہماری باری ہے وہ سیڑھیاں چڑھ رہے ہیں۔

حبشی :۔ وہ کتنے ہیں؟

لزی :۔ پانچ یا چھ ہیں۔ باقی نیچے انتظار کر رہے ہیں۔ (وہ پھر اس کے قریب آجاتی ہے) تم کانپ کیوں رہے ہو؟ خدا کے لیے اس طرح کانپنا بند کر دو۔ (توقف) وہ اپنا کنگن اُتار کر زمین پر پھینک دیتی ہے اور اُسے پاؤں سے کچلنے لگتی ہے) تم نے اچھا کیا یہاں چلے آئے۔ (وہ اُٹھ کر پھر کھڑکی کے قریب جاتی ہے) آرام سے بیٹھے رہو۔ اگر تم باہر نکلے تو دونوں کی خیر نہیں۔

حبشی :۔ چھت پر چلا جاؤں؟

لزی :۔ چاندنی رات ہے۔ وہ تمھارے بدن کو چھلنی بنا دیں گے (توقف) ذرا ٹھہرو۔ انھیں ابھی دو منزلوں کی تلاشی لینی ہوگی پھر وہ یہاں تک پہنچیں گے۔ (طویل توقف)۔ (وہ کمرے میں ٹہلنے لگتی ہے۔ حبشی کرسی میں سکڑا سمٹا بیٹھا ہے) کیا تمھارے پاس پستول ہے؟

حبشی :۔ نہیں۔

لزی :۔ خوب۔ (وہ سوٹ کیس سے ریوالور نکالتی ہے)

حبشی :۔ مادام آپ کیا کرنا چاہتی ہیں؟

لزی :۔ میں دروازہ کھول کر اُن سے کہنا چاہتی ہوں کہ اندر آجاؤ۔ انھوں نے پچیس سال تک مجھے احمق بنایا ہے سفید بالوں والی مائیں! ہیرو۔ چچا سام! امریکی قوم! اب میں بھی ہوں۔ اب وہ مجھے جھانسہ نہیں دے پائیں گے۔ میں دروازہ کھول دوں گی اور کہوں گی،۔ تمھارا شکاری رہا۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ مجھ سے زبردستی ایک تحریر پر دستخط کرا لیے گئے ہیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس شخص نے کوئی جرم نہیں کیا۔

حبشی :۔ وہ آپ پر اعتبار نہیں کریں گے۔

لزی :۔ شاید۔ شاید وہ مجھ پر اعتبار نہیں کریں گے۔ ایسی حالت میں تم نشانہ باندھو گے اور اگر وہ کمرے سے باہر نہیں جائیں گے تو تم گولی چلا دو گے۔

حبشی :۔ ان کے بعد دوسرے آجائیں گے۔

لزی :۔ تم ان کو بھی گولیوں کا نشانہ بنا دو گے۔ اور اگر تمھارے سینیٹر کا لڑکا دکھائی دے تو وار خطا نہ جائے۔ کیونکہ یہ اسی کا کیا دھرا ہے۔ ہماری موت قریب ہے۔ میں تمھیں بتا دوں کہ اگر انھوں نے تمھیں یہاں دیکھ لیا تو میری بھی خیر نہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ہمدمی میں مریں گے (اور ریوالور حبشی کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے) لو اسے تھام لو۔

حبشی :۔ نہیں مادام مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔

لزی :۔ کیا کہا؛

حبشی :۔ میں سفید آدمی پر گولی نہیں چلا سکتا۔

لزی :۔ وہ اتنے نرم نہیں ہوتے۔

حبشی :۔ وہ سفید آدمی ہیں۔ مادام۔

لزی :۔ تو پھر کیا ہوا۔؟ وہ اگر سفید ہیں تو انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ تمھارا ایک کتے کی طرح شکار کریں۔؟

حبشی :۔ وہ سفید آدمی جو ٹھہرے۔

لزی :۔ جاؤ غسلخانہ میں جا کر چھپ جاؤ۔

(حبشی حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ لزی تھوڑی دیر انتظار کرتی ہے۔ دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ اپنے سینہ پر صلیب کا نشان بناتی ہے اور کنگن اُٹھا کر پہن لیتی ہے اور دروازہ کھول دیتی ہے۔ بہت سے آدمی دروازہ میں ریوالور لیے نظر آتے ہیں۔)

پہلا آدمی :۔ ہم حبشی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

لزی :۔ کون سا حبشی۔؟

پہلا آدمی :۔ وہی جس نے ایک سفید عورت کی ریل گاڑی میں آبرو ریزی کی ہے اور سینٹر کے بھانجے کے اُسترے سے چرکے لگائے ہیں۔

لزی :۔ تمھیں اسے ڈھونڈھنے کے لئے یہاں نہیں آنا چاہئے۔ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے۔؟

دوسرا آدمی :۔ پہچانتے ہیں۔ پرسوں میں نے تمھیں ریل گاڑی سے اترتے ہوئے دیکھا تھا۔

لزی :۔ میں ہی وہ لڑکی ہوں جس کی اُس نے آبرو لوٹی تھی۔ سمجھے؟

(سب فرطِ حیرت سے بت بنجاتے ہیں۔ ان کے دِل میں ایک خواہش سر اُٹھاتی ہے۔ وہ خوفزدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ تھوڑا سا پیچھے ہٹتے ہیں۔ (توقف) وہ ہنستے ہیں۔)

ایک آدمی :۔ بہن تم اسے پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھو گی؟

لزی :۔ جب تم اسے پکڑ لو تو میرے پاس لے آنا۔

دوسرا آدمی :۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی میری جان!

ایک اور آدمی :۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ اسی گلی میں چھپا ہوا ہے۔

لزی :۔ خدا تمھیں کامیاب کرے ۔۔۔ (وہ چلے جاتے ہیں۔ وہ دروازہ بند کر دیتی ہے۔ پھر وہ ریوالور کو پلنگ پر پھینک دیتی ہے) اب تم باہر آ سکتے ہو۔ (حبشی غسلخانے سے باہر آتا ہے اور جھک کر اُس کے لہنگے کے کنارہ پر بوسہ دیتا ہے۔) میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ (پھر وہ اُس کی طرف دیکھتی ہے) تم بھی غضب کے حرامی ہو کر پورا قصہ تمھارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

حبشی :۔ میں نے کچھ نہیں کیا مادام ۔۔۔ آپ تو جانتی ہیں۔

لزی :۔ وہ کہتے ہیں کہ حبشی ہر وقت کسی نہ کسی بات کے لئے ضرور مجرم ہوتا ہے۔

حبشی :۔ میں نے کچھ نہیں کیا مادام۔

لزی :۔ (اپنے ہاتھ پر ہاتھ رکھتی ہے) میں خود نہیں جانتی کہ میں کہاں ہوں۔ (توقف) پورا قصہ غلطی نہیں کر سکتا۔ (توقف) میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔

حبشی :۔ مادام اکثر یونہی ہوتا ہے۔ سفید آدمی ہمیشہ یونہی کیا کرتے ہیں۔

لزی :۔ کیا تم اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہے ہو؟

حبشی :۔ ہاں مادام۔

لزی :۔ اور تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟

حبشی :۔ کچھ بھی نہیں مادام۔!

لزی :۔ مگر ہر ایک ان کا ہمیشہ کیوں ساتھ دیتا ہے؟

حبشی :۔ وہ سفید آدمی جو ٹھہرے۔

لزی :۔ میں بھی تو سفید ہوں۔ (توقف ۔ باہر قدموں کی چاپ سُنائی دیتی ہے۔) گھبراؤ نہیں وہ واپس جا رہے ہیں۔ (وہ اس کی طرف ازخود بڑھتی ہے۔ حبشی کانپ رہا ہے اور وہ اس حالت میں اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتی ہے۔ قدموں کی چاپ ڈوب جاتی ہے۔ خاموشی اور پھر یک بیک لزی خود کو حبشی سے آزاد کراتی ہے۔ ہم دونوں کس قدر تنہا ہیں۔ یتیموں کی طرح۔ (دروازہ کی گھنٹی بجتی ہے۔ وہ خاموشی میں سُننے کی کوشش کرتے ہیں۔ گھنٹی دوبارہ بجتی ہے۔) غسلخانے میں چلے جاؤ ۔۔۔ کوئی دروازہ پر زور زور سے دستک دیتا ہے لزی دروازہ کھولتی ہے۔ دروازے میں فریڈ ہے) تم میرا دروازہ کیوں توڑ رہے ہو؟ پاگل تو نہیں ہو گئے ۔۔۔ نہیں تم اندر نہیں آ سکتے۔ وہ اُسے ایک طرف دھکیل کر اندر آ جاتا ہے اور روشنی کا بٹن دبا دیتا ہے۔ دروازہ بند کر دیتا ہے اور اُسے کندھوں سے پکڑ لیتا ہے۔ طویل خاموشی۔) کہو کیا ہے؟

فریڈ :۔ انھوں نے ایک حبشی کو پکڑ لیا۔ مگر وہ اصل حبشی نہیں تھا خیر انھوں نے اسے بھی زندہ جلا دیا۔

لزی :۔ تو پھر؟

فریڈ :۔ میں ان کے ساتھ تھا۔

(لزی سیٹی بجاتی ہے)

لزی :۔ میں سمجھی ۔۔۔ سنا ہے کہ حبشی کو ایذا دینے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

فریڈ :۔ مجھے تمھاری ضرورت ہے

لزی :۔ کیا کہا؟

فریڈ :۔ تم چڑیل ہو ۔۔۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔ میں ان کے درمیان کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اور حبشی ایک شاخ کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور

میں نے سوچا میرا دل تمہاری طلب میں تڑپ رہا ہے۔ (اُسے زور سے لپٹا لیتا ہے۔)

لزی :۔ مجھے چھوڑ دو۔ چھوڑ دو مجھے۔

فریڈ :۔ کیا کہہ رہی ہو؟ تم ساحرہ ہو۔ تم نے مجھ پر جادو کر دیا ہے میں نے حبشی کی طرف دیکھا اور حبشی کے بجائے مجھے تم دکھائی دیں۔ میں نے دیکھا کہ تم شعلوں کے اوپر کھڑی ہو اور میں نے گولی چلا دی۔

لزی :۔ حرامی کہیں کے چھوڑ دے مجھے۔ چھوڑ دے مجھے۔ قاتل!

فریڈ :۔ تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے؟ تم تو مجھ سے ایسی چمٹ گئی ہو جیسے میرے مسوڑھوں سے دانت۔ (اُسے پلنگ پر گرا دیتا ہے) میں تمہیں ہر جگہ دیکھتا ہوں۔ مجھے تمہارا یہ شیطانی جسم دکھائی دیتا ہے۔ میں اپنے ہاتھوں میں تمہاری گرمی کو محسوس کرتا ہوں۔ میرے نتھنوں میں تمہاری خوشبو ہے۔ میں یہاں دوڑتا آیا ہوں۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں قتل کرنے آیا ہوں کہ زبردستی تمہیں یہاں سے کہیں لے جانے ۔۔۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ۔۔۔۔۔ (یک بیک اسے چھوڑ دیتا ہے۔ اور ایک دفعہ پھر اس کی طرف لوٹتا ہے) آج کی صبح تم نے جو کچھ کہا تھا کیا وہ سچ تھا؟

لزی :۔ کیا کہا تھا؟

فریڈ :۔ کہ میں تمہیں پسند ہوں ۔۔۔

لزی :۔ مجھے تنہا چھوڑ دو ۔۔۔

فریڈ :۔ قسم کھاؤ کہ تم نے جو کچھ کہا تھا سچ کہا تھا ۔۔۔ کھاؤ قسم (وہ اس کی کلائی مروڑتا ہے۔ ایک چیخ سنائی دیتی ہے ۔۔۔ غسلخانے میں شور برپا ہوتا ہے) یہ کیا ہے۔ (وہ سنتا ہے) کوئی غسلخانہ میں ہے۔

لزی :۔ پاگل تو نہیں ہو گئے۔ وہاں کوئی نہیں ۔۔۔

فریڈ :۔ ضرور کوئی ہے۔ (وہ غسلخانہ کی طرف بڑھتا ہے)

لزی :۔ تم غسلخانے میں نہیں جا سکتے۔

فریڈ :۔ پھر تو ضرور وہاں کوئی ہے۔

لزی :۔ گاہک ہے۔

فریڈ :۔ گاہک ۔۔۔۔۔ اب تمہارے پاس اور کوئی گاہک نہیں آئے گا۔ کبھی نہیں۔ تم میری ہو۔ (توقف) میں اُسے دیکھنا چاہوں گا۔ (وہ چلاتا ہے) غسلخانہ سے باہر آجاؤ۔

لزی :۔ باہر مت آنا۔ تمہارے لئے جال بچھایا جا رہا ہے۔

فریڈ :۔ باہر آجاؤ۔ (وہ لزی کو زور سے دھکا دیتا ہے اور غسلخانہ کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ حبشی باہر آتا ہے) کیا یہی ہے تمہارا گاہک؟

لزی :۔ گولی نہ چلاؤ۔ تم جانتے ہو کہ وہ معصوم ہے۔

فریڈ :۔ (اپنا ریوالور نکال لیتا ہے ۔۔۔ دفعتاً حبشی چھلانگ لگا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ فریڈ کو زور سے دھکا دیتا ہے اور تیزی سے دوڑتا ہے۔ فریڈ اس کا پیچھا کرتا ہے۔ لزی اُس دروازہ تک آتی ہے جس سے دونوں غائب ہو چکے ہیں ۔۔۔ اور چلانے لگتی ہے)

لزی :۔ وہ بے گناہ ہے۔ (دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کا چہرہ سُست گیا ہے۔ وہ میز کے قریب آجاتی ہے اور ریوالور اٹھا لیتی ہے۔ فریڈ واپس آتا ہے وہ اس کی طرف مُنہ کرتی ہے اور ریوالور کو پیٹھ کے پیچھے ہاتھ باندھ کر چھپاتی ہے۔ فریڈ اپنا ریوالور پلنگ پر پھینک دیتا ہے) کیا وہ تمہارے ہتھے چڑھ گیا؟ خوب۔ اب تمہاری باری ہے۔ (وہ نشانہ باندھتی ہے)

فریڈ :۔ لزی۔ میری ماں کا خیال کرو۔

لزی :۔ جہنم میں جائے تمہاری ماں۔ یہ بھالہ مجھے پہلے دیا جا چکا ہے۔

فریڈ :۔ (آہستگی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے ہوئے) پہلے کلارک نے اپنے ہاتھوں سے جنگل کو صاف کیا۔ اس نے سولہ ریڈ انڈینوں کو گولی کا نشانہ بنایا اور پھر وہ خود مارا گیا۔ اس کے بیٹے نے لگ بھگ پورا قصبہ تعمیر کیا۔ وہ جنرل واشنگٹن کا دوست تھا اور بلاک ٹاؤن میں امریکی آزادی کی خاطر لڑتا ہوا کام آیا۔ میرے دادا کا باپ بہت اچھا انسان دوست تھا۔ اس نے عظیم آگ کے وقت بائیس جانیں بچائیں۔ میرے دادا نے یہاں سکونت اختیار کی۔ اس نے مسوس تک نہر کھودی اور اس صوبہ کا گورنر رہا۔ میرا

(بقیہ صفحہ ۱۶۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

دُکھیا سب سنسار

(ادیب بھی قاری بھی)

پرکاش پنڈت

ایک تقریر

میں نے پرکاش پنڈت سے پوچھا "اے بھیّا! اگر قاری بھی دُکھی ہے اور ادیب بھی تو پھر سُکھی کون ہے؟" پرکاش پنڈت نے اپنے ہونٹوں کو ایک معنی خیز جنبش دی اور کہا "اُسی سکھی آدمی کی تلاش کرنے کے لئے تو یہ طنزیہ لکھا ہے۔"

جیسا کہ میں نے کہا اور آپ نے سُنا اور آج سے صدیوں پہلے گورو نانک نے کہا تھا اور آپ آج تک سُن رہے ہیں سب سنسار دکھیا ہے۔ کسی کو روپے کے ہونے کا دکھ ہے تو کسی کو روپے کے نہ ہونے کا۔ کوئی دُبلا ہے تو دکھی ہے موٹا ہے تو دکھی ہے۔ اندھا اس لئے دُکھی ہے کہ وہ اندھا ہے اور جو اندھا نہیں اسے اس بات کا دکھ ہے کہ وہ اندھا کیوں نہیں ہو جاتا۔ کنوارے دکھی اور شادی شدہ حضرات ان سے زیادہ دُکھی لیکن سردست چونکہ میرے پاس سارے سنسار کے دکھوں کی فہرست مرتب کرنے کا وقت نہیں اس لئے سردست میں صرف اس مخلوق کے دکھوں کا ذکر کروں گا جسے عام اصطلاح میں ادیب اور قاری کہا جاتا ہے۔

آپ کو شاید میرے ادیب ہونے میں شبہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے یا کم از کم میں اسے حقیقت سمجھتا ہوں کہ میں ایک ادیب ہوں اور میں اس لئے بھی اپنے آپ کو ایک ادیب سمجھتا ہوں کیونکہ دنیا کے ہر ادیب کی طرح مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ اگر میں نے لکھنا بند کر دیا تو پورا نظام شمسی درہم برہم ہو جائے گا۔ دنیا میرے زریں اور الہامی اقوال سے محروم ہو جائے گی چنانچہ نظام شمسی کو برقرار رکھنے اور دنیا کو اپنے زریں اور الہامی اقوال سے مالا مال کرنے کے لئے میں اپنے کتب خانہ میں جو بیک وقت کتب خانہ، باورچی خانہ اور غسل خانہ ہے، مسائل تصوف بیان کر کے اپنے ولی ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہوں۔

کتب خانہ، باورچی خانہ اور غسل خانہ ایک خانے میں ان تین خانوں کا ذکر سُن کر اگر آپ ادیب نہیں ہیں تو ضرور چونکے ہوں گے اور اگر نہیں چونکے تو میرا آپ سے اصرار ہے کہ چونکئے بلکہ قریب بیٹھے ہوئے لوگوں کو چونکائیے ورنہ اس زمانے کا سب سے بڑا اعزاز یعنی آپ کے قاری ہونے کا اعزاز خطرے میں پڑ جائے گا۔ ادیب کے بارے میں قاری کا جو تصور ہوتا ہے اس تصور سے قطعی مختلف نہیں، جو مرلی منوہر کے بارے میں تیرا کا تھا یا شیریں کے بارے میں تیشہ زن کا۔ نی زمانہ محل نہیں رہے، قلعے اور چوبدار نہیں رہے لیکن ہنگلے، کاریں، نوکر چاکر ایسی دسیوں چیزیں وجود میں آ چکی ہیں جنھیں عاشق اپنے محبوب سے اور قاری ادیب سے منسوب کر سکتے ہیں۔ کر سکتے ہیں اس لئے کہا کیونکہ ادیب سے ان چیزوں کو صرف منسوب ہی کیا جا سکتا ہے ورنہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے یہ صرف ادیب نامی بندۂ بے دام ہی جانتا ہے کہ کس طرح اس کے بیوی بچے اپنا خالی پیٹ بجا بجا کر اس سے لکھنے پڑھنے

کے کرتب چھوڑنے اور دہی بڑوں کا کھونچہ لگانے کی التجائیں کیا کرتے ہیں۔

ادیب کے بیوی بچوں کے نام پر آپ ایک بار پھر چونکئے۔ کیونکہ قاری کے نزدیک ادیب اس قسم کی دنیاوی خرافات سے بلند و بالا ایک ماورائی قسم کی چیز ہوتا ہے جس دنیا میں وہ رہتا ہے اس میں بیوی بچے اور ان کے خالی پیٹ نہیں، حوران عرشِ بریں اور دودھ کی ندیاں ہوتی ہیں۔ اس کا معدہ دانہ گندم سے واقف ہوتا ہے، نہ اس کا حاجت مند اور حورانِ عرشِ بریں کا تو ہم سب نے سن رکھا ہے کہ معدہ ہی نہیں ہوتا۔ اس کے ایک ذرا زبان ہلانے پر دنیا جہاں کی آسائشیں اس کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ اور اک ذرا قلم گھسانے پر اس کا شہرہ چہار دانگ عالم میں پھیل جاتا ہے یہ جاننے کی آپ کو ضرورت نہیں کہ اس کی لکھی کتابوں کی مقبولیت کا عالم کیا ہے، کیا ایسا تو نہیں کہ چھ سال میں ان کی صرف چھ جلد فروخت ہوتی ہوں اور ان کی رائیلٹی کے لیے پبلشر کے یہاں چھ سو چکر لگانے کے بعد اسے بتایا جاتا ہو کہ چونکہ رجسٹروں میں کتابوں کی فروخت کا اندراج یا سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ کتابیں فروخت نہیں چوری ہوئی ہیں۔

ادیب اور قاری کے رشتہ کی طرح ادیب اور ناشر کا رشتہ بھی چولی کلا من کا ساتھ ہے بلکہ ادیب قاری اور ناشر تینوں ایک دوسرے کے قریبی رشتہ دار ہیں جو قریبی رشتہ داروں کی طرح منہ کے میٹھے اور دل کے کھوٹے ہونے پر بھی ایک دوسرے کا جز ولاینفک ہیں۔ ناشر جانتا ہے کہ قاری نہ رہا تو وہ بھی نہ رہے گا۔ قاری جانتا ہے کہ ادیب نہ رہا تو وہ بھی نہ رہے گا اور ادیب جانتا ہے کہ اگر قاری اور ناشر نہ رہے تو نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری لہذا یہ تینوں اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیئے ایک دوسرے کا وجود برقرار رکھتے ہیں۔ خود دکھ اٹھاتے ہیں اور دوسروں کو دکھ پہنچاتے ہیں۔

آپ چونکہ قاری ہیں اور بغرض محال نہیں ہیں تو اس وقت مجھے فرض کر لینے دیجئے کہ ہیں اور آپ کو کسی شادی یا مرگ کے سلسلہ میں دور دراز کا سفر درپیش ہے اور چونکہ اکثر و بیشتر کتابیں سفر میں پڑھی اور گھر میں پھاڑی جاتی ہیں اس لئے آپ نے ریلوے بک سٹال سے اپنے پسندیدہ ادیب کا ناول خرید لیا۔ اب آپ مطمئن ہیں کہ وقت بھی کٹ جائے گا۔ سفر کی کوفت بھی نہیں ہوگی اور ایک ناول کا مطالعہ بھی ہو جائے گا کہ جس کا صرف ریویو پڑھ کر آپ اپنے دوستوں پر اپنے وسیع مطالعے کی دھاک جمانے کی کوشش کرتے۔ گاڑی روانہ ہوئی اور آپ نے بڑے اطمینان سے ٹانگیں پسار کر وہ ناول کھولا۔ پہلا صفحہ، دوسرا صفحہ بیسواں صفحہ ـــــ یا الٰہی خیر، یہ ناول ہے یا اچار مربّہ ڈالنے کی مختلف ترکیبوں کا مجموعہ؟ جبر کر کے آپ نے چند صفحے اور پڑھ ڈالے اب ہر صفحے کے بعد کتاب کی صنف کے بارے میں آپ پر نیا انکشاف ہو رہا ہے۔ کہیں کسی قتل کے مقدمہ کی روئیداد درج ہے تو کہیں بچوں کی نفسیات پر مدلل بحث۔ چند صفحوں پر کپڑوں کی کٹائی سلائی کے نمونے پھیلے ہوئے ہیں تو چند صفحوں پر ملیریا سے بچنے کے آسان نسخے اور شکار کھیلنے کی احتیاطی تدبیریں۔ لیکن آپ اسے ناول سمجھنے اور شروع سے آخر تک پڑھنے پر مجبور رہیں۔ ایک تو آپ نے اس پر اپنے خون پسینے کی کمائی صرف کی ہے، پھر اس وقت کوئی اور ذریعہ دل بہلانے کا آپ کے پاس نہیں، اس کے علاوہ آپ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے سامنے کی سیٹ پر بیٹھا ایک قہر درویش بر جان درویش قسم کا شخص جو صورت سے قاری معلوم ہوتا ہے نہ سیرت سے، بڑی للچائی نظروں سے آپ کی کتاب کی طرف دیکھ رہا ہے اور آپ جانتے بھی ہیں اور اس کا آپ کو تجربہ بھی ہے کہ اگر آپ نے کتاب بند کر دی تو یہ ہوگا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ جائے گا وہ مہاشے فوراً آپ کی کتاب اُچک لیں گے اور اس وقت تک واپس نہیں کریں گے جب تک آپ منزلِ مقصود پر پہنچ کر ان سے جسمانی طور پر نہیں چھین لیتے۔

یہ تو ہوئی آپ کی یعنی قاری کی بات، اب ذرا اس کتاب کے ادیب کی بات سُنیئے۔ بچارے ادیب نے چھ مہینے کی محنتِ شاقہ اور تسلسل فاقہ کے بعد ایک ناول لکھا اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے اس کا خیال تھا اور بعد میں یہ خیال صحیح

بھی ثابت ہوا کہ ایسی کتاب نہ آج تک لکھی گئی نہ آئندہ لکھی جائے گی چنانچہ بڑے فخر اور بڑی خود اعتمادی کے ساتھ وہ پبلشر کے یہاں پہنچا۔ پبلشر کے خیال شریف میں وہ زمانہ ناولوں کا نہیں ٹیکنیکل کتابوں کا زمانہ تھا۔ مسودے کو الٹ پلٹ کر ہاتھوں کے ترازو میں تول کر، سونگھ کر اور چھینک کر وہ اسے لوٹانا ہی چاہتا تھا کہ ناگاہ ایک جگہ اس کی نظر بہ دُور لفظ گا جر پر پڑ گئی ادیب کو اس نے مشورہ دیا اور کتاب چھپوانے کی غرض سے ادیب نے اس مشورہ کو بسر و چشم قبول کیا کہ جس جگہ گا جر کا ذکر ہے وہاں اگر گا جر کی قسمیں گنوا دی جائیں تو کتاب زیادہ مستند ہو جائے گی۔ ادیب نے گا جر کی قسموں کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو مہربان پبلشر نے اس کام کو اپنے ذمے لے کر کسی ہرفن مولا سے نہ صرف اس میں گا جر کی قسموں کا اضافہ کروا لیا بلکہ جہاں لفظ مچھر آیا وہاں مچھر کی اور جہاں کسی لباس کا ذکر آیا وہاں مختلف لباسوں کی با تصویر اور بالتفصیل تشریح کرا لی اور یوں وہ ناول ایک پُر از معلومات انسائیکلو پیڈیا کی شکل میں آپ تک پہنچا، آپ کا تو حال ہوا سو ہوا ادیب پر اس سانحہ کے بعد کیا گذری ہوگی اسے صرف اس کے پڑوسی ہی جان سکتے ہیں۔

اگر آپ چاہیں تو اس قسم کے دکھوں کو اتفاقیہ دُکھ کہہ کر نظر انداز کر سکتے ہیں کیونکہ رفتار سے قطع نظر عورتیں مردوں میں اور ناول انسائیکلو پیڈیا میں اتفاق ہی سے تبدیل ہوتے ہیں آپ کسی ایسے ناول کو لیجئے جو واقعتاً ناول تھا ہے اور رہے گا۔ آپ نے اس کا مطالعہ شروع کیا اور بقول مشہرین آپ کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ کچھ ادیب کے زور بیان سے اور کچھ پُرانی یادوں کے اُبھر آنے سے آپ دیکھ رہے ہیں کہ ناول کے ہیرو میں اور آپ میں اور ناول کی ہیروئن میں اور آپ کی دیرینہ محبوبہ اور حالیہ بیوی میں سوائے شکل و صورت کے کوئی فرق نہیں۔ حالات وہی ہیں جو تھے، حادثات بھی وہی ہیں جو تھے یہاں تک کہ انجام بھی وہی ہوا جو آپ کا ہوا تھا یعنی ہزار دقتوں، دشواریوں کے بعد آپ سہرا باندھ کر اپنی محبوبہ کو بیاہ لائے اور اب نہایت خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں کہ یکایک آپ کا چہرہ فق ہو جاتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے اور آنا کوئی بھی نہیں کیونکہ دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ، پر عمل کرتے ہوئے آپنے بار بار دیکھا کہ ناول کی ہیروئن شادی کے چند ماہ بعد ہی ہیرو سے متنفر ہو گئی۔ اپنی نفرت کا تو وہ اظہار نہیں کرتی لیکن ہیرو یعنی شوہر کے دفتر چلے جانے کے بعد اپنے نئے عاشق کو خطوط لکھتی ہے۔ اس کی یاد میں آنسو بہاتی ہے اور گاہے گاہے وہ ایک دوسرے سے ملاقات بھی کرتے ہیں۔ اس صورت میں آپ ہی بتائیے اس میں آپکے اور ناول کے مصنف کا کیا قصور تھا کہ مصنف کو جتنی گالیاں آپ دے سکتے تھے قتل کی دھمکی کے ساتھ آپ نے لکھ بھیجیں اور بیوی پر خواہ مخواہ شک کر کے اور دفتر سے چھٹیاں لے کے اپنی خوش و خرم زندگی کو جہنم زار بنا لیا۔

قصہ مختصر یہ کہ ادیب کے دکھوں کا کوئی شمار ہے نہ قاری کے۔ ادیب اگر لکھتا نہیں تو اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا اور اگر لکھتا ہے تو ہضم کرنے کیلئے کھانا نہیں ملتا۔ قاری اگر پڑھتا نہیں تو اسے اپنی زندگی ادھوری ادھوری سی محسوس ہوتی ہے اور پڑھتا ہے تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ بیاز کے چھلکوں کی طرح تہ بہ تہ بعض دکھ اگر حقیقی دکھ ہیں تو بعض محض اتفاقیہ۔ بعض بلائے بے درماں کی طرح نازل ہوتے ہیں تو بعضوں کو آواز دیکر گھر بلایا جاتا ہے اور گھر آئے مہمان کو چاہے وہ بلایا ہوا ہو یا بن بلایا کوئی احمق ہی ہوگا جو دھتکارے گا۔ ادیب اور قاری چونکہ احمق نہیں ہوتے یا کم از کم احمق کہلوانا پسند نہیں کرتے اس لئے ایک حال مست رہتا ہے تو دوسرا مال مست۔ ادیب اپنی کتاب کے صفحوں میں پنساری کو خشخاش اور دارچینی کی پڑیاں باندھتے دیکھ رہا ہے لیکن وہ مست ہے۔ قاری کی خریدی ہوئی کتاب کا ہر صفحہ بلکہ ہر سطر نیند آور گولی کا کام دے رہی ہے لیکن وہ مست ہے اور اس لئے مست ہے کیونکہ سوائے رہ رہ کے مست ہونے کے اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہیں اور چارۂ کار اس لئے نہیں کیونکہ وہ ؎

اُسی کو دیکھ کر جیتا ہے جس کافر پہ دم نکلے

ذرا عہدِ ماضی کو آواز دینا

حافظ علی بہادر خاں

● چند سیاسی یادیں

قومی آزادی کی جد وجہد میں صرف گمبھیرتا اور سنجیدگی ہی نہیں تھی۔ بلکہ مسکراہٹیں اور قہقہے بھی تھے یہ مسکراہٹیں اور مزاحیہ کیفیتیں حافظ علی بہادر خاں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ حافظ علی بہادر خاں جنھوں نے قومی آزادی کی جد وجہد میں خود عملی حصّہ لیا۔ سفید براق داڑھی اور چمکیلی آنکھوں والا یہ قومی ادیب اور اخبار نویس جب ماضی کے ان واقعات کو بیان کرتا ہے تو واقعہ کی شگفتگی میں ایک نئی جان پڑجاتی ہے۔

ارباب ذوق کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ مزاحیہ نگاری سنجیدہ نگاری سے زیادہ مشکل ہے۔ رلانا ہنسانے سے زیادہ آسان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض حالتیں غم کی ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے ہنسی کا پہلو نکل آتا ہے۔ کسی عاشق نامراد نے مرتے مرتے کہا تھا ؎

عالم بوقتِ نزع عجب بیکسی کا تھا　　تم ہنس دئے یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا

ایک اور شاعر نے نئے انداز میں یہ تخیل پیش کیا ہے ؎

کوئی بات تو ہنسی کی نکلے　　خندۂ صبح قیامت ہی سہی

ایک اور بھی کسی منچلے کا مصرعہ ہے ع

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھیری

اس مقالہ میں مجھے جودت طبع کا کوئی ایسا کرشمہ نہیں پیش کرنا ہے جس کے لئے مزاحیہ نگاری کا کریڈٹ مل جائے۔ میری حیثیت ایک راوی کی ہے۔ گذشتہ پچیس برس کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے دوران میں جو گوناگوں تاریخی "حادثات" تجربے میں آئے ان میں سے چند ایسے ہیں جو سیاسی پس منظر میں مزاح وطنز کے تحت لائے جاسکتے ہیں۔ وہی پیش کئے دیتا ہوں۔ واضح رہے کہ ان کی صحت پر آج بھی سینکڑوں گواہ مل سکتے ہیں۔

شعر کی تعریف میں اہل فن نے یہ شرط لگادی ہے کہ وہ نہ صرف کلام موزوں ہو بلکہ بالارادہ بھی کہا گیا ہو۔ اگر مزاح وطنز میں "بالارادہ" ہونے کی شرط ہے تو ذیل کے "حادثات" موضوع سے خارج ہیں لیکن اگر ان تاثرات کو پیمانہ قرار دیا جائے جو مزاح وطنز سے پیدا ہوتے ہیں تو ضرور ان کی حیثیت ہے اور شاید بعض کے نزدیک اونچی حیثیت بھی ہو۔

جہاد اور اہنسا

یہ تقریباً ۳۶ برس پہلے کا واقعہ ہے جب گاندھی جی جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے اور مسلمانوں میں خلافت اسلامیہ کے لئے ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ ایک متحدہ جلسہ ہندوستان کے مسلم اکابر و علماء کا ہوا جن کے سامنے گاندھی جی یہ تجویز پیش کر رہے تھے کہ ہندو مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں۔ اور مسلمان کانگریس کی تحریک سوراج میں ہندوؤں کے دوش بدوش ہوجائیں۔ لیکن گاندھی جی کی شرط اس اشتراک عمل کیلئے

یہ تھی کہ برطانوی سلطنت کے مقابلے میں اہنسا کا مسلک اختیار کیا جائے۔ اس جلسے میں دو بنگالی مولوی بھی شریک تھے۔ یہ دونوں بار بار اٹھ کر اہنسا کی مخالفت کرتے اور کہتے "جہود (جہاد) کرو جہود" اہنسا کے مقابلے میں انھوں نے اسلام کے نام پر "جہود" کو اتنی گرمجوشی کے ساتھ بار بار پیش کیا کہ جلسہ کی کارروائی میں سخت رکاوٹ ہونے لگی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم اور دیگر رہنما ان دونوں مولویوں کے "جہود" سے بہت پریشان تھے۔ آخر ایک تدبیر سمجھ میں آئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر سید محمود موجودہ وزیر خارجہ ہند اس پلان میں شریک تھے۔ جیسے ہی مولوی صاحب نے کہا کہ "جہود کرو جہود" تو چند آدمی کھڑے ہوگئے اور بولے بہت اچھا جناب مولانا جہاد کیجیے ہم تیار ہیں۔ آپ تلوار اٹھائیے اور ہماری قیادت فرمائیے۔ یہیں سے کمشنر کے بنگلے پر دھاوا کریں۔ چلئے بسم اللہ کیجیے۔ تلوار اٹھائیے اور آگے بڑھیے۔"

یہ رنگ دیکھتے ہی مولوی صاحب بولے "ہمارا کام فتوی (فتویٰ) دینا ہے تلوار چلانا نہیں!" اس جواب پر جلسہ میں ایک فرمائشی قہقہہ لگا اور مولوی صاحب اتنے شرمندہ ہوئے کہ پھر "جہود" کا مطالبہ نہیں کیا۔ اور جب کہیں جا کر جلسہ کی کارروائی آگے بڑھ سکی۔

بھیڑیا یا بھیڑی

اب تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ہند و پاکستان میں وقت کے امام ہوگئے ہیں اور اس بات کا کافی اندیشہ ہے کہ ان کے نام پر ایک نیا فرقہ اسلام میں پیدا ہو جائے۔ لیکن سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ جبلپور کے اخبار "تاج" کے معمولی ایڈیٹر تھے۔ محرم آیا تو انھوں نے ایک موسمی مقالہ محرم پر لکھا جس میں انگریزوں کو یزید کی امت قرار دیتے ہوئے "مسیحی بھیڑیوں" کے کرتوت پیش کئے تھے۔ اس جملہ کے استعمال پر دفعہ ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چلا دیا گیا۔ ایڈیٹر تو مولانا مودودی ہی تھے لیکن سرورق پر نام مالکِ اخبار مسٹر تاج الدین کا تھا اس لئے تاج الدین ہی گرفتار ہوئے۔ مولانا مودودی نے خطرہ محسوس کیا کہ ان کو بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیونکہ جبلپور کی پولیس جانتی تھی کہ لکھنے والے دراصل وہی ہیں۔ چنانچہ وہ راتوں رات دلی چلے گئے ان کی اچانک روانگی سے "تاج" کی ادارت کا سوال پیدا ہوا۔ اتفاق سے میں اس زمانے میں جبلپور ہی میں تھا۔ بعض قومی کارکنوں نے مجھے مجبور کیا اور میں مولانا مودودی کی خالی شدہ کرسی ادارت پر جا بیٹھا۔ اس طرح میری صحافت کا آغاز ہوا۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب مقدمہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی طرف سے بڑی دلیل یہ تھی کہ عیسائیوں کو بھیڑیا لکھ کر دو قوموں کے درمیان نفرت پھیلانے کے جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ تاج الدین صاحب کی طرف سے وفاع (صفائی) میں یہ پیش کیا گیا کہ "مسیحی بھیڑیوں" میں "بھیڑیوں" بھیڑیا کی جمع نہیں ہے بلکہ بھیڑی کی جمع ہے اور عیسیٰ مسیح کی بھیڑیں چونکہ ضرب المثل ہو چکی ہیں اور خود بائیبل میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے لہٰذا "مسیحی بھیڑیوں" میں توہین کا پہلو نہیں ہے بلکہ مدح کا پہلو ہے۔

ہندوستان کے دو ممتاز ادیبوں کی شہادت پیش کر دی گئی جنھوں نے عدالت میں حلفیہ بیان دیا کہ بھیڑی کی جمع بھی بھیڑیوں ہوگی۔ لغات میں بھی عدالت کو یہ چیز دکھا دی گئی۔

اتفاق سے مجسٹریٹ اردو زبان سے خوب واقف تھا۔ جب گواہ نے کہا کہ حضرت مسیح کی بھیڑیں ضرب المثل بن چکی ہیں تو ہنس کر بولا:۔ "جناب ادیب صاحب مسیح کی بھیڑیں نہ کہیے۔ مسیح کی بھیڑاں کہیے۔ اور ایک انگریزی ضرب المثل میں بھی آپ کو سناؤں۔ اور وہ یہ ہے۔ "قانون گدھا ہوتا ہے"۔ (Law is an ass) میں جانتا ہوں کہ لکھنے والے نے بھیڑیئے کی جمع استعمال کی ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی شہادتوں کی بناء پر مجھے ملزم کو بری کرنا پڑ رہا ہے۔

اس طرح تاج الدین بری ہوگئے اور عرصہ تک بھیڑیا اور بھیڑی کا چرچا جبلپور میں چلتا رہا۔

استنجے کے ڈھیلے

یہ بھی بہت پرانا واقعہ ہے اور میرا چشم دید نہیں ہے۔ لیکن راوی نہایت معتبر و ثقہ ہیں۔ جو اس وقت انڈین یونین کے ایک ممتاز ممبر

ہیں۔ انڈونیشیا والوں نے مصر سے ایک عالم کو بلایا تھا تاکہ دینی تعلیم کی تنظیم میں مشورہ دے سکے۔ یہ مصری عالم راہ میں ہندوستان کے دینی مدارس دیکھنے کے لئے ٹھیر گئے۔ ظاہر ہے کہ سب سے بڑا دینی مدرسہ دیوبند ہے۔ وہاں پہنچے تو اس روز دیوبند کے قابل ترین استاد کا درس اتفاق سے استنجے کے ڈھیلوں پر ہو رہا تھا۔ انھوں نے ایک گھنٹہ کامل اس پر بحث کی کہ استنجے کے لئے ڈھیلے سات ہوں یا پانچ اور اس بحث میں متعدد نکات پیدا کرتے رہے۔ جب مصری عالم واپس آئے تو نہایت غضب ناک تھے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کہیے آپ کو درس پسند آیا تو نہایت بگڑ کر بولے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ یہ بھی کوئی تعلیم ہے کہ ایک گھنٹہ استنجے کے ڈھیلوں پر ضائع کر دیا۔ پانچ ہوئے تو کیا سات ہوئے تو کیا! مقصد تو صفائی سے ہے جتنے ڈھیلوں سے بھی ہو جائے یا کسی اور طرح ہو جائے۔ مجلس میں ایک صاحب کہنے لگے۔ مگر اس کی تو داد دیجئے کہ ایسے خشک موضوع پر ایک گھنٹہ تک علم کے دریا بہاتے رہے۔ مصری عالم اور بھی بگڑ کر بولے۔ اس میں دریا کی کیا ضرورت ہے جبکہ تھوڑے سے ہی پانی سے جسم پاک صاف ہو جاتا ہے۔ لوگ ہنسنے لگے اور بات گئی گذری ہو گئی۔

"جامع الشروط خلیفہ"

جس زمانہ میں جلالۃ الملک سلطان ابن سعود مرحوم نے حجاز پر حملہ کر کے حرمین پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کی فوج نے بعض قبے توڑ دئے تو ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑا ہیجان و اضطراب تھا اور بڑی فکر یہ تھی کہ کہیں گنبد خضرا بھی نہ گرا دیا جائے۔ اس وقت شریف حسین کی حمایت میں ایک وسیع تحریک حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم و مغفور کی قیادت میں شروع ہوئی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ شریف حسین کو خلیفہ منتخب کیا جائے اور حرمین شریفین بحیثیت خلیفۃ المسلمین اس کے قبضہ میں رہیں۔ تحریک کے حامیوں کا زبردست ترین نکتہ یہ تھا کہ شریف حسین قریشی النسل ہے اور بموجب حدیث الائمۃ من القریش اسی کو خلیفہ ہونا چاہیے۔

میں اس زمانے میں "خلافت" کا ایڈیٹر تھا اور سب جانتے تھے کہ میں سلطان ابن سعود کا حامی تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالقادر قصوری سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خاں اور متعدد دیگر اکابر بھی سلطان کے حامی اور شریف حسین کے خلاف تھے۔ اس مخالفت کی زیادہ وجہ یہ تھی کہ شریف حسین برطانیہ کا آور دہ تھا اور اندیشہ تھا کہ اگر اس کے قبضے میں حرمین آ گئے تو برطانوی سامراج کا تسلط قائم ہو جائے گا۔

مولانا شوکت علی مرحوم جمعیۃ خلافت کے سکریٹری اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب کے مرید تھے۔ پیر و مرید نے مل کر میرے قلم پر پابندی لگا دی تھی کہ کوئی مقالہ "خلافت" میں "جامع الشروط خلیفہ" یعنی شریف حسین کے خلاف نہ لکھا جائے۔ اس زمانے میں اس مسئلہ پر "خلافت" کے مقالات کی بڑی اہمیت تھی۔ لیکن ہمارے گروپ کے کئی لیڈر پیام پر پیام بھیج رہے تھے کہ اس "جامع الشروط خلیفہ" والی تحریک کے خلاف ضرور لکھا جائے۔ سید سلیمان ندوی صاحب نے اعظم گڑھ سے نہایت اصرار کے ساتھ لکھا کہ بہت جلد دو چار مقالات شائع کئے جائیں۔

دوسری طرف حضرت مولانا عبدالباری صاحب بمبئی تشریف لائے اور انھوں نے کوشش کی کہ مولانا شوکت علی صاحب میرے لئے تقرری کا پروگرام بنا کر کسی دورہ پر بھیج دیں۔ اور پھر "خلافت" میں شریف حسین کا پروپیگنڈا کیا جائے۔ حسن اتفاق کہ اسی روز مولانا شوکت علی صاحب کو ماتھیران جانا پڑا۔ اور مجھے میدان خالی مل گیا۔ میں نے ایک نہایت سخت مقالہ "جامع الشروط خلیفہ" والی تحریک کے خلاف لکھ ڈالا۔

مجھ پر ارباب اقتدار کے ہاتھوں جو گذری سو گذری۔ لیکن اس واقعہ میں ایک پہلو مزاح کا بھی پیدا ہو گیا۔

جیسے ہی مخالفین کو اس مقالہ کی خبر ہوئی تمام پرچے بازار سے خرید لئے گئے۔ مگر شام تک ہمارے گروپ نے کسی پریس میں خفیہ طباعت کرا کے پھر بازار میں بھجوا دیئے۔ یہ پرچے بھی سب خرید لئے گئے۔ لیکن جس کوٹھری میں یہ خریدے ہوئے پرچے اسٹاک کئے جاتے تھے اس میں قفل پڑا تھا جس کی دوسری چابی حاصل کر لی گئی تھی۔ جیسے ہی یہ پرچے بازار سے آتے تھے قفل کھول کر انھیں پھر بازار پہنچا دیا جاتا تھا۔ پولیس نے شبہ میں پانچ چھ پریسوں پر چھاپے مارے۔ لیکن بعد میں جب معلوم ہوا کہ پرچے بار بار بازار میں پہنچ جاتے ہیں تو کوٹھری کی طرف تو کسی کا خیال نہیں گیا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ ابن السعود کے قبضہ میں موکل ہیں جو کہ پرچے بازار میں دوبارہ پہنچا دیتے ہیں۔

سب مخالفین صبر کر کے بیٹھ رہے۔

پوتر کنڈ

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب گاندھی جی نے نمک ستیہ گرہ شروع کی تھی اور ایک برس ستیہ گرہ کی تحریک چلنے کے بعد لارڈ ارون اور گاندھی جی کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ ان شرائط کے تحت ان تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا جو تشدد کے جرم میں سزایاب نہیں ہوئے تھے۔

میں اس وقت ناسک جیل میں تھا۔ اور مجھے دو برس کی سزا دفعہ ۱۲۴ (الف (بغاوت) کے تحت ہوئی تھی۔ ایک برس گزر چکا تھا ایک باقی تھا۔ ناسک کے مجسٹریٹ نے دہلی گورنمنٹ کی ہدایات کے تحت مجھے رہا کر دیا۔ میں نے رہائی کے رجسٹر پہ دستخط کر دئے۔ اور جیل کے کپڑے بدل کر اپنے ذاتی کپڑے پہن باہر جانے لگا۔

اس وقت متعدد رفیقانِ زنداں میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ ایک رات اور ٹھیر جائیے۔ ہم سب صبح ہی صبح جلوس کی شکل میں جائیں گے۔ میں نے سوال کیا کہ ابھی کیوں نہیں چلتے تو جواب ملا کہ بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جیل کے جیون میں دھرم کا ٹھیک طرح پالن نہیں ہو سکا ہے۔ چھوت چھات کا لحاظ نہیں رکھا جا سکا لہذا پہلے ناسک شہر کے پوتر کنڈ میں نہالیں تو از سر نو پاک صاف ہو جائیں گے اور یہ پوتر کنڈ بہت دور ہیں۔ اگر اس وقت چلتے ہیں تو پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔ میں نے بادل ناخواستہ قبول کر لیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل سے اجازت لے کر ایک رات اور رہ گئے۔

لیکن رات کو بارہ بجے سپرنٹنڈنٹ جیل میرے پاس آ کر کہنے لگا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو رہا نہیں کر سکتا۔ بمبئی گورنمنٹ کا خاص تار آیا ہے کہ تم کو روک لیا جائے۔"

میں نے لاکھ کہا کہ آپ مجھے رہا کر چکے ہیں۔ میں تو اپنی مرضی سے ایک رات کے لئے رہ گیا تھا۔ تاکہ اپنے رفیقوں کے ساتھ پوتر کنڈ تک جلوس میں جاؤں۔ مگر اس نے ایک نہ سنی اور کہا کہ اگر کل شام ہی آپ جیل کے دروازے سے باہر نکل جاتے تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن اب تو آپ کو رہنا ہی پڑے گا۔ معلوم ہوا کہ میں نے کبھی ہم سازی پر جو مقالات لکھے تھے ان کے بہانے سے مجھے روک لیا گیا ہے۔ غرض کہ صبح کو تو یاروں نے تو پوتر کنڈ میں غوطے مار کر اپنے گناہ دھوئے اور میں مزید ایک برس تک درطۂ جبر و تشدد میں ڈبکیاں کھاتا رہا۔ اگرچہ میں سات بار جیل گیا۔ مگر یہ ایک برس سخت گذرا کیونکہ یہ قیدِ تنہائی کا ایک سال تھا۔

؟

کیا آپ کی فائل مکمّل ہے

آپ "شاہراہ" برابر منگواتے ہیں۔ اور اس کی فائل رکھتے ہیں۔ لیکن اگر حادثہ یہ ہو گیا ہے کہ آپ کی فائل کے کچھ پرچے گم ہو گئے ہیں، یا کوئی دوست اٹھا کر لے گیا ہے اور واپس نہیں دیئے تو آپ وہ پرچے ہم سے منگوا کر اپنی فائل مکمل کر لیجئے۔ اپنا آرڈر جلدی بھجوا دیجئے۔ کیونکہ اسٹاک تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اور کچھ دیر بعد شاید ہم آپ کے آرڈر کی تعمیل کرنے کے بھی قابل نہ رہیں۔

ان پرانے پرچوں کی قیمت بھی پوری ہی لی جائے گی ——— منیجر

چچا چھکن نے تصویر ٹانگی

بیگم قدسیہ زیدی • ایک ڈراما

چچا چھکن — اردو ادب کا وہ مشہور افسانوی کردار ہے، جسے سید امتیاز علی تاج نے اپنے مزاحیہ مضامین میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ یہ کردار ہمارے سماج کے ان عناصر کی نمائندگی کرتا ہے جو باتیں زیادہ اور کام کم کرتے ہیں۔ اور جب کوئی کام کرنے لگتے ہیں تو اسے اپنی مضحکہ خیز حرکتوں سے بے ڈھب سا بنا دیتے ہیں — بیگم قدسیہ زیدی نے تاج صاحب کے اس افسانوی کردار کو ڈرامائی جامہ پہنا کر اس میں ایک نئی حرکت اور جان ڈال دی ہے۔ چچا چھکن کی حرکات میں جو ڈرامائیت موجود تھی بیگم صاحبہ نے اسے نہایت خوبصورتی سے اُبھار کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

کردار

چچا

چچی

للّو

چھٹن — چچا کے لڑکے

ننھا

بنو — چچا کی لڑکی

مودا — نوکر لڑکا

امامی

ودّو

ماما

کہاری

[دالان میں چارپائی، تخت، گھڑونچی، نعمت خانہ وغیرہ قرینے سے رکھے ہیں۔ سامنے دیوار کے ساتھ تخت پر مسند، گاؤ تکیہ وغیرہ لگے ہیں۔ چچی تخت پر بیٹھی ہیں۔ پندنایں سے پان لگا کر کھا رہی ہیں۔ تخت کے پاس زمین پر اگالدان رکھا ہے۔ دائیں جانب چارپائی پر دو بچے بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے ہیں۔ مودا فرش پر جھاڑو دے رہا ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے تو چچا کرتے کے اندر سے پیٹ کھجاتے ہوئے بائیں ہاتھ کے دروازے سے اندر آتے ہیں]

چچی :۔ چھٹن کے ابّا۔ یہ تصویر کب سے رکھی ہوئی ہے۔ خیر سے بچوں کا گھر ٹھہرا، کہیں ٹوٹ پھوٹ گئی تو بیٹھے بٹھائے پانچ سات کا دھکا لگ جائے گا۔ آخر کون ٹانکے گا اس کو؟

چچا :۔ ٹانکتا اور کون؟ میں خود ٹانکوں گا۔ کون سی ایسی جوئے شیر لانا ہے۔ رہنے دو۔ میں ابھی سب کچھ خود ہی کئے لیتا ہوں (شیروانی اتارتے ہوئے) ارے امامی ذرا بیوی سے دو آنے پیسے لیکر مینجیں تو لے آ۔

امامی :۔ (نعمت خانے کے پاس کھڑا ہے) بہت اچھا۔ (چچی کے پاس آتا ہے، چچی پندنیا میں سے دونی نکال کر دیتی ہیں) ابھی لایا (بائیں دروازے سے بھاگ کر جاتا ہے)

چچا :۔ ابے او امامی!

چچی :۔ کسے پکار رہے ہو وہ تو گیا بھی۔

چچا :۔ مودے او مودے (مودا جھاڑو روک دیتا ہے) جانا امامی کے پیچھے۔ کہیو کہ تین تین انچ کی ہوں مینجیں۔ بھاگ کر جا لیجیو، اسے راستے ہی میں۔

چچی :۔ لاؤ تو میں اتنے میں کوڑا سمیٹ لوں (جھاڑو دیتی ہیں)

چچا :۔ ننھے او ننھے کہاں ہے تو ذرا ادھر تو آ (ننھا مونگ پھلی کھاتا ہوا آتا ہے) جانا بیٹے۔ ذرا میرا ہتھوڑا تو لے آنا (پکار کر) بنو، بنو بیٹا ذرا ادھر تو آنا (بنو آتی ہے) جاؤ اپنے بستے میں سے چمٹی نکال لاؤ (ننھا اور بنو جاتے ہیں) اور سیڑھی کی بھی ضرورت ہوگی ہم کو (للو چارپائی پر بیٹھا مونگ پھلی کھا رہا ہے) ارے للو ذرا تم کسی سے کہہ دیتے سیڑھی یہاں لاکر لگا دیتا (للو جاتا ہے) اور ہاں دیکھنا وہ لکڑی کے تختے والی کرسی بھی لیتے آتے تو خوب رہتا (بنو چمٹی لے کر بائیں دروازے سے بھاگی ہوئی آتی ہے۔ للو اسی دروازے سے باہر بھاگتا ہے۔ دونوں کی ٹکر ہوتی ہے۔ دونوں رونے لگتے ہیں)

چچا :۔ آخر کیا قیامت آرہی ہے۔ آنکھیں کھول کر کیوں نہیں چلتے۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو۔

چچی :۔ بس اب چپ ہو جاؤ کوئی بات نہیں، کام میں تو ایسی تھوڑی بہت چوٹ لگ ہی جاتی ہے (للو باہر جاتا ہے، بنو چمٹی زمین پر سے اٹھا کر چچا کو دیتی ہے)

چچا :۔ شاباش! چلو ایک چیز تو آئی۔

(ننھا بائیں دروازے سے اندر آتا ہے)

ننھا :۔ ابّا وہ تو بہت بھاری ہے۔ مجھ سے نہیں اٹھتا۔

چچا :۔ حرامخور! بس کھانے کو دے دو۔ ان پاجیوں کو دن میں چار چار بار۔ اور کام کے نام پر موت، کام چور۔ "مجھ سے نہیں اٹھتا" جائیے اور لائیے ہتھوڑا۔ ہم نہیں جانتے۔

چچی :۔ میں نے کہا۔ چھٹن کے ابّا۔ بچہ لکڑی پھاڑنے کے لئے ہتھوڑے کو کہہ رہا ہے۔ آخر اس کا کیا ہوگا۔ اپنی ہتھوڑی جو منگوا لو۔ تمہاری الماری پر رکھی ہے۔

چچا :۔ (جھلا کر) اجی تم بھی سو سو کر جاگتی ہو۔ پہلے سے نہ کہا۔ بیکار پریشان کر رکھا ہے۔

چچی :۔ تم بیٹھو، میں ابھی لائی ہتھوڑی۔ چل ننھے میرے ساتھ چل میں دوں ہتھوڑی (ننھا اور چچی دائیں ہاتھ کے دروازے سے جاتے ہیں)

چچا :۔ (بنو سے جو کوڑا سمیٹ رہی ہے) شاباش۔ بیٹی شاباش۔ اچھی بیٹیاں یوں ہی کام کرتی ہیں۔ وہ آدمی کیا جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ اور کام کرے نہ کاج (بنو کوڑا سمیٹ کر بائیں دروازے سے کوڑا لے کر جاتی ہے)

(چچی اور ننھا دائیں دروازے سے آتے ہیں۔ ننھے کے ہاتھ میں ہتھوڑی ہے)

چچی :۔ لو یہ لو ہتھوڑی۔

چچا :۔ ہاں! اسے کہتے ہیں ہتھوڑی، ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے (ننھے کو پیار کرتے ہیں) چھٹن بیٹے! جائے پی لی تم نے! ذرا جانا تو، نہیں۔ پہلے یہاں آؤ۔ تمھیں سمجھا دیں (چھٹن اندر آتا ہے کرتے سے منہ پونچھتے ہوئے)

چھٹن :۔ جی ابا۔

چچا :۔ بھئی اپنے ان ہمسائے کے، اجی کیا نام، میاں باقر علی، ان کے گھر جا کر کہنا۔ ابا نے سلام کہا ہے اور پوچھا ہے آپ کی ٹھانگ کیسی ہے (چھٹن جانے لگتا ہے) سن تو سہی، اور یہ کہیو وہ جو ہے نہ آپ کے پاس کیا نام ہے اس کا۔ اے لو بھول گیا۔ بلول تھا کہ ٹلول اللہ جانے کیا تھا۔ خیر وہ کچھ ہی تھا۔ تو یوں کہہ دیجو کہ وہ جو آپ کے پاس آلہ ہے نہ جس سے سیدھا معلوم کرتے ہیں۔ وہ ذرا دیدیجئے (چھٹن جانے لگتا ہے) ارے پوری بات تو سن، کہیو تصویر ٹانگنی ہے، جا بیٹو میرے بیٹے۔ پر دیکھنا سلام ضرور کرنا (جاتا ہے) اور ٹانگ کا پوچھنا مت بھول جانا۔ اچھا! (ننھا اس کے پیچھے جاتا ہے اور دونوں بائیں سے باہر چلے جاتے ہیں)

چچی :۔ ذرا بیٹھ کر پان وان کھا لو ابھی آئی جاتی ہیں چیزیں۔

چچا :۔ (بے سنے) یہ تم کہاں چلدیئے للو، کہا جو ہے ذرا یہیں ٹھہرے رہو۔ بس کام کے وقت سب کے سب نہ جانے کدھر کو چلے جاتے ہیں (للو اور منو کرسی لے کر بائیں سے آتے ہیں) ادھر رکھ دو اسے (کرسی رکھ کر جانے لگتے ہیں) ذرا یہیں ٹھہرے رہو۔ سیڑھی پر روشنی کون دکھائے گا ہم کو۔ (امامی اندر آتا ہے) کیا امامی لے آیا میخیں؟ سودا مل گیا تھا؟ تین تین انچ ہی کی ہیں نا؟ (میخیں دیکھ کر) بس بہت ٹھیک ہیں۔

چچی :۔ بھلا اتنی بہت سی کیا ـــ

چچا :۔ ارے لو۔ ستلی منگوانے کا تو خیال ہی نہ رہا۔ اب کیا کروں؟

چچی :۔ کرتے کیا۔ کسی بچے سے کہو لیک کر لے آئے گا۔ (مودا آتا ہے)

چچا :۔ مودے بیٹے، میخیں تو بالکل ہماری مرضی کی آگئیں۔ شاباش۔ ذرا جانا میرا بھائی جلدی سے، ہوا کی طرح جا اور دیکھیو۔ بس گز سوا گز ستلی بھی لے آ (جانے لگتا ہے) ارے سن تو بہت موٹی ہو نہ بہت پتلی۔ بس سمجھا کے کہہ دیجو۔ تصویر ٹانگنے کے لئے چاہیئے۔ بس جا (جاتا ہے)

چچی :۔ جا کہاں رہا ہے۔ پیسے تو لیتا جا۔ کیا مفت لائے گا ستلی (کمربند میں سے پیسے کھول کر دیتی ہے) دیکھ تو ذرا دو آنے کا کتھا بھی لیتا آئیو میرا بھائی۔

چچا :۔ (گھوم کر) کیوں بے لے آیا ستلی؟

مودا :۔ ابھی تو پیسے لے رہا ہوں۔ کتھا بھی تو آئے گا۔

چچا :۔ کیسا کتھا۔ کہاں لگے گا؟ (چچی سے) اچھا تمھیں چاہیئے۔ بس یہی تو تمھاری باتیں ہمیں ناگوار معلوم ہوتی ہیں۔ دیکھ رہی ہیں کہ کس قدر جلدی کا کام ہے۔ مگر نہیں اپنا کام ضرور بتائیں گی۔ گویا ہمارے کام کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ تصویر ـــ

(دائیں ہاتھ کے دروازے سے ننھا ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس لئے اندر آتا ہے۔ چچا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں۔ اور سب بچے زور زور سے ہنستے ہیں)

چچا :۔ (نہایت سنجیدگی سے) ابھی سیڑھی لائے ہوتے یہ بانس کیا ہو گا (جھلا کر) ہم کوئی مداری کے تو ہیں نہیں کہ بانس پر چڑھ کر میخ کو

ٹھوکیں گے (پھر کچھ سمجھ کر تاؤ میں آتے ہیں) لے جاؤ واپس اور سیڑھی لے کر آؤ۔

(ننھا نہایت اطمینان سے بانس کا گھوڑا بنا کر اس پر بیٹھ جاتا ہے)

ننھا :۔ ہم تو گھوڑا گھوڑا کھیل رہے ہیں۔

چچا :۔ (دانت کچکچا کر) بڑا آیا شہسوار کا بچہ۔ کام کے نام سے بخار چڑھتا ہے اور یوں کھلوا لو جتنا دل چاہے۔ فوراً لے کر جا یہ بانس ورنہ ——

چچی :۔ لے جا بچے لے جا۔ اس وقت یہ خود ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں۔

چچا :۔ بس تمہاری تو شہ پا کر یہ بچے دو کوڑی کے ہو گئے ہیں۔ (ننھا بڑے اہتمام سے پوری سٹیج پر بانس گھما کر جدھر سے آیا تھا چلا جاتا ہے۔)

چچا :۔ (مودے کو دیکھ کر) کیوں بے لے آیا اُستلی ؟

مودا :۔ نہیں تو

چچا :۔ (تاؤ میں) دیکھیں تم نے اس حرامخور کی حرکتیں۔ یعنی اس وقت سے اب تک آپ یہیں ہیں۔ کچھ ہو جائے مگر بیگم صاحبہ کا کتھا ضرور آئے گا۔ بس اب دے بھی چکو پیسے۔

چچی :۔ پیسے تو اسی وقت دے دیئے تھے۔ میں نے۔ وہ تو تمہاری حسین گفتگو سن رہا تھا۔

چچا :۔ جی بس اس گھر میں صرف میری ہی زبان چلتی ہے۔ اور سب کے منہ پر تو جیسے مہر لگی ہے۔ جا بے جا کر جلدی سے اُستلی۔ اور دیکھ کتھا لینے میں گھنٹوں مت لگا دینا۔

چچی :۔ آخر کتھے کی کتھا کیوں لے کر بیٹھ گئے۔ میں کون سا اسے کالے کوسوں بھیج رہی ہوں۔ بس اسی دکان سے دو آنے کا کانپوری کتھا لیتا ہوا چلا آئے گا۔

چچا :۔ آخر یہ پوچھتا ہوں کہ کیا اسی وقت کتھے کی ضرورت ہے۔ پھر کبھی آ جاتا۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ اور دودو دُو ارے دودو کہاں گیا۔ دیکھا تم نے تبھی تو کہتا ہوں۔ بس کام نکلنے کی دیر ہے اور یہ غائب کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔

چچی :۔ ارے جاتا کہاں کمبخت تمہارے ہی کسی کام میں ہو گا۔ میں نے تو ......

چچا :۔ جی میرا کام

چچی :۔ توبہ ہے سارے گھر کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔

چچا :۔ مجھے تو کوئی کام کرتا دکھائی دے نہیں رہا۔ کھیل میں لگے ہوں گے۔ یہ نہیں کہ آ کر ذرا ہاتھ بٹائیں۔ (دودو کرسی کے پاس آ تا ہے) یہاں آؤ تم کرسی پر چڑھ کر مجھے تصویر دینا۔ (دودو کرسی پر چڑھتا ہے)

(چھٹن ہاتھ میں فیتہ اور بنو شمع لئے آتے ہیں)

چھٹن :۔ میر صاحب نے آداب کہلوایا ہے۔ اور کہا ہے کہ میری ٹانگ اچھی ہے۔ ٹمبل تو میرے ہاں ہے نہیں۔ البتہ یہ فیتہ حاضر ہے۔ اگر اس سے کام نکل سکے تو نکال لیجئے۔

چچا :۔ اماں فیتے کا کیا ہو گا۔ ہمیں کوئی کپڑا تھوڑے ہی ناپنا ہے۔ ہمیں تو سیدھ دیکھنا ہے۔ ابی جانے دو ہم آنکھ سے اندازہ کر لیں گے سنو تو وہ سیڑھی تو آئی نہیں اب تک۔

(ننھا اور للو سیڑھی لاتے ہیں۔ جو دروازے میں اٹک جاتی ہے)

چچا :۔ بھئی دیکھتے نہیں سیڑھی پھنس گئی۔ جا کر ہاتھ لگواؤ۔

(سب دوڑتے ہیں اور سیڑھی لے کر آتے ہیں)

ننھا :۔ ابا کہاں رکھیں سیڑھی۔

چچا :۔ اماں کہیں رکھ دو۔ یہاں رکھ دو، اچھا وہاں رکھ دو۔ (بچے سیڑھی لے کر گھومتے ہیں) ابے رکو سوچ تو لینے دو۔ جو ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ گھڑی کی چوتھائی میں ہو کام۔ سوچنے نہیں دیتے کم بخت۔

چچی :۔ سوچنے کی کونسی بات ہے۔ جہاں تصویر لگے گی وہاں دیوار سے لگا کر کھڑی کر دو سیڑھی۔

چچا :۔ پہلے ہی کیوں نہ آیا خیال۔ کم عقلوں کی ٹولی۔ ہٹاؤ تو تخت ہٹاؤ۔ بھئی سیڑھی کو رکھ دو زمین پر اور تخت ہٹا کر ایک طرف کو کر دو۔ بس ہو گیا کام۔

(سیڑھی زمین پر رکھ کر بچے تخت ہٹاتے ہیں۔ اور سیڑھی کو دیوار سے لگا دیتے ہیں)

بچے :۔ بس ابا میاں۔

چچا :۔ بس بھئی اب ستلی آ جائے تو کام شروع ہو۔

چچی :۔ (جھنجھلا کر) گویا صبح سے تو کام ہو نہیں رہا تھا۔ کمبخت گھر بازار ایک کر رکھا ہے۔ گھنٹوں سے بچوں کو ہلکان کر رہے ہیں۔

چچا :۔ ذرا سا کام کر لیا بچوں نے تو قیامت آ گئی۔ یوں سارا دن گلی میں مارے مارے پھریں تو کچھ نہیں۔ کام چور نوالہ حاضر۔

چچی :۔ میں تو کہہ کر گنہگار ہو گئی کہ ذرا تصویر ٹانگ دو۔

چچا :۔ خوب! الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ میں تمہاری خوشامد تو کرنے گیا نہیں تھا کہ مجھ سے ٹنگوا لو تصویر۔ آخر تین دن سے پڑی جھک مار رہی تھی۔ تم نے خود ہی کہا چھٹن کے ابا۔ کون ٹانگے گا تصویر، لو بھئی گناہ کیا جو کہا ہم ٹانگ دیں گے۔

چچی :۔ تو آخر کبھی ٹنگ بھی چکے گی یا نہیں؟

(مودا ستلی لاتا ہے جس کا ایک سرا چپکی میں تھام رکھا ہے)

چچا :۔ لو اب آ گئی ستلی بس تصویر ٹنگی سمجھو۔

(سب بچے نیم دائرہ بنائے سیڑھی کے پاس کھڑے ہیں۔ کوئی میخیں تھامے ہے۔ کسی کے ہاتھ میں ستلی کسی کے فیتہ کسی کے شمع اور کوئی ہتھوڑی لئے ہے۔ ودو تصویر لئے کرسی پر کھڑا ہے)

چچی :۔ اتنے میں تم تصویر ٹانگو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں (چلی جاتی ہیں)

چچا :۔ یا علی (سیڑھی پر چڑھتے ہیں) ودو بیٹا ذرا دینا تو تصویر پہلے اندازہ کر لیں کہ ٹانگنا کہاں ہے (پکار کر) چھٹن کی اماں ذرا ادھر آنا۔ بتا تو دو تصویر کہاں ٹنگوا رہی ہو۔ ورنہ اونچی نیچی ہو گئی تو دشواری ہو گی (تصویر ہاتھ میں لے کر ذرا وزن کرتے ہیں۔ سیڑھی پر سے پاؤں پھسلتا ہے۔ چچا تصویر ہاتھ سے چھوڑ کر سنبھلنے کی کوشش کرتے ہیں) ہئی ہے! گدھے بیوقوف۔ گرا دی نہ تصویر۔

(سب ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں۔)

چچی :۔ (دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اندر آتی ہیں) کیا ہوا خیر تو ہے؟

چچا :۔ (نیچے اتر آتے ہیں اور کرچوں کا معائنہ کرتے ہیں) ابی بڑی خیریت ہوئی میں نیچے نہیں کھڑا تھا۔ ورنہ یہ میرے سر پر گرتی۔ اللہ نے تم پر بڑا کرم کیا بیوی۔ صدقہ نکلوا دینا (کرچ انگلی میں چبھ جاتی ہے) اماں شیشہ چبھ گیا۔ ہماری انگلی میں۔ آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ میرا رومال دو رومال (چارپائی پر بیٹھ جاتے ہیں)

چچی :۔ کہاں ہے رومال۔

چچا :۔ اماں ہوتا کہاں۔ کوئی میں نے کمر بند سے تو باندھ نہیں لیا شیروانی کی جیب میں ہو گا۔

(سب بچے شیروانی ڈھونڈتے ہیں)

مودا :- کہاں گئی شیروانی۔

ننھا :- ابھی ابھی تو میں نے یہیں کہیں دیکھی تھی ۔

چچی :- تو ڈھونڈو پھر

بنو :- کسی کھونٹی پر ہوگی۔

چچا :- کمبختو، ڈھونڈ بھی چکو ۔

امامی :- میاں یہیں تو نہیں رکھی ۔

چچا :- پاجی! گویا ہم تو اندھے ہیں ۔ بقراط کا بچہ! ڈھونڈو جلدی ۔

(سب بچے ادھر سے ادھر ناچتے پھر رہے ہیں ۔ ٹکریں لگ رہی ہیں ۔ ایک چیخم چاخ مچی ہے)

چچی :- آخر گئی تو کہاں گئی شیروانی ۔ زمین تو نگل نہیں گئی ۔

چچا :- سارے گھر میں کسی کو توفیق نہیں کہ میری چیز سنبھال کر رکھے ۔ عمر بھر ایسے نکموں سے پالا نہ پڑا تھا۔

چچی :- بس رہنے دو ، خود جیسے ۔

چچا :- اور کیا جھوٹ کہتا ہوں ۔ چھ چھ آدمی ہیں ۔ اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈ سکتے ۔ جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے میں نے اتار کر رکھی ہے ۔ بھئی بڑے حیرت کی بات ہے، کون لے گیا شیروانی ۔

(بچے ذرا چھٹ کر ادھر ادھر ہو جاتے ہیں)

چچی :- میں نے کہا ذرا اُٹھ کر تو دیکھو ۔ تمہارے نیچے نہ ہو شیروانی ۔

چچا :- (اٹھتے ہیں) لاحول ولاقوۃ! ارے یہ رہی شیروانی ۔ گھنٹوں سے کہہ رہا ہوں کہ یہیں کہیں ہوگی (پکار کر) ارے بھئی رہنے دو، آجاؤ، ڈھونڈ لی ۔ اجی خود ڈھونڈ لی ہم نے ۔ (بچے آتے ہیں) یہ دیکھو یہ رہی شیروانی، تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل کھڑا ہو تو نظر نہیں آتا (چچی کی طرف دیکھ کر) ارے میری انگلی (چچی شیروانی کی جیب میں سے رومال نکال کر انگلی پر باندھتی ہیں)

چچی :- توبہ ہے ۔

چچا :- اجی جا کر ذرا پٹی لے آتیں تو بندھ جاتی انگلی آخر (انگلی پر لپٹے ہوئے رومال کی طرف دیکھ کر) کب تک بندھا رہے گا یہ پگڑ ۔ ہم ٹھہرے کام کاج والے آدمی ۔

چچی :- ابھی لائی (دائیں سے جاتی ہیں)

چچا :- جتنے ہماری پٹی آئے اتنے تم سب ٹھیک ٹھاک کر لو۔ بنو تم جھاڑو دے کر سب کرچیں اکٹھی کر لو ۔ امامی اور امامی تو لپک کر جا اور ایک شیشہ اسی ناپ کا لے آ (جانے لگتا ہے) ذرا رک، ناپ تو لیتا جا تصویر کی ۔ بنو تم کرچیں اٹھا لو ، (بنو کرچیں جمع کرتی ہے ۔ چچا تصویر ناپتے ہیں ۔ پھر سر کھجاتے ہوئے) ہمارے خیال میں تو تم تصویر لے جاؤ اور وہیں سے شیشہ لگوا کر لیتے آؤ ۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟

(امامی تصویر لے کر جاتا ہے ۔ چچی پٹی لے کر آتی ہیں)

چچی :- (پٹی باندھتے ہوئے) ہائے ہائے تلی بندھی ہے خون کی ۔ مگر تمھیں بھی تو چین نہیں ۔ گھنٹوں سے 'ابے لونڈے اور جا بے لونڈے' ہو رہا ہے ۔ انسان کے ہاتھ پاؤں پھلا دیتے ہو ۔ اب کچھ نہیں تو انگلی کاٹ لی ۔

بنو :- ابا میاں ۔ موم بتی ختم ہو گئی، دوسری لے آؤں ؟

چچا :- پوچھنے کی کونسی بات ہے ۔ آخر روشنی تو ہونا ہی چاہیئے ۔ جا جاکر جلدی سے لا دوسری موم بتی (بجھ جاتی ہے) بھئی امامی تو ابھی پڑا نہیں ۔ کیا کریں ۔ ہم بتائیں ۔ ہم اتنے نشان لگا کر میخ ٹھونکے دیتے ہیں (چھتی سے ناپنے میں بھول جاتے ہیں) بھئی لانا ستلی ۔ اس سے ناپ کر ادھواڑ کئے لیتا ہوں (ستلی دیکھ کر) یہ تو چھوٹی رہے گی ۔ او چھٹن وہ تھا نا تیرے ہاتھ میں ۔ وہ کیا نام ہے وہ جو تو ٹلول کی جگہ لایا تھا ۔

چھٹن :- فیتہ

چچا :- ہاں فیتہ ذرا لا تو (فیتے کا ایک سرا چھٹن کے ہاتھ میں دیتے ہیں ۔ دوسرا خود لے کر دیوار ناپتے ہیں) بھئی یہ دس فٹ پونے نو انچ ہے ۔ بیوی ذرا یاد رکھنا ۔ پونے دس فٹ نو انچ ۔

چچی :- ابھی تو کہہ رہے تھے دس فٹ پونے نو انچ ۔ اور اب .....

چچا ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں اور کیا میں کچھ اور کہہ رہا ہوں ۔ پونے دس فٹ نو ——

چچی :- تمہارے ساتھ کون مغز مارے ۔

(امامی تصویر لے کر آتا ہے)

چچا :- ابے او امامی کے بچے ذرا ادھر آ ۔ ارے یہ تصویر وہیں کہیں رکھ دے ۔ میری صورت پہ کیوں لئے آ رہا ہے رکھ وہاں رکھ ۔ دیکھ ذرا سلیٹ پنسل تو لا (امامی جاتا ہے) للو بیٹے اچھا تم دینا تو ضرب دس فٹ پونے نو انچ کو دو سے ۔

(للو انگلیوں پر حساب لگاتا ہے ۔ امامی سلیٹ لے کر آتا ہے)

امامی :- لو میاں سلیٹ ۔

چچا :- شاباش! ذرا لکھ تو پونے دس فٹ نو انچ اور ضرب دے دو سے ۔

چچی :- وہی اصیل مرغے کی ایک ٹانگ ۔ کیوں دیوانہ کئے دے رہے ہو بچے کو ، پون ون کو چھوڑ و ۔ دس فٹ نو انچ کو دو سے تقسیم کر ڈالو ۔

امامی :- (حساب لگا کر) میاں یہ تو کچھ اور ہو گیا ۔

چچی :- سب ہی عقل کے پورے ہیں ۔ ارے یہ بتا ۔ اس کی ادھواڑ کیا ہوگی ۔

چچا :- اور کیا ۔ کم بخت گھنٹہ بھر لگا دیا ۔

امامی :- پانچ فٹ ساڑھے چار انچ ۔

چچا :- یہی تو میں کہہ رہا تھا ۔ آئن سٹائین کا بچہ (چچا دیوار ناپ کر بیچوں بیچ انگلی رکھتے ہیں ۔ انگلی وہیں رکھے رکھے سیڑھی پر چڑھتے ہیں دو بچے سیڑھی تھامے ہیں ۔ چچا انگلی کو اوپر لے جاتے ہیں ۔ تاکہ ادھواڑ کا حساب غلط نہ ہو جائے ۔ پھر جس جگہ میخ ٹھونکنا ہے وہاں دائیں ہاتھ کی انگلی رکھ کر بایاں ہاتھ بڑھاتے ہیں ۔) لانا تو ہتھوڑی (ایک بچہ گھبراہٹ میں چھتی تھما دیتا ہے) اماں ہم ہتھوڑی مانگ رہے ہیں آپ چھتی لئے آ رہے ہیں (مودا ہتھوڑی دیتا ہے ہتھوڑی لے کر میخ پر چوٹ جو دیتے ہیں تو وہ سیدھی انگوٹھے پر) ہائے (بلبلا کر ہتھوڑی چھوڑ دیتے ہیں ۔ جو سیدھی چھٹن کے پاؤں پر گرتی ہے)

چھٹن :- (چلاتا ہے) کٹ گیا کٹ گیا ۔ ہائے میرا انگوٹھا (سب چھٹن سے ہمدردی کرتے ہیں)

چچی :- ہوئی ہے ۔ ذرا دیکھنا تو بچے کا انگوٹھا ۔ لہولہان ہو رہا ہے (دوپٹہ پھاڑ کر پٹی باندھتی ہیں)

چچا :- بیٹا انگوٹھے کو رو رہا ہے کوئی ہم سے نہیں پوچھتا کہ ہمارے انگوٹھے پر کیا گذری ۔ اندھیرا تو کر رکھا ہے کہاں ہے روشنی؟

چچی :- ذرا نیچے اتر کر دیکھو کیا ہوا ۔ توبہ ہے جب تک گھر بھر زخمی نہیں ہو لے گا ۔ یہ نگوڑی تصویر نہیں ٹنگے گی ۔ بس رہنے دو

میں بھرپائی۔ کوئی اور ٹانگ دے گا تصویر۔

چچا :۔ (غصّے میں) جی یہ ٹنگوالیں گی تصویر، گویا ہم تو اس وقت سے جھک مار رہے تھے۔ بھئی آخر تصویر ہی تو ٹانگ رہے تھے (نیچے اتر آتے ہیں) بس چپ ہو جا بے کیا نیل مچا رکھا ہے۔

چچی :۔ تو اب ٹانگتے ہو تو ٹانگ دو تصویر ورنہ ہٹاؤ یہ ٹانڈہ بھانڈہ۔

چچا (سیڑھی پر چڑھتے ہیں بچے سیڑھی تھامتے ہیں) ارے بھئی ان بچوں سے نہیں سنبھلے گی سیڑھی۔ کسی اور کو بلاؤ۔

(بنو موم بتی لے کر اندر آتی ہے)

چچی :۔ میری بچی ذرا ماما اور کہاری کو بھی بلاتی لا۔ سیڑھی تھام لیں آن کر۔

(بنو واپس جاتی ہے اور ماما اور کہاری کو لے کر آتی ہے)

چچا :۔ بنو بیٹیا ادھر آؤ۔

چچی :۔ لو آگئیں ماما اور کہاری بھی۔ اب کہو تو کسی اور کو بھی بلا دوں۔

چچا :۔ (سُنی ان سُنی کر کے) یا علیؑ (سیڑھی پر چڑھتے ہیں۔ کہاری اور ماما نے سیڑھی تھام رکھی ہے۔ بچے نیم دائرہ بنائے مختلف چیزیں لئے کھڑے ہیں) لاؤ میخ، یا جی اب ہم نیچے آئیں۔ میخ کرسی پر چڑھ کر دے (بچہ میخ دیتا ہے) بس اب ٹھیک ہے۔ لاؤ ہتھوڑی دو (ہتھوڑی لینے لگتے ہیں تو میخ گرجاتی ہے) اے لو اب کمبخت میخ چھوٹ کر گر پڑی۔ بھئی دیکھنا کہاں ہے (سب کے سب گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ڈھونڈتے ہیں)۔ ارے کمبختو ڈھونڈی۔ اب تک تو میں سومرتبہ تلاش کر لیتا۔ اب میں رات بھر سیڑھی پر کھڑا سوکھا کروں گا (ماما اور کہاری سیڑھی چھوڑ کر میخ ڈھونڈنا چاہتی ہیں) میخ تو گری اب کمبختو تم مجھے بھی گرا دو۔ تمھیں کیا مطلب میخ سے تم تو اپنا کام کرو۔ بس سیڑھی تھامے رکھو۔ کوئی اور ڈھونڈے گا میخ۔ کمبخت میخ نہ ہوئی اچھی خاصی دس نمبر کی سوئی ہوگئی۔ اندھو کیا دوربین لاؤں۔

چچی :۔ توبہ ہے آخر کیا مصیبت ہے دوسری میخ جو لے لو

چچا :۔ بھلا پہلے ہی کہہ دیتیں تو کیا حرج تھا۔ بیکار گھر ہلکان ہو رہا ہے۔ اور بیگم بیٹھی ہیں منہ میں گھنگنیاں ڈالے۔ اب آدھے گھنٹے کے بعد فرماتی ہیں دوسری میخ جو لے لو۔

چچی :۔ آخر تم کہاں تھے۔ تمھیں کیوں نہ سوجھی؟

چچا :۔ میں بیکار تو بیٹھا نہیں۔ کام میں ہوں۔ یا کام ہی کر لوں یا سوچ ہی لوں دونوں باتیں تو ہو نہیں سکتیں۔ لاؤ دوسری میخ لاؤ۔

سب :۔ (دبی آواز میں) یا اللہ شکر۔

امامی :۔ لو میاں میخ۔

چچا :۔ (میخ لے کر ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں) ارے بھئی وہ کہاں گیا۔

چچی :۔ یا اللہ اب کیا کھو دیا۔

چچا :۔ اماں وہ نشان جو ہم نے لگایا تھا۔ ذرا چھٹن بیٹے آنا تو اوپر۔ شاید تمہیں دکھائی دے جائے۔

چھٹن :۔ (اوپر جاتا ہے) یہ ہے ابا

چچا :۔ اونہہ ہونہہ۔ ہرگز نہیں۔ بالکل غلط۔ اندھا کہیں کا، اتر نیچے۔

للو :۔ ابا داہنے کو ہے داہنے کو۔

چچا :۔ آ اوپر آکر بتا۔

للو :- (اوپر جاکر) یہ رہا

بنو :- ابا میاں غلط بتا رہا ہے للو

پچا :- باجی، اترو نیچے ، تو آ بنو

بنو :- (اوپر جاتی ہے) یہ ہے

ننھا :- ہرگز بھی نہیں ۔

پچا : (غصے میں) نشان نہ ہوا چھلاوا ہو گیا کہ گھڑی بھر میں ادھر اور گھڑی بھر میں ادھر نہیں ہمارے خیال میں یہی ہے ۔

سب :- ہاں یہی ہے ۔

پچا :- ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے (پچا میخ ٹھونکتے ہیں ۔ تو پوری میخ اور آدھی ہتھوڑی دیوار کے اندر اتر جاتی ہے اور پچا کی ناک دیوار سے ٹکراتی ہے) ارے میری ناک ذرا دیکھنا تو سب چھل گئی ۔

پچی :- رکو ۔ ناک کا معاملہ ہے میں ابھی لائی پھایا (پچی اسٹکنگ پلاسٹر کا ٹکڑا دیتی ہیں) لو یہ چپکا لو، ناک پر کھی دکھی نہ بیٹھ جائے ۔ موسم ویسے ہی خراب ہے ۔

پچا :- (پھایا ناک پہ لگاتے ہیں) لاؤ دوسری میخ ۔

پچی :- بس رہنے دو ۔ اب اور کسی کو زخمی کرو گے ۔ تمہیں یوں میخ گاڑنا ہوا کرے تو آٹھ روز پہلے خبر دیا کرو ۔ میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں ، اور نہیں تو!

پچا :- ایک تو ہم تمہارا کام کریں ، زخمی ہوں ۔ پسینے میں شرابور ہوں ۔ اور آپ ہیں کہ کچھ سمجھتی ہی نہیں آتا ۔ گویا یہ خود گاڑتیں میخ ۔

پچی :- اس سے تو اچھی ہی گاڑتی ۔ سارا گھر تل پٹ کر دیا ۔

پچا :- یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنالیتی ہے ۔ کس بات پر دئے جا رہے ہیں طعنے ۔

پچی :- بس اب منہ نہ کھلواؤ ۔

پچا :- صاحب کان ہوئے ۔ آئندہ ہم کسی کام میں دخل نہیں دیا کریں گے ۔ (پچا میخ گاڑ کر تصویر ٹانگتے ہیں ۔ جو بالکل ٹیڑھی ہے) لو ٹانگ تو دی تصویر اور کیا جان لو گی ۔

پچی :- اور ذرا دیوار کا حلیہ تو دیکھنا ۔ گز گز بھر دیوار کی یہ حالت ہے گویا چاند ماری ہوتی رہی ہے ۔
(پچا نیچے اترتے ہیں تو پورے قد سے ماما کے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے ہیں)

ماما :- میاں میرا پاؤں ۔

پچا :- لاحول ولا قوۃ میں سمجھا ۔۔۔

پچی :- بس رہنے دو ۔

پچا :- رہنے کیا دو ۔ ابھی لگ گئی تصویر ۔ بس اتنی سی بات تھی ۔ لوگ اس کام کے لئے مستری بلوایا کرتے ہیں ۔

پردہ

(جملہ حقوق بحق ہندستانی تھیٹرز محفوظ)

گاؤں کی سیر

اے حمید

● انشائے لطیف

"اب ہمارا وہ سفر شروع ہوتا ہے۔ جو کبھی کولمبس کو نئی دنیا دریافت کرتے ہوئے درپیش ہوا تھا۔ تانگے کے آگے اور کوچوان کے پیچھے جو گھوڑا جُتا تھا۔ وہ اصلی گھوڑے کا ایکسرے تھا۔ اور جب وہ چلنے لگا تو ہمیں یوں لگا۔ گویا ہم اونٹ پر سوار ہیں۔"

حافظ آباد سے ایک کچی سڑک بادل نخواستہ دریائے چناب کی طرف سے جاتی ہے۔ چونکہ یہ سڑک اپنی مرضی کے خلاف چلی گئی ہے اس لئے ہر قدم پر وہ سفر کرنے والے کو روکتی ہے۔ سائیکل سوار کا ٹائر پنکچر کرتی ہے اور کوچوان کا تانگہ اُلٹنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سڑک پر جو تانگے چلتے ہیں ان کا سب کچھ ہلتا ہے۔ مگر گھوڑا اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ چنانچہ عام طور پر کوچوان کو اتر کر گھوڑے کی لگام تھامے ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ یہ دنیا کی پہلی سڑک ہے جس پر تانگوں کے آگے گھوڑے اور گھوڑوں کے آگے کوچوان جتے ہوتے ہیں۔

اپنے دوست شجاعت حسین کے گاؤں پہنچنے کے لئے ہمیں اسی سڑک پر سے گذرنا پڑا۔ اور یقین کیجئے گاؤں پہنچ کر تو مجھے واقعی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ "میں واقعی گذر چکا ہوں۔ اور اب بس اللہ ہی اللہ ہے۔ شجاعت حسین اس گاؤں کے اچھے خاصے زمیندار ہیں اور ہمیں لینے لاہور آئے تھے۔ اس سے پہلے میں نے کئی بار گاؤں جانے کا ارادہ کیا۔ مگر نہ جا سکا۔ دراصل مجھے گاؤں کی سیر کا اس سے پیشتر ایک دل نشین تجربہ ہو چکا ہے۔ یہ وہی گاؤں ہے، جہاں خلوص کا پتلا مکھن نامی گوجر ملا تھا۔ اور جہاں مجھے ایک رات موٹر کے ٹائروں جتنے پراٹھے کھانے پڑے تھے (خدا مکھن گوجر کو سلامت رکھے کہ اس کی وساطت سے تلے ہوئے ٹائروں کی زیارت نصیب ہوئی) چونکہ مجھے گاؤں کے لوگ بڑے پسند ہیں۔ اور پھر شجاعت صاحب کا معاملہ تھا۔ بس ایک دن رخت سفر باندھا اور گھر کا دروازہ کھول کر عازم حافظ آباد ہو گیا۔ گوجرانوالے تک ٹرین میں سفر کیا۔ جو خاصہ دلچسپ رہا۔ لاہور اسٹیشن پر ایک قلی سے لڑائی ہوئی۔ امین آباد کے سٹیشن پر ایک خوانچہ فروش ایک روپے میں سے آٹھ آنے کے آلو بخارے دے کر باقی پیسے ہاتھ میں لئے کھڑا رہا۔ اور ٹرین گذر گئی۔ میں کھڑکی میں سے اس کا منہ دیکھتا رہا۔ اور وہ اپنا ہاتھ جس میں آٹھ آنے تھے خاصہ دلچسپ سفر رہا۔

گوجرانوالے سے حافظ آباد کے لئے ایک بس میں سوار ہوئے۔ اب ادھر بھی بڑی بڑی (سپر کانسٹی لیشن) بسوں کا رواج چل نکلا ہے۔ اس کے باوجود ڈرائیور کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"ڈرائیور کو تیز گاڑی چلانے پر مجبور نہ کریں"

"خدا سے ہمیشہ ڈریں"

مجھے تو اس ڈرائیور سے بھی ڈر آ رہا تھا اس لئے کہ اس نے گوجرانوالے کے تنگ بازاروں میں ہی گاڑی کو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار پر اٹھا لیا۔ سارا راستہ وہ ایک ہاتھ سے موٹر چلاتا رہا۔ اور دوسرا ہاتھ باہر نکالے سگریٹ پیتا رہا۔

گوجرانوالے سے حافظ آباد تک کا راستہ بڑا سرسبز و شاداب ہے۔ اگرچہ گیہوں کی فصل کٹ جانے سے کہیں کہیں کھیت ویران

سے تھے۔ مگر جگہ جگہ مونجی کی پنیریاں لہرا رہی تھیں اور پانی کھیتوں میں گوڈی ہو رہی تھی۔ چھوٹی سی پکی سڑک پر دو رویہ پنجاب کے محبوب درخت ٹاہلی کی قطاریں کھڑی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے میل پر ایک آدھ نہر کا پل آجاتا۔ جہاں آدمی بیل۔ بچے۔ بھینس نہا رہی ہوتیں اور عورتیں کپڑے دھو رہی ہوتیں۔

بہت جلد حافظ آباد آگیا۔ یہ قصبہ میں نے پہلی بار دیکھا۔ اور اس میں وہ تمام خصوصیات پائیں جو پنجاب کیا پاکستان کے ہر قصبے کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کچے پکے کھنڈر نما مکانوں کے سامنے گندے نالے گذر رہے تھے۔ اندھے فقیروں کی طرح وہ جس طرف سے چاہتے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ہمارے مصری شاہ کا نالہ بھی اندھا ہے۔ مگر اس کے ہاتھ میں لکڑی ضرور ہے جس کا کھڑکا کرکے وہ راہگیر کو اپنی آمد سے خبردار کر دیتا ہے۔ لیکن حافظ آباد کے گندے نالوں کو میں نے بالکل اندھا پایا۔ نہ ہاتھ میں لکڑی نہ پاؤں میں جوتا نہ سر پہ کھجوری ٹوپی ــــ بس چلے آ رہے ہیں، بہے آ رہے ہیں ؎

سخی کی خیر مائی باوا کی خیر

تیرا اللہ نگہبان ہو

بس اڈے میں داخل ہوئی اور داخل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دیوار آگئی جس پر ایک جگہ عورت کے ہاتھ میں جھاڑو دے کر نیچے لکھا ہے۔

"زنانہ کے لئے"

یہاں سے ڈرائیور صاحب نے پورا گھوم کے بس کو زور سے گھمایا اور دھڑن سے چھت کے نیچے لا کھڑا کیا۔ بس کھڑی ہوئی تو خوانچے والوں اور مزدوروں نے شور مچا دیا۔ ایک کالا سا لڑکا مرمرے کا تھال لے کر ہمارے پاس آ گیا۔

"مرمرا کھاؤ۔ خستہ مرمرا کھاؤ"

بھلا دوپہر کو کون مرمرا کھائے گا۔ میرے پاس سے ہی ایک عورت بولی۔

"دے چھورے مرمرے والے"

اس نے ایک آنے کا مرمرا لیا۔ اور بڑے مزے سے کھاتی ہوئی اپنی پٹاری سر پہ اٹھا کر چل دی۔

شجاعت صاحب ہمیں اپنے ڈیرے میں لے گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ یہاں دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کیا جائے اور جب دھوپ ڈھل جائے تو بادلِ نخواستہ "سڑک پہ اپنا آخری سفر شروع کیا جائے۔ یہ ڈیرا عام ڈیروں سے اگرچہ چھوٹا اور ویران سا تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اندر کمرے میں کا لمبا پنکھا لگا تھا۔ یہاں ۴۰، ۴۵ برس کے ایک پختہ عمر بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ جو اپنی عمر کا بیشتر حصہ سیاسی سرگرمیوں اور قوم کی بے لوث خدمت میں صرف کرنے کے بعد اب اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ یہ قوم کبھی بیدار نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ خود بھی سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ انھوں نے بڑے کھرے اور سچے انداز میں دیہات اور عام دیہاتیوں کے المناک مسائل پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ یہ لوگ کس طرح ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں اور شہروں سے دور۔ بیماری۔ تاریکی غربت اور بے بسی کے عالم میں خدا پہ بھروسہ کئے زندگی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر میرے دل نے کہا۔ واپس چلے چلو۔ یہاں بھی لاہور ہی ہے۔ یہاں وہ سکون نہیں جس کی تلاش میں تم نے لاہور کو اور اس کی مال اور میکلوڈ روڈ کو چھوڑا ہے۔ لیکن دل نے کہا یہ تو قصبہ ہے۔ شہر کا پردیسی بیٹا۔ ذرا گاؤں تک تو چلو۔

دوپہر کے کھانے پر ایک عدد مرغی کا صفایا ہو گیا۔ یہ مرغی ڈیرے میں کام کرنے والے کمیوں نے پکائی۔ مگر بے حد لذیذ پکائی۔ فوراً اپنا گھر اور محلے کی مرغیاں یاد آگئیں۔ خدا ہماری واپسی تک محلے کی مرغیوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔ کھانا کھا کر آرام کرنے لگے۔ تو ایک آدمی پنکھا کھینچنے کے لئے آن حاضر ہوا۔ جب ایک آدمی پاس ہی بیٹھا پنکھا کھینچ رہا ہو اور ساتھ ساتھ دیکھ بھی رہا ہو تو آرام کہاں؟ میں نے پہلو بدل کر اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ ذرا دیر بعد میں نے بہانے سے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بدستور رسی ہلاتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری پیٹھ ننگی ہے۔ میں فوراً اٹھ بیٹھا۔

"نیند نہیں آتی بابو صیب"

میں نے آنکھیں ملنا شروع کر دیں۔

"ابھی آجائے گی۔ میرے بھائی۔ تم ذرا پانی پلا دو۔" وہ اُٹھ کر پانی لینے چلا گیا۔ چنانچہ دھوپ ڈھلنے تک میں بار بار پانی پیتا رہا۔ اس کے بعد جب ذرا گرمی کم ہوئی تو ہم لوگ تانگے پر بیٹھ گئے اور تانگہ مشہور و معروف سڑک "بادل نخواستہ روڈ" پر چلنے لگا۔ تھوڑی دیر تک چلنے کے بعد کوچوان رُک گیا۔ گھوڑا بھی رک گیا۔ اور ساتھ ہی تانگہ بھی رک گیا۔ کوچوان بولا۔

"ذرا گھر اطلاع کر آؤں، کہ موضع ماموں جا رہا ہوں۔"

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنی والدہ صاحبہ سے اپنا کہا سُنا معاف کروانے گیا تھا۔ کیونکہ اس سڑک پر سے شاذ و نادر ہی کوئی کوچوان پلٹتا ہے۔

اب ہمارا وہ سفر شروع ہوتا ہے جو کبھی کولمبس کو نئی دنیا دریافت کرتے ہوئے درپیش ہوا تھا۔ تانگے کے آگے اور کوچوان کے پیچھے جو گھوڑا جتا تھا وہ اصل گھوڑے کا ایکسرے تھا۔ گھوڑے صاحب کو بھی ہمارے ارادوں کا پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے پہلا قدم یوں اٹھایا کہ ایک بھونچال سا آگیا۔ اور ہمیں یوں لگا گویا ہم اونٹ پر سوار ہیں۔ اور سفر موت درپیش ہے۔ گرمی ہے۔ صحرا ہے۔ ریت کے بگولے ہیں۔ مگر خدا حافظ و مددگار ہے۔ کوئی پروا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا نا کہ واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔ پھر کیا ہوا۔ مرد کا قدم ایک بار آگے بڑھ کر پیچھے نہیں ہٹا کرتا۔

الوداع! لاہور والے گھر۔

الوداع ہمسائے کی مرغیو۔

پانچ چھ میل کا سفر زندگی بھر اور شاید موت کے بعد بھی یاد رہے۔ تانگہ دو کالم فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا تھا۔ اور ہم ہزار بار فی سکنڈ کے حساب سے ہل رہے تھے۔ سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ کوچوان گھوڑے کے گرد گھوم رہا تھا۔ گھوڑا تانگے کے گرد گھوم رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ زمین کس قدر تکلیف دہ حد تک گول ہے۔ شجاعت صاحب نے ہر طرح سے ہمارا خیال کسی اور طرف لگانے کی کوشش کی۔ مگر اس میں ان کا کیا قصور۔ قصور تو صرف دو اصحاب کا تھا۔ پہلے گیلیلیو صاحب کا جنھوں نے یہ نظریہ دریافت کیا۔ کہ زمین گھومتی ہے۔ اور دوسرے اس کوچوان صاحب کا جنھوں نے اس نظریئے پر عمل کیا۔ اور زمین کو گھما کر دکھایا۔

جب آدھا سفر طے ہو گیا تو شام ہو گئی۔ اور آس پاس کھیتوں میں مٹیالے رنگ کا اندھیرا خاک بن کر اڑنے لگا۔ اور ایک بے نام سی بیقراری کر دینے والی اداسی چاروں طرف چھا گئی۔ مشرق کی طرف خاکی رنگ کے درختوں کے جھنڈوں پر پھیکا سا زرد چاند نمودار ہو گیا اور اس کی پژمردہ چاندنی میں کلر زدہ زمین یوں دکھائی دینے لگی۔ جیسے کوئی سیلاب زدہ دریا بہتے بہتے یکدم رُک گیا ہو۔ سیم کا پل عبور کرنے کے بعد شجاعت نے کوچوان سے کہا۔

"پہیہ گیل میں ڈال دو"

اور مجھے فلم "جوگن" کا وہ درد بھرا گیت یاد آگیا ؎

ہم کو گیل بتا جا جوگی
مت جا مت جا

مگر نہیں مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔ خواہ تانگے کا پہیہ گیل میں چلے یا سیم کے نالے میں چلے۔ چلتا چل چلتا چل! میرے پیارے کوچوان! میرے پیارے گیلیلو۔

چنانچہ جس وقت ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو شام گہری ہو گئی تھی۔ اعضا پر اس قدر تھکن اور پژمردگی طاری تھی۔ جیسے

سے پاؤں پیدل چل کر موضع "ماموں کی" آئے ہوں۔ ہمارے آنے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ سڑک سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ تلے ایک جگہ لالٹین جلائے ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔ چھوٹی سی پیاری بچی مونا نے لالٹین کی روشنی میں گاؤں کی تنگ اور کچی گلیوں میں گھر تک ہماری رہنمائی کی۔ شجاعت صاحب نے ہمارا سامان وغیرہ اتروا کر ساتھ لیا۔ اور ہم ایک حویلی نما دروازے کے اندر داخل ہوئے۔ جہاں بڑے لیمپوں کی تیز روشنی میں کچھ عورتوں اور گھر کی ہنس مکھ مالکہ نے خندہ پیشانی سے اور دعا وسلام سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ یہ پنجاب کے دیہات کی خاص روایات ہیں۔

سفر کی تھکان سے دل و دماغ اس قدر نڈھال تھا کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صرف اس قدر احساس ہوا کہ مکان کافی کشادہ ہے اور تینوں جانب لمبے لمبے ستونوں والے برآمدے ہیں۔ اس کے بعد فوراً چھت پر چارپائیاں بچھا کر بچھونے لگا دئیے گئے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چادریں۔ خنک صاف ستھرے بچھونے۔ گاؤں کی ٹھنڈی ٹھنڈی مدھ بھری ہوائیں ـــ اور قیامت خیز سفر کی تھکان۔ بستر پر گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ اور رات بھر خواب کی بھی فرصت نہ ملی۔

سویرے جو آنکھ کھلی تو سامنے نیم کا بڑا سا پیڑ نظر آیا جس کی شاخیں میٹھی میٹھی خوشگوار ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ سب سے پہلی آواز جو کان میں پڑی وہ دودھ بلونے کی تھی۔

گرڑ... گرڑ... گرڑ... گرڑ.....

نیچے صحن میں دودھ بلویا جا رہا تھا۔ کچھ عجیب سا لگا۔ پہلے یوں لگا۔ جیسے ابھی تک لاہور میں ہیں اور باہر سڑک پر تربوزوں سے بھرا ہوا ٹرک کھڑا ہے اور اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن جب ایک آدھ گھر سے چکی کے گھمر گھمر چلنے کی آواز بھی آنے لگی۔ تو دل نے کہا۔ نہیں یہ لاہور نہیں ہے۔ میوہ منڈی اور مصری شاہ نہیں ہے۔ بلکہ موضع "ماموں کی" ہے۔ اور تو یہاں گاؤں کی سیر کو آیا ہوا ہے۔ اُٹھ اور اٹھ کر گاؤں کی زندگی کا مطالعہ کر۔ تاکہ بعد میں اس پر کچھ لکھ کر پیسے کما سکے۔

میں بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا اور دیکھا کہ ایک لمبی چھت پر بستر لگا ہے۔ اور پاس ہی چھوٹے سے تخت پوش پر مٹی کا گھڑا۔ کانسی کا گلاس اور بجھی ہوئی لالٹین پڑی ہے۔ دن نکل آیا ہے۔ اور ارد گرد کچے مکانوں کے درمیان کہیں کہیں شہتوت، نیم اور ٹاہلی کے درخت صبح کی ہوا میں جھوم رہے ہیں۔ کچے مکانوں کی چھتیں بڑی نفاست سے پوتی گئی تھیں۔ اور سیڑھیاں اس قدر صاف ستھری تھیں کہ پاؤں رکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ چھتوں پر چارپائیاں بچھائے کہیں کہیں عورتیں اور بچے ابھی تک سو رہے تھے۔ ساتھ والی دیوار کے نیچے ایک ادھیڑ عمر کی عورت "رڑکنا" دیوار کے ساتھ لگائے چاٹی میں سے مکھن نکال نکال کر مٹی کے کوزے میں ڈال رہی تھی۔ پاس ہی ایک جوان عورت میلا سا کرتا اور سیاہ دھوتی پہنے اپنے ننگے بچے کو سینے سے لگائے ننگی چارپائی پر سو رہی تھی۔ ایک آدمی کیکر کے درخت سے کیپ چلاتے ہوئے منہ دھو رہا تھا۔ ایک مکان پر ایک عورت نے چارپائی سر پہ اٹھائی۔ بچے کو بغل میں دبایا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ یہ مکان اس قدر پرانی طرز کے بنے ہوئے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ موہنجو داڑو سے بھی پہلے کے ہیں۔ اس دور میں تو گلیاں پکی اینٹوں سے تعمیر ہوتی تھیں۔ اور پانی کے نکاس کا بہترین انتظام تھا۔ مگر یہاں گلیوں میں گندی نالیاں اپنے آپ بہتی چلی جاتی تھیں

ایک مکان کے منڈیر پر ایک مرغی اپنے چوزوں کو ساتھ لئے گردن جھکائے نیچے جھانک رہی تھی۔ جہاں ایک آدمی چند ایک مریل گدھوں کو ڈنڈے مار مار کر گھر سے باہر ہانک رہا تھا۔ چھت پر دو ننگ دھڑنگ بچے منڈیر سے لگے تھے۔ ایک رو رہا تھا اور دوسرا جو بڑا تھا اسے کان سے پکڑ کر نیچے گھسیٹ رہا تھا۔ اتنے میں شجاعت بھائی اوپر آ گئے اور کہنے لگے۔

"مطالعہ ہو رہا ہے"!

میں ہنس پڑا اور ہم نیچے آ گئے۔ شجاعت صاحب کا مکان حویلی نما تھا اور زمینداروں ایسا گھر تھا۔ جہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ نوکر چاکر، گھی، مکھن، دودھ، اناج ـــ اور یہاں تو بیٹری والے دو ریڈیو بھی تھے۔ ایک ان کے بھائی کا ہے۔ اور ایک ان کا اپنا۔ ہم باہر

سیر کے لیے چل دئے۔ صبح مجھے پتہ چلا کہ رات جہاں لالٹین کی روشنی میں ہماری رہنمائی کی تھی وہاں شجاعت نے اپنی ایک چھوٹی سی کوٹھی بنوا رکھی تھی۔ جس کے گرد ایک خوبصورت باغ بھی ہے۔ یہیں ان کے چھوٹے بھائی صفدر سے ملاقات ہوئی جنہوں نے اپنے دوست سائیں بودے شاہ سے ملایا۔

سائیں بودے شاہ گوندلوں کا پیر تھا۔ اور بھنگ کا رسیا۔ جو ہمیں گھنٹے بھنگ کے نشے میں ڈوبا رہتا تھا۔ تعارف سے چند لمحے پہلے آپ کھیتوں میں گھوم پھر کر بھنگ کی بوٹی جمع کر رہے تھے۔ سوکھا سا چہرہ۔ لمبا قد اور کھری کھری سی آواز۔

ہم لوگ جامن کے درخت تلے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک مستری صاحب تشریف لائے۔ ہاتھ میں تیسی اور کانڈی۔ سر پر میل بھرا صافہ۔ جسم ننگا۔ نیچے میلا کچیلا تہمد۔ پاؤں میں ٹوٹی ہوئی جوتی اور لمبی کھچڑی داڑھی۔ صفدر کہنے لگا۔

"رات ڈیرے میں مولوی صاحب بحث کرتے کرتے چارپائی پر سے اچھل پڑے۔ بڑی مشکل سے رسہ ڈال کر انہیں لایا گیا۔" معلوم ہوا کہ آپ شیعہ سنی بحثوں میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ اور اب قلعہ والوں کے گاؤں میں کنوئیں کا چک بنانے جا رہے ہیں۔ حقہ پی کر مستری صاحب سلام کر کے چلتے بنے۔ اتنے میں ایک اور صاحب تشریف لائے۔ ادھیڑ عمر۔ سنواری۔ کمزور جسم۔ مضبوط ہاتھ پاؤں کالا تہمد۔ جسم سے ننگے۔ وہی پھٹی ہوئی جوتی۔ آن کر سلام کیا۔ اور زمین پر بیٹھ کر صفدر کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ جب ہنسے تو معلوم ہوا کہ منہ میں اوپر کی طرف دانتوں کا صفایا ہو چکا تھا۔ صفدر نے کہا۔

"پھر کچھ لینا ہوگا تم کو رحمو"

رحمو ہنستا گیا۔ پھر بولا۔

"بات یہ ہے چودھری جی کہ مجھے اعظم گوندل کے پیسے دینے ہیں۔ اعظم گوندل کو بھکی کمہار کے دینے ہیں اور بھکی کمہار کو سلو نائی کے دینے ہیں۔ سلو نائی بھکی کمہار کو تنگ کرتا ہے۔ بھکی کمہار اعظم گوندل کو تنگ کرتا ہے۔ اور اعظم گوندل مجھے نہیں جینے دیتا آج اس نے مجھے ہل بھی نہیں جوتنے دیا"

پتہ چلا کہ معاملہ صرف سوا تین روپوں کا ہے۔ سوا تین ایک۔ سوا تین دو۔ سوا تین تین — مجھے اب پتہ چلا تھا کہ جتنے پیسے ہم سینما دیکھ کر اور باہر آ کر بھول جاتے ہیں اتنے پیسوں میں اتنی طاقت بھی ہے کہ گاؤں میں جتے ہوئے ہل بھی رک جاتے ہیں۔ سلو نائی بھکی کمہار کو تنگ کرتا ہے اور اعظم گوندل رحمو کو کھیت سے باہر نکال دیتا ہے۔

اسی باغیچے میں ایک دبلے پتلے کسان سے ملاقات ہوئی۔ جو اپنے گھٹنے سینے سے لگائے ان کے گرد صافہ لپیٹے بڑے مزے سے چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی۔ پتہ چلا کہ اس نے ابھی تک لاہور نہیں دیکھا — اور گوجرانوالہ بھی زندگی میں صرف ایک بار گیا ہے۔ میں اسے بار بار دیکھ رہا تھا۔ اور اسی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جس دلچسپی سے وہ پہلی بار لاہور کو دیکھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ یہ شخص لاہور دیکھے بغیر کس دلجمعی اور سکون سے بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔ آخر لوگ لاہور دیکھے بغیر کیونکر زندہ رہتے ہیں۔

یقیناً اُن کے پاس کوئی نسخہ ہے کسی سنیاسی باوا کا دیا ہوا ٹوٹکا ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے اپنے ساتھ لاہور لے چلوں اور جب یہ لاہور دیکھ رہا ہو تو میں اسے لوگوں کو دکھاؤں۔ بلکہ اگر ہو سکے تو کسی ڈاکٹر کو بھی دکھاؤں۔ اور اس سے دریافت کروں کہ یہ شخص۔ مال۔ میکلوڈ۔ نارلین منزوا در تھری ڈی دیکھے بغیر کیونکر زندہ ہے اور مطمئن ہے۔

جب ہم باغیچے سے اٹھنے لگے تو شجاعت بھائی نے اپنے مزارع نواب سے ملایا۔ مضبوط جسم اور چوڑے چکلے چہرے والا نواب۔ فلم اسٹار ثریا پر دل و جان سے عاشق ہے۔ اور لاہور اکثر آتا رہتا ہے۔ عاشق وہ ثریا پر ہے مگر ثریا اور مدھوبالا کی تصویروں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ اس کا عشق ثریا سے اچھل کر مدھوبالا کی جھولی سے ہوتا ہوا ساری

فلمی دنیا میں پھیل گیا ہے۔ اس نے بڑی عاشقانہ بے نیازی سے کہا کہ اگر ثریا صرف ایک بار اس کے لئے کھیتوں میں دیکھ بھال کرنے آ جائے۔ تو وہ دو کلے زمین پر اس کے لئے مفت مہندی بو دے۔

یہاں سے اٹھ کر ہم لوگ گھر آ گئے۔

ناشتہ پر خالص اور تازہ مکھن، لسی، خوشبودار کچا دودھ اور گھی میں تلے ہوئے پراٹھے تھے۔ پراٹھے کا نوالہ احمد آبادی مرحوم پان کی طرح منہ میں رکھتے ہی گھل جاتا۔ ناشتے کے بعد میں باغیچے میں جا کر جامن کے درخت تلے سو گیا۔ لیکن اس سے پہلے میں نے اس شخص کو سلا دیا جو میری خدمت پر مامور تھا۔

دوپہر کو شجاعت بھائی نے آ کر جگایا۔ گھر کے بڑے کمرے میں مل کر سب نے کھانا کھایا۔ بڑا پر تکلف شہریوں ایسا کھانا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ یہاں ہر چیز خالص اور اصلی تھی۔ کھانا کھا کر سونے لگے۔ تو یہاں بھی وہی مسئلہ سامنے آن بیٹھا۔ جو جانڈا آباد میں پیش آیا تھا۔ یعنی ایک بچی پنکھا کھینچنے کے لئے حاضر ہو گئی۔ پہلے تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگا کہ یہ کس قدر زیادتی ہے۔ ایک معصوم بچی پنکھا کرے۔ اور تم آرام سے سوؤ۔ پھر میں نے بھی ضمیر کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

"الو کا پٹھا! ہر وقت پیچھے لگا رہتا ہے۔ جہاں کہیں آرام کی گھڑی آتی ہے۔ بیچ میں آن کھڑا ہوتا ہے" مگر میرے ضمیر نے میری ایک نہ چلنے دی۔ چنانچہ میں نے بیٹری ریڈیو آن کر دیا۔ ماسٹر نصیر الدین قوالی گا رہے تھے۔

چپ کر دھڑ وٹ جا
نہ کھول توں عشق خلاصہ
چپ کر دھڑ وٹ جا

چنانچہ میرا ضمیر مجھ سے پہلے سو گیا۔ اسے سلانے کے بعد جب میں نے محا دیکھا خاموش دیکھا تو بڑے آرام سے ٹانگیں پھیلا کر سو گیا۔ تیسرے پہر آنکھ کھلی تو گرمی زوروں پر تھی۔ اور پنکھا کھینچنے والی بچی اسی طرح بیٹھی پنکھا کھینچ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کمسن بچی جیسا استقلال مجھ میں آ جائے تو میں کیا کچھ نہ کر گذروں۔ چائے کا وقت تھا۔ مگر گاؤں میں چائے کہاں؟

یہاں کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس کہاں؟ چنانچہ فوراً کھیتوں میں سے ایک تربوز کاٹ کر لایا گیا۔ سرخ۔ گہرا سرخ تربوز! جو بے حد میٹھا اور خوشگوار تھا۔

شام کو گاؤں کی سیر کو نکلے۔ پاس ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو ٹھٹھی کہلاتا تھا۔ اس گاؤں کے باہر ایک بہت بڑا گندہ تالاب تھا۔ جس کی گندگی اور سڑاند سارے گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس گاؤں کی تنگ اور پرپیچ گلیوں میں سے گذرتے ہوئے میں نے ایک جگہ تندور پر عورتوں کا ہجوم دیکھا۔ کچھ آٹا گوندھ رہی تھیں اور کچھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ موضع ماموں کی اور ٹھٹھی کے درمیان آم کا ایک چھوٹا سا باغ آیا۔ درختوں کے درمیان چھوٹی سی کھٹولی پر رکھوالا لڑکا سو رہا تھا۔ اس کی گوپھیا زمین پر گر پڑی تھی۔ اور منہ پر پسینہ آیا ہوا تھا۔ اوپر درختوں کی ٹہنیوں پہ کچے کچے اچاری آم لٹک رہے تھے۔

رات کو حویلی کے کھلے بیسے کوٹھے پر سوئے۔ ہمیں ایک ادھیڑ عمر کی ہمسائی نے بتایا کہ گاؤں کے بھوتے سکول کی استانی جو کہ ہیڈ مسٹریس بھی تھی۔ ہمیشہ کے لئے شہر چلی گئی ہے۔

"بڑی بد دماغ تھی۔ کہنے لگی۔ میں تو یہاں کبھی نہیں رہوں گی"

لیکن بعد میں پتہ چلا کہ اسکول ایک آدمی کے گھر میں بنایا گیا تھا۔ چنانچہ ایک طرف کلاس شروع ہوئی اور دوسری جانب اُپلے تھاپے جا رہے ہوتے تھے۔ اور چولہے پہ ہنڈیا چڑھی ہوتی تھی۔ اور بچے رو رہے ہوتے تھے۔

اب گول گول، زرد چاند ــــ گاؤں کا اداس اور زرد چاند نکل آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہوا چل نکلی۔ اور آنگن والے نیم کے

پیڑ کے پتے سرسرانے لگے ۔ دوسرے روز شجاعت صاحب کے ڈیرے میں بڑے چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی ۔ پختہ عمر، تیکھے خوبصورت نقش، سانولا رنگ ۔ انھوں نے دیر تک گاؤں والوں کی تعلیمی حالت اور اقتصادی بدحالی پر گفتگو کی ۔ اور آخر میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ شہر کے پڑھے لکھے نوجوان طبقے کو چاہیے کہ وہ دیہات میں آکر یہاں کے لوگوں سے براہِ راست ملیں ۔ اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کریں ۔ میں بھی ان مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نورا نامی حجام استرے کو چمڑے کے پٹے پر تیز کرتا ہوا اندر داخل ہوا ۔

" السلام علیکم ۔ بابو صیب کہاں ہیں ؟

میں سہم کر پرے ہو بیٹھا ۔ مگر اب وہاں سے بچ کر نکلنا ناممکن تھا ۔ چنانچہ اس نے پانی سے میری بڑھی ہوئی داڑھی کے بال گیلے کرنا شروع کر دئیے ۔ معلوم ہوا کہ وہ بغیر صابن کے شیو بنائے گا ۔ میں کانپ گیا اور دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا ۔ نورے نے گال پر استرا پھیرتے ہی ایک خوبصورت کٹ لگا دیا ۔ میں چپکا ہو رہا ۔ کہنے لگا ۔

" اگر داڑھی رات سے بھگوئی ہوتی تو بڑی آسانی ہوتی ۔"

" وہ کیسے ؟"

" بس گیلا کپڑا باندھ کر سو جاتے ۔ پھر استرا یوں پھرتا ۔ جس طرح ڈیرے میں جوائی پھرتا ہے ۔"

میں نے کہا ۔ عزیزی نورا ! میرے بالوں پہ رحم کرو ۔ جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں ۔ مگر نورے نے میری ایک نہ سُنی ۔

میں نے پوچھا : " نورے ! پہلے کیا کرتے تھے ؟"

وہ بولا ۔ " جی بھیڑیں مونڈا کرتا تھا ۔

حضور نے کہا ۔ جب سے نورا ہمارے گاؤں میں آیا ہے یہاں ٹنڈوں والے کنوؤں میں اضافہ ہو گیا ہے ۔

نورا ہنسنے لگا ۔ اور اس کی سرمگیں کالی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا ۔ اتنے میں بوڑھے شاہ جی بھی تشریف لے آئے ۔ آپ کونڈی اور بوٹی لے کر کیکر کی چھاؤں تلے بیٹھ گئے ۔ اور بھنگ گھوٹنا شروع کر دی ۔ جب بھنگ اچھی طرح گھونٹی گئی تو آپ نے اسے پیالے میں چھانا ۔ اور لبالب بھرا ہوا پیالہ منہ کے پاس لے جا کر زور سے نعرہ لگایا اور بولے :

بل بل بل آئی بلا ٹل

ابھی ایک گھونٹ پیا تھا کہ منہ سکیڑ کر پیالہ نیچے رکھ دیا ۔ معلوم ہوا کہ کھانڈ نہیں ڈالی تھی ۔

شام کو میرا جی اداس ہو گیا ۔ اور لاہور یاد آنے لگا ۔ میں نے ریڈیو آن کیا اور کلکتہ ریڈیو اسٹیشن پر سوئی جما دی ۔ وہاں سے رابندر سنگیت نشر کیا جا رہا تھا ۔ رابندر سنگیت کی اداسی میں ہمارے پنجاب کی اداسی تھی ۔ میں نے کھڑکی کھول دی ۔ دھوپ میں کھیت تپ رہے تھے ۔ میرا دل اور زیادہ اداس ہو گیا ۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی ۔ ریڈیو بھی بند کر دیا ۔ اور نورا ایک خربوزہ کاٹ کر کھلانے لگا ۔ کمسن نوکرانی پنکھا کھینچنے آن حاضر ہوئی ۔ اور اس کے ساتھ ہی میرا ضمیر بھی ۔

دوسرے دن صبح میں موضع اموں کی سے واپس چل پڑا ۔ شجاعت صاحب نے تانگے کی ٹریجڈی میں ہمارا حشر دیکھنے کے بعد اب حافظ آباد سے ٹیکسی منگوائی تھی ۔ جیسے ڈرائیور نے بونٹ پر زور سے لات مار کر اسٹارٹ کیا ۔ اور لات مار کر ہی حافظ آباد میں ٹھہرایا ۔ بس کے اڈے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک جگہ تانگے کی ایک بار پھر زیارت کی ۔ جو ہمیں حافظ آباد سے موضع اموں کی لے گیا تھا ۔ میرے سارے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی ۔ مجھے فوراً خیال آ گیا کہ زمین گول ہے اور گھومتی چلتی ہے ۔

الوداع ! پیارے گوجوان ! الوداع پیارے گاؤں ۔۔۔ !

پیارے غیر ملکی ادیب

● کیدار ناتھ ● دعوتی خط

یہ عجیب المیہ حادثہ ہے کہ اب ہندوستانی ادیب بھی رڈیارڈ کپلنگ کے منہ آنے لگا ہے۔ آہ! وقت کس تیزی سے زیر کو زبر بناتا جا رہا ہے —— ہندوستانی تہذیب کو ہم نے اس تیزی سے گستاخ ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میرے پیارے برطانوی یا امریکی ادیب!

یہ مخلصانہ اور فوری دعوت خاص طور پر آپ ہی کو دے رہا ہوں۔ کیونکہ آپ کا ملک اخباروں، ٹیلی ویژن، راکٹ اور ہائیڈروجن بم کا ملک ہے۔ اس لئے آپ ہندوستان کے اس خوفناک بحران سے ضرور واقف ہوں گے جس میں سے آج کل وہ گذر رہا ہے۔ میں بحران کا لفظ ایک بار اور دہرانا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ اس اعادہ کی چند وجوہ میرے ذہن میں آ رہی ہیں ——

جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ سانپوں کی اس سرزمین نے غیر ممالک کے بچوں کے دلوں میں جو بھی تھوڑا بہت وقار اور احترام حاصل کیا ہے۔ وہ صرف آپ کی وجہ سے ہے۔ ہم ایک شرمناک دھند کے باسی تھے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ایک غیر مہذب تہذیب کے غلام تھے لیکن آپ نے ہمارے جسم اور کردار میں عالمگیر دلچسپی پیدا کی اور مغرب کی نگاہوں میں ہماری سماجی اور اخلاقی قدروں کو جنم دے ڈالا۔

چنانچہ آپ کی ان بے اندازہ خدمات کی بنا پر میں اپنے اہل وطن کی طرف سے آپ کی خدمت میں نہایت ہی پرجوش شکریہ اور تعریف پیش کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی ایک مستقل قسم کا یقین دلاتا ہوں کہ اس وسیع بیابان کے دروازے آپ کی دوستانہ مداخلت پر ہمیشہ کھلے رہیں گے۔

ہاں تو میں اسی بحران کی طرف آپ کی توجہ دلا رہا تھا جس کا آج ہندوستان کو سامنا ہے۔ بلا شبہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن کم از کم یہ بات مجھولوں کی تعداد۔ ان کی نشوونما اور ان کے پھلنے پھولنے کو ضرور سامنے لاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے یہ نادر موقع ہے کیونکہ فطرت نے آپ کو ایک غیر معمولی نظر عطا کی ہے بالخصوص ان ممالک کے۔ لئے جن کے باشندوں کو آپ کی نسبت کم نظری نصیب ہوئی ہے اور اس کے علاوہ آپ کو ایک یقینی فنی مہارت بھی حاصل ہے۔

یقیناً آپ اہل نظر ہیں اور اپنے گہرے خیالات کو ایک ایسی ششدر کر دینے والی زبان میں پیش کرتے ہیں جو نہایت طرار ہوتی ہے جسے ہمارے سست رفتار ذہن نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ وہ حیرت، تقدس اور احترام کے ساتھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا صورت حالات آپ کے تومند قلم کی راہ دیکھ رہی ہے۔ مہربانی فرما کر آپ اب بے کار شش و پنج میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ وقت آپ کے لئے ڈالر ہے اور ڈالر ہی وہ راہبر پرستش ہے جو آپ کے اخلاقی گورکھ دھندے آپ کو سکھاتی ہے۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو یہاں اتنا زیادہ وقت صرف کرنا نہیں پڑے گا جس سے آپ کو گھر کی یاد ستانے لگے۔ کیا صرف ایک ناول ایسا معمولی کام سر انجام دینے کے لئے یہ ایک شدید حماقت نہیں ہوگی کہ سالہا سال ایک خشک، بے برگ و بار، کم فہم اور جنگلی وحشیوں کے ملک میں رہا جائے۔

اور سب کا رمغز کھپائی کی جائے۔

بہر کیف تمہیں کیا پڑی ہے کہ "ہم" بدبودار انسانی سوسائٹی کے پورے غول کے بارے میں سوچیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ایک بچھڑے ہوئے طاعون زدہ ملک کی متعفن تاریخ اور اس کے سماجی اطوار پر غور کریں۔ جبکہ ہم اس کی بجائے ایسے پر مسرت جزیروں میں جا سکتے ہیں جہاں ایک حیران کن تنوع ہے۔ جہاں سال بھر باد نسیم گنگناتی ہے اور جہاں آئینہ ایسے ملبوسات پہنے ہوئے رقاصائیں ہمارے اعصاب کو رنگ و نور میں بھگو دینے کے لئے بے قرار ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ چند اُلٹی کھوپڑی والے احمقوں نے ناول نگاری کو محض بیگار بنا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ ناول تو ایک بے ساختہ تخلیق ہے۔ اس میں پلاٹ ہونا چاہئے، کوئی سازش ہونی چاہئے۔ محبت کا کھیل ہونا چاہئیے اور ایک ڈرامائی انجام ہونا چاہئے۔

ناول کا یہ قطعی مقصد نہیں ہے کہ وہ ایک اکتا دینے والا مُطالعہ ہو۔ لوگوں کے رسم و رواج اور رہن سہن کا اور وہ بھی ایک خاص نظریاتی زاویۂ نگاہ سے ————!

یہ ظاہر ہے کہ آدمی مسرت کے لئے کما تا ہے۔ اپنی اور دوسروں کی مسرت ———— اور لوگ اتنے احمق نہیں ہیں کہ وہ بھاری بھر کم سماجی مطالبوں کا غم کھاتے رہیں۔ "ٹھیکرے" اور "ڈکنس" کے دن ہوا ہوئے۔ اور اس خلیل خاں "ڈرائٹرز کی فاختہ بھی اُڑ گئی۔ اور پھر یہ غیر ضروری ہے کہ آدمی درد و غم کو قلم بند کرنے کے لئے درد و غم کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتا رہے۔

ٹالسٹائی ———— آپ جانتے ہیں ایک ایسا ہی احمق تھا۔ اس نے پانچ سال لائبریریوں میں کاٹے اور تین سال لکھنے میں۔ جب جا کر وہ صرف وار اینڈ پیس ہی پیدا کر سکا۔ ایک ایسا کوڑا کرکٹ جسے پڑھنا تو درکنار دیکھا تک نہیں جا سکتا ———— ہندوستان میں بھی ہمیں ایسے کئی سر پھرے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹیگور، سرت چندر، پریم چند۔ اور پھر وہ کل چھوکرا ملک راج آنند۔

جیسا کہ آپ کو بخوبی علم ہے کہ ناول کے لئے غیر ملک کا ماحول ایک پس منظر کی سی وقعت رکھتا ہے یعنے ایک سبزی کے مسالہ کی سی۔ تاکہ کوالٹی کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ مگر گاہک اُسے لذیذ سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کھاتے ہی جائیں۔ (میرا مطلب ہے ضرورت سے بھی زیادہ) اور آپ کو اپنی پکی ہوئی سبزی کا بہت حصہ ہے۔ اس لئے آپ کی تخلیق کا پکوان زیادہ سے زیادہ مقبول ہونا چاہئے۔ اس کے پہلے ایڈیشن کا جال پھیلتے ہی چالیس ہزار ڈالر کھنچکر چلا آئے۔ اسے بار بار چھپنا چاہئے، مہینے میں یہاں تک کہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ——— اسے سستے ایڈیشنوں اور رسائل وغیرہ میں سلسلہ وار چھپنا چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ پبلسٹی حاصل کی جا سکے۔

میں آپ کے ان سبھی جذبات سے اچھی طرح آگاہ ہوں جو آپ کے جدت پسند ذہنوں میں ہمیشہ رقص فرما رہتے ہیں اور میں اُن کا مدّاح ہوں، کیوں کہ میں نے وہ تمام تحریریں پڑھی ہیں جو آپ اور آپ کے بھائی بندوں نے میرے اور میرے ملک کے بارے میں پیش کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو فوری بلا وا دے رہا ہوں۔

مجھے الفاظ نہیں مل رہے جن سے میں ان عظیم اور لطیف ازم والے فن کاروں کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کر سکوں جنھوں نے ہمارے ہاں قدم رنجہ فرمایا۔ اور ہمارے لاشعور کو شعور بخشا۔ مثلاً مس میو نے ہندوستان پر اپنی ماں ہونے کا دعویٰ کیا۔ بیوری نکلس نے ہندوستان پر اپنا مشہور و معروف فیصلہ صادر کیا۔ اور مسٹر کپلنگ نے اس جنگلی سرزمین کی پوشیدہ شان و شوکت کا انکشاف کیا۔ نہ صرف اپنے ہم وطنوں پر، نہ صرف سارے عالم پر۔ بلکہ ہم پر بھی جو روشنی کی نہیں بلکہ تاریکی کی تانوں پر ناچ رہے تھے۔

اور یہ ہندوستانی ناول نگار ——— ! یہ تو ایک اکتا دینے والا غول بیابانی ہے۔ یہ ہندوستانیوں کے سامنے ہندوستان کی غلط ترجمانی کرتے ہیں ——— اور انھیں کوئی نہیں پڑھتا۔ سوائے ان کے اپنے کنبے کے یا ان دوستوں کے جنھیں ناول نگار کا قرضہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ قرضہ ادا نہ ہو سکے تو ناول نگار کی تعریف ہی سہی ———— علاوہ ازیں پبلشرز ان کی وقعت خوب پہچانتے ہیں اور ان کی تخلیقوں کو شائع کرنے سے جی چراتے ہیں اور یہی حال رسائل کا ہے جو ان کی فضولیات کو سلسلہ وار شائع کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

چنانچہ آپ بڑی آسانی سے یہاں بیش بہا دولت جمع کر سکتے ہیں۔ اپنے ساتھ کچھ زیادہ سامان لانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں آپ یہاں اپنے قیام کا پلان ضرور بنائیں۔ یہ پلان چار دن سے ایک ہفتے تک کے گھیرے میں بنایا جا سکتا ہے۔ یہ زیادہ بہتر رہے گا کہ آپ دہلی کے میٹروپولیٹن ہوٹل میں قیام فرمائیں۔ آپ کے کمرے کی مشرقی کھڑکی دریائے جمنا کا پورا نظارہ پیش کرے گی۔ ایک تجربہ کار آنکھ کی نسبت ایک کیمرہ آپ کا زیادہ مستقل اور معتبر ساتھی ہے۔ اس لئے آپ جمنا کے لہروں کی چند دلپذیر تصویریں کھینچ سکتے ہیں۔ تاکہ آپ اُن تصویروں کو جھیل ڈل کی مختلف کیفیتیں ظاہر کرنے کے لئے استعمال کر سکیں۔ اور یہ دعویٰ کر سکیں کہ آپ نے وادیٔ کشمیر کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔ اور آپ کے اخباروں کے ایڈیٹر آپ سے کم ذہین نہیں ہیں اس لئے وہ انھیں شائع کر کے ازحد مسرور ہوں گے۔ اور اپنے قارئین کو اس سرزمین سے روشناس کرائیں گے جسے خطۂ ہندوستان کہا جاتا ہے۔

لیکن آپ کبھی بھی اپنے کمرہ سے اکیلے نہ نکلیں اور نہ ہی برین گن اور محافظ دستے کے بغیر کیونکہ اس ملک میں ہر دس میل پر ایک جنگل کھڑا ہے۔ اور آپ خود تصور کر سکتے ہیں کہ ان میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ کھیتوں میں سیر گشت کرنے کی کوشش مت کیجئے گا کیونکہ جیسا کہ کپلنگ آپ کو پہلے ہی متنبہ کر چکا ہے کہ ایک شیر یا چیتا کبھی بھی آپ پر کود سکتا ہے اور آپ کی محبوبہ جو گھر ہی میں بیٹھی آپ کا انتظار کر رہی ہے وقت سے پہلے بیوہ ہو سکتی ہے یا کوئی سانپ آپ کی سفید چمڑی والے بدن پر دودھ کی ایک ٹھوس دھار سمجھ کر ٹوٹ سکتا ہے۔

بازاروں میں بھی نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھیے۔ یہاں بیشتر لوگ ٹھگ ہیں یا سپیرے۔ اور پگڑی پوش بیرے (انھیں مہاراجہ سمجھ کر غلطی نہ کھائیے گا) شاید آپ کی محنت سے کمائی ہوئی رائلٹی لوٹنے کے لئے آپ کو مؤدبانہ سلام بھی کریں۔

جہاں ہر ایک گھر میں ایک ایک ہاتھی کا بچہ باندھا جاتا ہے وہاں سڑکیں اور گلیاں بھی دیو قامت ہاتھیوں سے اٹی رہتی ہیں۔ وہ جیسے مست شرابیوں کی طرح چنگھاڑتے ہیں اور بدقسمتی سے ان کا رویہ آپ ایسی تہذیب اور تمنائیں رکھنے والے لوگوں کے حق میں ہمیشہ غیر یقینی رہتا ہے۔

اس سے پہلے کہ آپ اس اجنبی اور تحیر خیز برصغیر کا رُخ کریں۔ اپنے آپ کو کافی بازدار اور جدید ترین زرہ بکتر سے مسلح کر لیں۔ تاکہ آپ یہاں کے زہریلے سانپوں سے بچے رہیں۔ تاکہ یہاں کی جلی سڑی آب و ہوا آپ کے خدوخال کو سیاہی مائل نہ بنا دے۔

کتّا

——— "سڑک کے بیچوں بیچ غور و فکر کے لئے لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ شکل بالکل فلاسفروں کی سی۔ اور شجرہ دیوجانس کلبی سے ملتا ہے۔ کسی گاڑی والے نے متواتر بگل بجایا۔ گاڑی کے مختلف حصوں کو کھٹکھٹایا۔ لوگوں سے کہلوایا۔ خود دس بار آوازیں دیں تو آپ نے سر کو وہیں زمین پر رکھے، سرخ مخمور آنکھوں کو کھولا۔ حقیقتِ حالات کو ایک نظر دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ کسی نے ایک چابک لگا دیا تو آپ نہایت اطمینان کے ساتھ وہاں سے اٹھ کر ایک گز پرے جا لیٹے اور خیالات کے سلسلہ کو جہاں سے وہ ٹوٹ گیا تھا کر دیا۔ کسی بائیسکل والے نے گھنٹی بجائی تو لیٹے لیٹے ہی سمجھ گئے کہ بائیسکل ہے۔ ایسی چھچھوری چیزوں کے لئے راستہ چھوڑنا شانِ قلندری کے خلاف ہے۔

پروفیسر نفسی اور بکری

فکر تونسوی — نفسیاتی طنزیہ

میں نہیں جانتا کہ پروفیسر نفسی نے کبھی اپنا نفسیاتی تجزیہ بھی کیا ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر وہ ایسا کریں۔ تو ان کا حشر بھی میری بکری کی طرح ہوگا۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تخلیقی دودھ بھی سوکھ چکا ہے۔

تین ماہ پہلے میں نے جو بکری خریدی تھی۔ اس کا دودھ اچانک سوکھ گیا۔ میرے لئے یہ حادثہ انتہائی پریشان کن تھا کیونکہ میں بغیر بکری کا دودھ پیئے کوئی تخلیقی کام نہیں کر سکتا ——

جن دنوں میں نے پچیس روپے میں یہ بکری خریدی تھی اُن دنوں دودھ میں ملاوٹ کچھ زیادہ عروج پر تھی۔ یہاں تک کہ ایسی خبریں بھی سُنی گئی تھیں کہ دودھ میں پانی ملانے کی بجائے اب پانی میں دودھ ملا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک ڈاکٹر نے دور روپے فیس لے کر مجھے مشورہ دیا کہ تم ایک بکری خرید لو۔ تاکہ تمہیں دودھ پی کر اپنی نشو و نما جاری رکھ سکو۔ مشورہ کے مطابق میں نے ایک نہایت متین اور شریف قسم کی بکری خرید لی۔ خوش قسمتی سے اس کا لیلا مرچکا تھا اور اس کے پورے دودھ پر میرا اقتدار ہو سکتا تھا۔ بکری کے مالک نے بیس روپے بکری کے اور پانچ روپے اس کے مرے ہوئے لیلے کے وصول کر کے بکری کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دے دی۔

تین ماہ تک وہ پوری سادگی اور انہماک سے دودھ دیتی رہی۔ لیکن اچانک دودھ کی تعداد کم ہونا شروع ہوگئی اور پھر ایک دن وہ بالکل سوکھ گیا۔ میں بھاگم بھاگ اسے مویشیوں کے ہسپتال کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے میرے ساتھ دوستانہ مروت برتتے ہوئے کہا —— "فکر صاحب! اس بکری کو کم از کم چالیس روپے کے انجکشن لگائے جائیں گے جب جا کر کہیں اس کے تھنوں میں سے دودھ اُترے گا۔"

میں نے کہا "مگر ڈاکٹر صاحب! میں نے تو یہ بکری پچیس روپے میں خریدی تھی۔ پچیس کی بکری کو چالیس روپے کے انجکشن کیسے لگ سکتے ہیں؟ ——"

ڈاکٹر نے مجھے سمجھایا۔ "انجکشن ولایت سے آتے ہیں۔ مگر بکری ہندوستان میں تیار ہوتی ہے۔ اس لئے دونوں کے مارکیٹ ریٹ میں فرق ہے۔"

بادلِ ناخواستہ میں بکری کو اپنے گھر لے آیا۔ اور کئی دنوں تک بکری میری طرف اور میں بکری کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ ہم دونوں کے تخلیقی سوتے سوکھ گئے تھے اس لئے ہم دونوں کی آنکھوں میں ایک درد مشترک پیدا ہو گیا تھا۔

ایک دن پروفیسر ڈاکٹر نفسی میرے گھر تشریف لائے وہ میرے نہایت غم گسار قسم کے دوست تھے۔ اور مقامی کالج میں علم نفسیات کے پروفیسر تھے اور پورن یونیورسٹی میں اتھارٹی تسلیم کئے جاتے تھے۔ انھوں نے میری بکری کی طرف دیکھ کر کہا:—

"تمہاری بکری نہایت اُداس معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں! اس کا دودھ اچانک سوکھ گیا ہے۔"

پروفیسر نفسی اپنی کرسی سے اُچھل پڑے۔ اور بکری کی طرف چور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے: "کیا تم جانتے ہو کہ دودھ اچانک کیوں

سوکھ گیا ہے۔؟"

"میں کیا جانوں، میڈیکل ڈاکٹر اسے چالیس روپے کے انجکشن لگانا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کوئی جسمانی روگ ہو"

"اوں ہوں؟" — پروفیسر حد درجہ خود اعتمادی سے بولے۔ "بکری کی آنکھیں صاف کہہ رہی ہیں کہ یہ ایک نفسیاتی کیس ہے۔ ایک ہفتہ میں ہی اس کا دودھ اتر آئے گا۔ تم اس کا کیس میرے حوالے کر دو"

پروفیسر نفسی جو یونیورسٹی بھر میں علم نفسیات پر اتھارٹی مانے جاتے تھے وہ میری بکری کا علاج کریں۔ اس سے زیادہ قابلِ فخر بات اور کیا ہو سکتی تھی چنانچہ میں نے دودھ سوکھنے کا یہ کیس پروفیسر نفسی کے حوالے کر دیا۔

پروفیسر نفسی نے علاج کا آغاز کرتے ہوئے کہا:— سب سے پہلے ہمیں یہ تحقیق کرنی ہے کہ بکری کا بچپن کن حالات میں گذرا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ بچپن کا کوئی گھناؤنا واقعہ بکری کے لاشعور میں موجود ہو۔ اور تمھارے یہاں آکر کوئی بالکل اس سے ملتا جلتا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہو جس سے بکری کے ذہن کو شدید صدمہ پہنچا ہو اور ماضی کا وہ لاشعوری واقعہ اچانک شعور کی سطح پر اُبھر آیا ہو——"

میں نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "پروفیسر نفسی! میرے خیال میں اپنے بچپن کی داستان تو خود بکری ہی بتا سکتی ہے۔ میں کس قابل ہوں"

پروفیسر نفسی شاید اس کی داستان سننے کے لئے بکری کی طرف بڑھے، مگر میں نے ان کا بازو پکڑتے ہوئے روک دیا اور کہا۔ "پروفیسر صاحب بکری بول نہیں سکتی۔ وہ اُردو، انگریزی، ہندی میں سے کوئی بھی زبان نہیں جانتی"

پروفیسر نفسی نے انگلی سے اپنی پیشانی کھجلائی اور دوبارہ کرسی پر آکر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔ خیر کوئی ہرج نہیں۔ علم نفسیات کی اپنی ایک زبان بھی ہوتی ہے۔ "تم مجھے یہ بتاؤ کہ جس دن اس کا دودھ سوکھا۔ کیا اس دن بکری کے ساتھ کوئی واقعہ پیش آیا تھا؟"

"اور تو کچھ نہیں ہوا۔ صرف اس دن اُس کا کھونٹا اُکھڑ گیا تھا جسے میں نے ہتھوڑا اُٹھا کر دوبارہ مضبوطی سے گاڑ دیا تھا"

پروفیسر نفسی یہ سنتے ہی بے تابانہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور چٹکی بجا کر بولے۔ "بس مل گیا راز۔ بکری کھونٹا اکھیڑ کر آزادانہ طور پر رہنا چاہتی ہے۔ مگر تم نے اس کی گردن میں رسی ڈال رکھی ہے۔ یاد رکھو کائنات کی ہر چیز اپنے فطری مرکز کی طرف پرواز کرنا چاہتی ہے اور اس فطری جذبہ کو جب کھونٹے سے باندھ دیا جائے تو دودھ تو ایک طرف تخیل تک سوکھ جاتا ہے"

یہ کہہ کر پروفیسر نفسی کھونٹے کی طرف بڑھے اور اس سے پہلے کہ میں انھیں بتاتا کہ کھونٹا بکری نے نہیں اکھیڑا تھا بلکہ گھر کے بچوں نے شرارتاً اکھیڑ دیا تھا——— انھوں نے بکری کی گردن میں سے رسّہ کھولا — اور بکری کو آزاد کر دیا۔

بکری آزاد ہونے کے بعد گُم سُم کھونٹے کے قریب، جہاں کھڑی تھی بدستور کھڑی رہی۔

"دراصل ہوتا یوں ہے"۔ پروفیسر نفسی نے بکری کو بدستور گم سُم کھڑے دیکھ کر کہا۔ "کہ کچھ (Com Plex) کامپلیکس لاشعور کی گہری تہوں سے اُبھر کر پوری طرح شعور کی سطح پر نہیں آ چکے ہوتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کامپلیکس کا کچھ حصہ لاشعور میں اور کچھ حصہ شعور میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکری کے اندر آزاد ہونے کی زبردست تمنّا تو موجود ہے مگر وہ آزاد ہونا نہیں چاہتی وہ ڈرتی ہے کہ یہ کھونٹا اور رسّی کہیں پھر اُس کی آزادی نہ چھین لیں"

یہ کہہ کر پروفیسر نفسی نے کھونٹا اکھیڑا اور پھر اس کے اوپر رسّی لپیٹ کر دونوں چیزیں باہر گلی میں پھینک دیں۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا کہ رسی آٹھ آنے میں آئی تھی اور کھونٹا چھ آنے میں۔ گویا بکری کے جو پہلا انجکشن دیا گیا وہ چودہ آنے کا تھا۔

بکری کے منہ سے نکلا۔ "میں! میں! میں!"

پروفیسر کے منہ سے نکلا۔ "ہاں! ہاں! ہاں!"

میں نے منہ کھول کر پوچھا۔ "کیا ہوا پروفیسر نفسی؟"

پروفیسر نے فرطِ مسرت میں اپنا ہاتھ زور سے میز پر مارا۔ میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے خوبصورت میز پوش پر اُلٹ گئی۔ اور پروفیسر نفسی بولے: "بکری پر نفسیاتی عمل کا تیزی سے اثر ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک صحت مند چمک پیدا ہو گئی ہے اور وہ کہہ رہی ہے کہ اب شام تک میرا دودھ

ضرور اُتر آئے گا۔ تم دیکھ نہیں رہے کہ جب کھونٹے اور رسّی کے گلے میں گرنے کی آواز آئی تو بکری نے کان کھڑے کرکے وہ آواز سُنی اور اطمینان کر لیا کہ اس کی آزادی میں اب کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔"

"تو آپ کا کیا خیال ہے کہ شام تک اس کے تھنوں میں سے واقعی دودھ اُتر آئے گا؟"

"ہاں" پروفیسر نفسی بولے۔ "لیکن دیکھو اس کے باوجود شام تک نفسیاتی احتیاط لازمی ہے۔ میرے خیال میں تم اسے اب تنہا چھوڑ دو۔ جب تک تم اس کے سامنے رہوگے اس کے تخیل میں برابر ایک اُلجھن رہے گی کہ کہیں تم اسے دوبارہ نہ جکڑ لو۔ شام تک جب اسے پورا اطمینان ہو جائے گا کہ تم اس کی مسرت نہیں چھینا چاہتے تو اُس کی ساری تخلیقی طاقتیں دودھ بن کر اس کے تھنوں کی طرف منتقل ہو جائیں گی۔"

کچھ مزید ہدایتیں دے کر پروفیسر نفسی چلے گئے اور مجھے یہ سوچ کر بے حد غصہ آیا کہ میری ہی بکری اور مجھے ہی مَیں مَیں کرتی ہے۔ یعنی میری یہاں موجودگی کو پسند نہیں کرتی۔ جی چاہا کہ اس بکری کی بچّی کے ٹکڑے ٹکڑے اُڑا دوں لیکن شام تک دودھ اُترنے کے لالچ نے میرے ہاتھ روک لیے۔

میں جانے لگا تو بکری نے پھر کان کھڑے کیے اور ایک دردناک سی مَیں مَیں کی۔ میں نے اس کے کانوں کو ہاتھ لگایا تو دیکھا کہ کان کے بائیں کونے پر ایک زخم ہے جس کی ٹیسیں اٹھتی ہیں تو وہ کان کھڑے کر لیتی ہے —— میں نے سوچا ممکن ہے یہ زخم بھی کسی لاشعور سے نکل کر شعور کی سطح پر اُبھر آیا ہو اس لیے میں صحن کا دروازہ کھول کر چپ چاپ باہر نکل گیا۔

شام کو گھر لوٹتے ہوئے میں پروفیسر نفسی کو بھی ہمراہ لیتا آیا۔ اندر دیکھا تو بکری غائب تھی۔

"سالی بھاگ گئی" میں بڑبڑایا۔

"یہ اور بھی اچھا ہوا۔!" پروفیسر نفسی بولے۔ "اب فرار کی حالت میں اُس کا نفسیاتی ردّعمل اپنے پورے عروج پر پہنچ جائے گا اور نیم شعوری خوف بھی کالعدم ہو جائے گا۔ تم دیکھتے رہو، جونہی اُس کے خوف کی آخری تہہ اُلٹے گی۔ وہ دودھ سے بھرے تھن لے کر لوٹ آئے گی۔"

میں نے کہا "نفسی! وہ نہیں لوٹے گی۔ آوارہ جانوروں والی پولیس اُسے پکڑ کر کانجی ہاؤس لے جائے گی اور مجھے خواہ مخواہ جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

مگر پروفیسر نفسی میری بات نہیں سُن رہا تھا۔ وہ دروازہ پر کان لگائے شاید بکری کے واپس آنے کی چاپ سُن رہا تھا۔ میں اُٹھ کر غسل خانہ میں مُنہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ بکری غسل خانہ کے ایک کونے میں پڑی سو رہی تھی۔ میں چلّایا۔ "پروفیسر نفسی! —— بکری!!"

"کیا آگئی بکری؟" پروفیسر کے حلق سے جیسے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی۔

"آئی نہیں، وہ تو یہاں سو رہی ہے" میں نے صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔

"سو رہی ہے؟ —— جب تو اور بھی ٹھیک ہے۔" پروفیسر نفسی غسل خانہ کی طرف لپک کر آتے ہوئے کہنے لگے —— "نیند میں یقیناً اُسے ماضی کا کوئی خوشگوار سپنا آیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے سپنے میں وہ آزادانہ کسی سرسبز پہاڑی پر کلیلیں کرتی رہی ہو اور اس کے لاشعور کی تمام اُلجھنیں دور ہو گئی ہوں —— تم جلدی جلدی کمنڈل لاؤ۔ اس کے تھنوں میں سے فوراً دودھ دوہنے کا لمحہ آ گیا ہے۔"

میں بھاگم بھاگ کمنڈل لے آیا۔ پروفیسر نفسی نے ایک فلمی گانے کے بول گا کر بکری کو خوابِ شیریں سے بیدار کیا۔ اس کے بعد پروفیسر نے مُنہ سے بجانے والا بچّوں کا ایک باجا اپنی جیب سے نکالا اور مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں دودھ دوہتا رہوں۔ تم یہ باجا بجاتے رہو۔ یہ پس منظر کی موسیقی اس کے تحت الشعور کو متواتر حرکت میں رکھے گی۔ اور اس کی بچی کھچی ذہنی اُلجھنوں کو لاشعور کی طرف جانے سے روکے گی۔"

پروفیسر نفسی نے کمنڈل بکری کے تھنوں کے نیچے رکھ دیا اور خود اُس کے تھن تھام کر کھینچنے شروع کر دیئے۔ میں مُنہ سے باجا بجانے لگا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے ہم کسی ڈرامہ کی فائنل ریہرسل کر رہے ہوں۔

پروفیسر نفسی نے دانت پیس کر پوری طاقت سے زور لگایا۔ بکری کی ٹانگیں کپکپائیں۔ میں نے اور بھی زور شور سے باجا بجانا شروع کر دیا۔ اور پھر بکری کی تنی ہوئی رگوں کے کھنچاؤ کو دیکھ کر بند کر دیا۔ دو منٹ تک ایک پُراسرار سی خاموشی طاری رہی۔ تخلیق واقع ہو رہی تھی۔ چاروں طرف

احترام احترام کی سی سائیں سائیں سُنائی دے رہی تھی۔

میں نے سانس روک کر پوچھا۔ "کیوں نفسی! کوئی بوند نکلی؟"

پروفیسر نفسی نے ہانپ کر کہا۔ "نہیں"

میں نے کہا۔ "شاید دودھ پھر لاشعور کی طرف ڈھلک گیا"

"یہ کیوں کر ہو سکتا ہے؟" پروفیسر نفسی نے میری کم شعوری پر ماتم کرتے ہوئے کہا۔ "شعور کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد کوئی چیز اس وقت تک لاشعور کا رُخ نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ کوئی بہت بڑا، غیر معمولی واقعہ نہ ہو جائے"

"میرے خیال میں غیر معمولی واقعہ ہو چکا ہے"

"کہاں ہوا ہے؟"

"وہ واقعہ بظاہر تو نہیں ہوا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ بکری کے لاشعور میں وہ واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ واقعہ خارجی شکل میں سامنے آئے"

"نہیں یہ ضروری نہیں۔ واقعہ داخلی بھی ہو سکتا ہے"، پروفیسر بولے۔

"بالکل واقعہ داخلی ہی ہو سکتا ہے"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ پہلے اُس داخلی واقعہ کی توجیہ ہونی چاہئے"

اور پھر پروفیسر نفسی نے فوراً بکری کے تھن چھوڑ دیئے۔ کمنڈل اُٹھا کر ایک طرف پھینک دیا اور بولا۔ "دراصل تمہاری بکری کا لاشعور بہت سی گرہوں کا مجموعہ بنا ہوا ہے۔ بہت سی چیزیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی پڑی ہیں۔ اس لئے اس کیس میں بیک وقت کئی گرہیں کھولنی پڑیں گی۔ تم ذرا لپک کر اندر سے ایک آئینہ اُٹھا لاؤ"

میں آئینہ لے آیا۔ پروفیسر نفسی نے بکری کو دور سے آئینہ میں جھلکایا۔ بکری نے آنکھیں بند کرلیں۔ پروفیسر نفسی تڑپ کر بولا۔ "اُفوہ تمہاری بکری کو اپنے آپ سے سخت نفرت ہے۔ یورپ کے ایک ماہر نفسیات نے لکھا ہے کہ نفرت ایک ایسا جذبہ ہے، جو ناآسودہ محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ فکر صاحب! یہ بتلائیے کہ جس دن تمہاری بکری کا دودھ سوکھا ہے کیا اس دن اس کا سامنا کسی بکرے سے ہوا تھا؟"

میں نے کہا۔ "اس محلّہ میں میرے سوا کسی کے پاس بکری تک نہیں ہے۔ بکرا تو دور کی بات ہے۔ لیکن مسٹر نفسی آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"بات صاف ہے" پروفیسر نفسی بولے۔ "عالمِ شباب میں بکری نے کسی بکرے سے محبت کی تھی۔ بکرا ہرجائی نکلا۔ اس نے کسی دوسری بکری سے محبت شروع کردی۔ اور تمہاری بکری کو نہ صرف بکرے سے نفرت ہوگئی بلکہ اپنے حسن و شباب سے بھی نفرت ہوگئی۔ اور اتنے سالوں بعد اس بکرے کی شکل سے ملتا جُلتا کوئی بکرا اس نے کہیں دیکھ لیا تو اُس کی سوئی ہوئی نفرت جاگ پڑی اور اتنا فوری اور شدید ردِّعمل ہوا کہ اس کا دودھ سوکھ گیا!"

بات نہایت پتہ کی تھی۔ نجانے وہ کون سا کمبخت بکرا تھا جس نے میرے دودھ پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ نجانے اب وہ بکرا کہاں ہوگا۔؟ میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اُسے کچا چبا جاتا۔ میں نے پروفیسر نفسی سے کہا۔ "یہ تو ہوا مرض۔ اب اس کا کوئی علاج بتاؤ دوست!"

"علاج نہایت آسان ہے۔ تمہارے پاس کسی بکرے کی تصویر ہے۔؟"

خوش قسمتی سے میرے پاس منسٹری آف ایگریکلچر کا چھپا ہوا ایک رسالہ پڑا تھا جس پر کئی بکروں کی تصویریں تھیں۔ میں نے جھاڑ پونچھ کر وہ رسالہ نکال لایا۔ پروفیسر نفسی نے بکری کی تھوتھنی پکڑ لی اور باری باری ہر بکرے کی تصویر پر اُس کی تھوتھنی رکھتا چلا گیا۔ سارے بکرے ختم ہو گئے۔ مگر بکری کی تھوتھنی میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ آخرکار پروفیسر نفسی نے رسالہ زور سے زمین پر پٹخ دیا اور بکری اس رسالہ کا ٹائٹل پیج چبانے لگی۔

میں نے کہا۔ "نفسی صاحب! معلوم ہوتا ہے بکری نے کسی سے عشق کیا ہی نہیں"

نفسی بولے۔ "ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اور یہی اس کی ناآسودگی کا کارن بھی ہے۔ اندازہ لگاؤ، جس بکری نے زندگی بھر کسی سے محبت ہی نہ کی ہو

اس کی تشنگی کس درجہ خوفناک نتائج برآمد کرے گی؟"

بکری نے کہا۔ "مَیں۔ اَمَیں۔ اَمَیں !!"

پروفیسر نفسی نے کہا — "بکری میرے تجزیہ کی تصدیق کر رہی ہے"

میں نے پریشان ہو کر کہا — "تو بھئی، میں اس نگوڑی کو محبت کہاں سے لا کر دوں — اور پھر اس بڑھاپے میں کون جاہل بکرا اس کو اپنا دل دے گا؟"

پروفیسر نفسی دس منٹ تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ کبھی بکری کو کاغذ چباتے دیکھتے کبھی علم نفسیات کی موٹی سی کتاب کی طرف ——— عجیب آفت میں جان ہے — میں سوچ رہا تھا کہ بکری کیا خریدی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی کتاب خرید لی ہے — اس سے تو بہتر تھا کہ میں بھینس خرید لیتا۔ کم از کم احمق ہونے کے ناطے اس کے اندر کوئی کمپلیکس تو پیدا نہ ہوتا۔

آخر پروفیسر نفسی نے مہرِ خاموشی کو توڑا اور کہا — "کیس نہایت ہی پیچیدہ ہے — کم از کم چالیس پچاس کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا — تم دو ہفتے تک کے لئے اس بکری کو میری تحویل میں دیدو — میں اس کے ذہن کی نفسیاتی ساخت کے متعلق پوری طرح غور و فکر اور چھان بین کرنا چاہتا ہوں"

پروفیسر نفسی اور بکری جب میرے گھر سے چلے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہیر وارث شاہ کا یہ بول میرے کانوں میں گونج رہا ہے ؎

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں،   مینوں لے چلے بابلا لے چلے —

دو ہفتے کے بعد جبکہ میں بکری کو قریب قریب بھول چکا تھا اور اس کے بجائے خشک دودھ کے ڈبے استعمال کر رہا تھا — اچانک ایک دن پروفیسر نفسی بکری کو قریب قریب بغل میں دبائے میرے گھر آ گئے اور بولے —

"لو بھئی کیس مکمل ہو گیا"

میں نے ششدر ہو کر کہا — "کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا بکری کے دودھ اُترنا شروع ہو گیا —؟"

"نہیں" پروفیسر نفسی نے ایک چھ مُربّع گز کا نقشہ میری میز پر پھیلاتے ہوئے کہا — "ابھی تو بکری کی نفسیاتی ساخت پر یہ نقشہ مکمل ہوا ہے — میں تمھاری بکری کی رگ رگ پہچان گیا ہوں — دراصل یہ ایک انتقامی نفسیات کا جھگڑا ہے — تم اس نقشہ کو دیکھو گے تو تمھیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ بکری کا دودھ سوکھنے کی بنیادی وجہ کہاں سے شروع ہوتی ہے —؟"

"کہاں سے شروع ہوتی ہے؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا —

"اس کی پردادی سے! لیکن تم ذرا یہ نقشہ دیکھو"

میں نے نقشہ دیکھا۔ نقشہ بہت طویل تھا — اس کا اختصار کچھ یوں ہے —

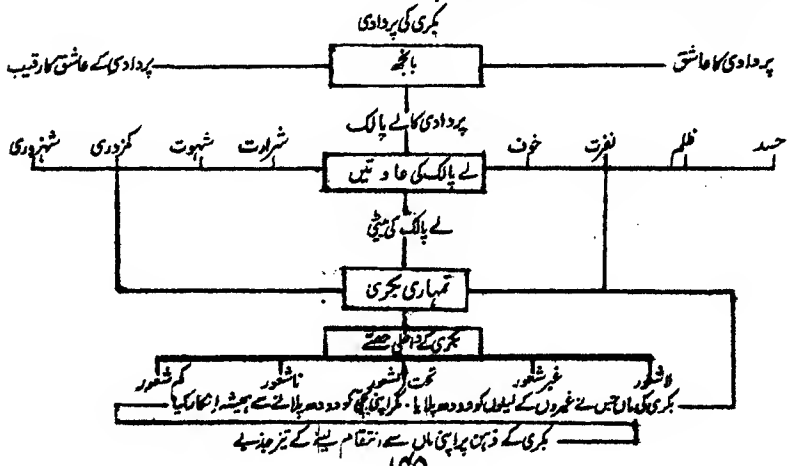

میں نے نقشہ دیکھ کر تحیر کے ساتھ پروفیسر نفسی کی طرف دیکھا اور کہا:۔ "نفسی! میری بکری کا سارا کمپلیکس ہی کمپلیٹ معلوم ہوتا ہے"

"ہاں" اسے تم نفسیاتی کرشن کہہ سکتے ہو۔ تم نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی نفسیاتی حرکت آنے والے کئی زمانوں پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ اگر تمھاری بکری کی دادی بانجھ نہ ہوتی تو آج تمھاری بکری تم سے انتقام نہ لے رہی ہوتی"

"انتقام؟" میں نے حیرت سے پورا منہ کھول دیا۔ "تو تمھارا مطلب ہے میری بکری اپنے کمپلیکس کا انتقام مجھ سے لے رہی ہے۔؟"

"ہاں! اور اصل نفسیات کی کڑیاں اس طرح جڑی ہیں کہ بکری کو اپنی ماں نے بالکل دودھ نہیں پلایا تھا جس کی وجہ سے بکری اپنی ماں کی سخت دشمن ہوگئی اور اس کی رگ وپے میں انتقام کی روح پلتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک دن بکری کو تم مل گئے"

"یعنی؟"

"یعنی بکری کو اپنی دشمن ماں مل گئی"

"کہاں ہے اس کی ماں، کہاں ہے؟؟؟"

"اس کی ماں تمھارے ذہن کے اندر موجود ہے"

یہ سنکر میرے حواس باختہ ہوگئے۔ تین برس تک ایک سالم بکری میرے ذہن کے اندر موجود رہی اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ میں نے اپنے سر کو زور سے جھٹکا دیا کہ اگر واقعی میرے سر میں کوئی بکری موجود ہے تو ذرا حرکت میں آئے۔ مگر نتیجہ کے طور پر صرف میرا سر گھوم کر رہ گیا۔

"اور اپنی ماں کو جب بکری نے تمھارے اندر دیکھ لیا تو ....." پروفیسر نفسی نے اپنا تجزیہ جاری رکھا۔ ....."اس کے ذہن پر دس سال پہلے کا منفعلانہ جذبہ پھن کی طرح اُٹھا اور اس نے اپنی ماں کا انتقام تم سے لینے کے لئے دودھ دینا بند کر دیا"

"بہت تیری کی" میں نے بکری کی طرف ملامت انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بظاہر تو بڑی بھولی بھالی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن باطن میں بڑی بدباطن ہے۔ کس طرح دس سال بعد طویلے کی بلا اس نے بندر کے سر تھوپ دی"

"اس میں بکری کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلکہ علم نفسیات کی رو سے شاید اسے خود بھی علم نہ ہو کہ وہ یہ انتقام لے رہی ہے۔ کیونکہ اگر اُسے یہ شعور ہو جائے کہ اس کا دودھ ایک انتقامی سپرٹ کی تسکین کے باعث بند ہوا ہے تو یہ بکری وہ بکری نہ رہے جس کی دادی بانجھ تھی بلکہ کوئی عالم کمپلیکس معنی سی بکری ہو جائے"

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "واقعی میں نے پچیس روپے میں ایک معنی خیز بکری خرید لی ہے۔ کاش مجھے کوئی بے معنی بکری مل جاتی۔ تو آج میں انسان کے بچہ کے بجائے بکری کی ماں نہ بن جاتا"

بہرحال پروفیسر نفسی کم از کم گھنٹہ بھر تک، بکری کے ماضی، حال اور مستقبل کے نفسیاتی تجزیہ پر مجھے لیکچر دیتے رہے۔ اور آخر میں یہ ہدایت دے گئے کہ تم ہفتہ بھر تک اس کی ماں کا پارٹ ادا کرو۔ اور اسے اپنے ہاتھ سے ہر روز صبح بکری کا دودھ لاکر پلایا کرو۔ نہایت مادرانہ شفقت کے ساتھ اپنی گود میں اس کا سر رکھ کر۔ تاکہ اس بکری کے اندر ماں کی شفقت کا جو خلا موجود ہے وہ پُر ہو جائے اور وہ دوبارہ اپنے بچپن کے زمانہ میں چلی جائے۔ اور یوں محسوس کرتی رہے کہ اس کی ماں اسے نہایت محبت اور ممتا کے ساتھ دودھ پلا رہی ہے"

"ایک ہفتہ بعد" پروفیسر نفسی نے چیلنج دیا۔ "بکری کے اندر ایک فطری حالت بیدار ہو جائے گی۔ اور اس کے تھنوں سے پھر دودھ اترنا شروع ہو جائے گا"

آنے والے سات دن، میری بچی، میری بکری۔ میرے مہربان ہاتھوں سے روزانہ سیر بھر دودھ پیتی رہی ——— بظاہر مجھے اپنی یہ حرکت عجیب وغریب معلوم ہوئی کہ ایک بکری کا دودھ دوسری بکری کو پلایا جاتا رہے۔ لیکن پروفیسر نفسی چونکہ یونیورسٹی بھر میں اتھارٹی مانے جاتے تھے اور میرے غمگسار قسم کے دوست تھے۔ اس لئے میں ایمان کی حد تک بکری کی ماں بنا رہا۔ مجھے آج بھی محسوس ہوتا ہے کہ جتنی اتھاہ اور بھرپور محبت میں نے ان دنوں اپنی بکری کے ساتھ دکھائی اتنی شاید کسی ماں نے اپنے کسی بیٹے سے نہ دکھائی ہوگی۔ اور سچ پوچھئے تو بکری کے طور طریقے اور نشست وبرخاست

میں ایک خاص قسم کی تبدیلی بھی میں نے محسوس کی۔

ساتویں دن ——— جبکہ میں بکری کا سر اپنی گود میں رکھے، چمچہ بھر بھر کر اسے دودھ پلا رہا تھا تو میرے ایک گاؤں کے کسان دوست آگئے، گھبرا گئے اور میری اس ہیئت کذائی پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"یہ بکری کو دودھ کیوں پلا رہے ہو، دماغ چل گیا ہے تمہارا؟"

"ایک ڈاکٹر نے بتایا ہے ۔ بیچاری کا دودھ سوکھ گیا ہے ۔ اس لئے اس کا علاج کر رہا ہوں ۔ کیونکہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔"

میرے کسان دوست کو شاید کچھ زیادہ غصہ آ گیا ۔ اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ بکری کا سر میری گود سے اٹھا کر اس کا منہ کھول دیا ۔ اس کے دانت دیکھے ۔ پھر دم اٹھا کر دیکھی ۔ اس کے پیٹ کو تھپ تھپایا اور پھر بولے ۔ "لوہے کو لوہا کیا خاک کاٹے گا ۔ بکری تو ساری بوڑھی ہو چکی ہے ۔ اب اگر اس کا دودھ نہیں سوکھے گا تو اور کب سوکھے گا ۔ چلو چھوڑو ۔ پاگل مت بنو ۔ جو غدود اس کے اندر دودھ بناتے تھے وہ اب اپنی عمر طبعی کو پہنچ گئے ہیں تم یہ بکری کسی قصائی کے حوالے کر دو ۔ دو چار روپے اس بوڑھی بھا پھاں کے مل ہی جائیں گے۔"

اور اس سے پہلے کہ میری ماما پروٹسٹ کرتی، میرا وہ کسان دوست سچ مچ بکری کو پکڑ کر بازار لے گیا اور پندرہ منٹ بعد تین روپے میری ہتھیلی پر لا کر رکھ دیئے۔

اس کے بعد مجھے پروفیسر نفسی جہاں بھی ملتے ہیں، پوچھتے ہیں۔

"کیوں بھئی فکر صاحب! اب تو آپ کی بکری خوب دودھ دے رہی ہے نا؟"

اور میں نہایت نیاز مندانہ لہجے میں کہتا ہوں ۔ "ہاں نفسی صاحب! آپ کی نوازش ہے ۔ اب تو وہ برابر دودھ دے رہی ہے ۔ اور اب تو اس کے دودھ میں شیرینی بھی بڑھ گئی ہے ——— "

شاہراہ کے دو تاریخی نمبر

ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس

کانفرنس نمبر

اُردو کے ترقی پسند ادب کی، بصیرت افروز دستاویز۔

آج کے ادبی مسائل پر تفصیلی تبصرے۔

ترقی پسند ادب کو مزید تابناک بنانے کے فیصلے۔

ضخامت ۲۵۰ صفحات ۔ قیمت دو روپے

سنہ ۱۹۵۵ء کا

سالنامہ

- جاندار، حیات بخش، درصحت مند ادب کا مرقع ۔
- چوٹی کے فنکاروں کے شہ پاروں کا صحیفہ ۔
- اُردو کے جدید دور ادب کا آئینہ ۔

ضخامت ۲۵۰ صفحات ۔ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:- شاہراہ ۔ اُردو بازار دھلی

یکے از سامعین

نعیمہ شوکت

● سُنانے کا مرض

معلوم ہوتا ہے نعیمہ شوکت صاحبہ کو جن شعرا سے واسطہ پڑا ہے، وہ شعر سُنانے کی نہایت پرانی تکنیکوں پر عمل کر رہے ہیں حالانکہ شعر سُنانے کی سائینس اتنی ترقی کر چکی ہے اور اس قدر اچھوتی اور جدید ترین تکنیکیں وجود میں آ چکی ہیں کہ ..... (نمونہ کے طور پر اسی طنز و مزاح نمبر میں ایک کارٹون ملاحظہ فرمایئے۔

مضمون کا عنوان بظاہر تو کچھ عجیب سا ہے مگر کیا کیا جائے کہ اکثر حقیقتیں "عجیب" ہی نہیں بلکہ "غریب" بھی ہوتی ہیں۔ یہاں میں نے "غریب" بطور قافیہ نہیں بلکہ "مفلس" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ جس حقیقت کو بیان کرنا مقصود ہے اس پر آج تک کسی نے ایک نقطہ بھی نہیں لکھا —— آخر یہ کہاں تک انصاف ہے کہ جو شخص شعر سُنائے اس پر تو ہزارہا صفحے سیاہ کر دیئے جائیں مگر جو بے چارا عمر بھر شعر سنتا رہے اس پر ایک لفظ بھی نہ لکھا جائے —— یہ مضمون لکھنے کی ضرورت اسی لئے پیش آئی ہے کہ میں بھی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے "یکے از سامعین" ہوں۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ہاں صرف شاعری ہی کو ایک مہلک مرض سمجھ لیا گیا ہے۔ اس مرض کی اہمیت میں شک کرنا کفر کے برابر ہی سہی۔ مگر اس مرض کی وجہ کو نظرانداز کیوں کیا جا رہا ہے —— شاعری کے مرض کی اصل وجہ "سنانا" ہے میرا دعویٰ ہے کہ اگر شاعروں پہ کلام سُنانے کی پابندی کر دی جائے یا "کوٹہ" مقرر کر دیا جائے تو ہماری شاعری اور شاعروں کی حالت بڑی حد تک سدھر جائے گی۔

"ہر شاعر یہ چاہتا ہے کہ اپنا کلام سُنائے مگر سب شاعروں کا انداز یکساں نہیں ہوتا" ممکن ہے یہ قول کسی ارسطو یا افلاطون کا ہو۔ میں نے تحقیق نہیں کی۔ البتہ اس اجمال کی تفصیل بیان کر سکتی ہوں۔ فرض کیجئے ا، ب، ج تین شاعر ہیں ا کی عمر بیس ہے ب کی عمر تیس سال ہے اور قبلہ ج نصف صدی سے اوپر کے ہیں —— ا صاحب کو جب "دورہ" پڑے گا تو وہ کہیں گے "قبلہ ایک غزل کہی ہے۔ اتفاق سے کچھ شعر اچھے نکل آئے ہیں۔ عرض کرتا ہوں۔ بنظر اصلاح دیکھئے گا!" ظاہر ہے کہ "اصلاح" کا لفظ تو ایک اخلاقی حربہ ہے۔ مطلب تو عرض کرنے ہی سے ظاہر ہے۔ ب صاحب البتہ اتنے گئے گذرے نہیں کہ وہ اپنی غزل بنظر اصلاح پیش کریں۔ بوقت ضرورت وہ کچھ اس طرح کی چال چلیں گے۔

"سُنا ہے پرسوں سندھ والک مشاعرہ ہے"

"جی ہاں!"

میں نے تو مشاعروں میں جانا ترک کر دیا ہے۔"
"حضرت وہ کیوں؟"
"بھئی کیا بتاؤں شعر سمجھنے والے نہیں رہے۔ بتائیے کہ آپ جیسے چند ایک لوگوں کے علاوہ کون ہے جو میرے اشعار کو صحیح طور پر سمجھ سکے۔ اگر میں" تمنا ہم بھی رکھتے ہیں" والی غزل مشاعرے میں پڑھوں تو لوگ کیا خاک سمجھیں گے۔"
"تمنا ہم بھی رکھتے ہیں؟"
"کیا یہ غزل آپ نے نہیں سُنی ــــــ حیرت ہے۔ بھئی اس کا مطلع تو ضرب المثل کی طرح مشہور ہو گیا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔" پھر مطلع سے مقطع تک ہر شعر ضرب المثل بنتا چلا جائے گا۔ اب ذرا قبلہ جرؔ صاحب سے بھی تعارف حاصل کرتے چلیے۔
"میاں غالبؔ کی وہ" سحر ہونے تک" والی غزل کیسی ہے؟"
"جناب بہت اچھی ہے۔"
"واہ بڑے باذوق بنتے ہو۔ اس زمین میں میری غزل نہیں سُنی تم نے؟"
"شاید سنی ہو۔"
"کیسے سُنی ہو ــــــ وہ تو میں نے آج ہی کہی ہے ــــــ تو سنو..." اس کے بعد پھر وہ غزل... سحر ہونے تک جاری رہے گی۔

ــــــ خیر یہ تو مشاعروں کے انداز کی قسمیں تھیں۔ بات چونکہ سامعین کے متعلق تھی اس لئے آپ کو پورا پورا اختیار ہے کہ مندرجۂ بالا "حقائق کو" جملۂ معترضہ" سمجھ لیں۔ خیر اب سامعین کے متعلق سُن لیں۔ سامعین کے متعلق کیا ــــــ صرف میں اپنے متعلق کچھ عرض کئے دیتی ہوں۔ جو بقول خود" یکے از سامعین" ہوں۔
میری سہیلیوں میں" شعر و ادب" کا بہت چرچا ہے۔ میرے علاوہ تقریباً سب شاعری کرتی ہیں۔ ہر روز غزلیں، دو غزلے اور سہ غزلے کہے جاتے ہیں اور پھر وہ مجھ" اکلوتی سامعین" کی خدمت میں پیش ہوتے ہیں۔
"کتنی پیاری غزل ہے نمو ذرا سنو تو!"
"سناؤ" میں بڑے اطمینان سے" اجازت" دے دیتی ہوں۔
پھر اس غزل کے بعد اسی زمین میں ایک اور غزل سُنائی جاتی۔ پھر ایک اور غزل ــــــ اور غزل ــــــ یہاں تک کہ دماغ پھٹنے لگتا ہے۔
"بھئی بس کرو۔" باوجود ناراضگی کے خطرے کے میں ہمت سے کام لے لیتی ہوں۔
"اے ہے بڑی بدذوق ہے ــــــ" ادھر سے جواب ملتا ہے۔
اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ متواتر پندرہ غزلیں سننے کے بعد بھی آدمی اگر باذوق بنا رہے تو پھر اس میں بزرجمہر میں فرق ہی کیا رہا؟
میری یہ" شعر گر" سہیلیاں مجھے بیوقوف بنانے کے عجب عجب طریقے اختیار کرتی ہیں۔
"نمو آؤ تاش کھیلیں۔"
تاش میری کمزوری ہے۔ میں فوراً ہامی بھر لیتی ہوں۔
"مگر ایک بات ہے۔"

---

[1] یہاں سامعین کا استعمال" میں ایک مہاجرین ہوں" کی طرح ہے۔ ظاہر ہے کہ غلط العام فصیح بلکہ افصح ہوتا ہے۔

"وہ کیا؟"

"شرط لگا کر کھیلیں گے۔"

"کیا ہوگی شرط"

"اگر ہم ہار میں گے تو تمہیں ایک پوائنٹ کے چار آنے دیں گے اور اگر تم ہارو گی تو ایک پوائنٹ پر ہم تمہیں ایک غزل سنائیں گی۔"

عموماً یہی ہوتا ہے کہ میں ہارتی ہوں۔ اگر کبھی اتفاق سے جیت جاؤں تو بجائے پیسے لینے کے اسی حساب سے کچھ غزلیں بخشوا لیتی ہوں۔

شعر سنانے کے لئے ان "قسمات" کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ کالج سے تھکی ہوئی باہر نکل رہی ہیں۔ کسی نے بس اتنا کہہ دیا "آج موسم کتنا اچھا ہے"

موسم اچھا ہو یا نہ ہو۔ کوئی ایک ضرور بول اٹھتی ہے "ایسے ہی موسم میں میں نے یہ قطعہ کہا تھا"

پھر اس کے بعد وہ قطعہ سنایا جاتا ہے ——— اب ان محترمہ سے کون کہے "آپ کم سے کم جگر اور موڈ کا تو خیال رکھا کریں" مگر یہ شاعروں کی قوم تو کچھ ایسی ہے کہ پل صراط پر بھی کوئی "باذوق" مل جائے تو اسے ایک آدھ غزل سنا کر ہی بڑھیں گے۔

یوں تو ہر جگہ میری یہ سہیلیاں میری قوتِ برداشت کا امتحان لیتی ہیں۔ مگر جب یہ میرے گھر اکٹھی ہو جائیں تو پھر میں خلاقی طور پر کچھ ایسی مجبور ہو جاتی ہوں ——— کہ بس خدا ہی جانتا ہے نہ تو چپ رہنے کے لئے کہہ سکتی ہوں اور نہ ہی انہیں اٹھ کر جا سکتی ہوں۔

شعر سنانے کے ساتھ ساتھ یہ توقع بھی رکھی جاتی ہے کہ سننے والا "واہ واہ" کرتا رہے۔ اگر کسی شعر پر "واہ واہ" کی لاحول نہ پڑھی جائے تو شعر دوبارہ عرض ہوگا ——— اب تو مجھے اتنی عادت ہو گئی ہے کہ جب کوئی شاعرہ سنجیدہ بات بھی کرتی ہے تو منہ سے "واہ واہ" کا نعرہ نکل جاتا ہے ——— میرا خیال ہے "واہ واہ اور سبحان اللہ" وغیرہ قسم کے "نعروں" کا ریکارڈ بھروالوں۔ جب یہ سہیلیاں شعر سنانے لگیں تو فوراً گراموفون پر یہ ریکارڈ لگا دوں تاکہ تھوڑا بہت تو آرام ملے۔

میری ان سہیلیوں میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک "آل ہند و پاک" مشاعروں میں شرکت کرنے والی شاعرہ بھی ہیں۔ ماشاء اللہ گلا بھی خوب پایا ہے ——— اور بقول بڑے بڑے سامعین کے اشعار بھی خوب کہتی ہیں۔ سب سے زیادہ بس انھیں محترمہ کے ہاتھوں جاں بلب ہوں۔

"نمو میں پرسوں دہلی جا رہی ہوں"

"کیا کرنے؟"

"آل ہند و پاک مشاعرہ ہے"

"تو پھر میں کیا کروں؟"

"تم وہ غزلیں سن لو جو میں وہاں پڑھوں گی"

بیس پچیس غزلیں ایسے موقع پر مجھے سنا دی جاتی ہیں۔ باوجود اس کے کہ میں بارہا انھیں سن چکی ہوتی ہوں۔ جب یہ محترمہ واپس آتی ہیں تو سب سے پہلے میرے گھر تشریف لاتی ہیں۔

"نمو میں دہلی سے واپس آ گئی"

"اتنی جلدی کیوں؟"

"بھئی دل نہیں لگا ——— اور پھر دوسرے اتنے مشاعروں میں پڑھنا پڑا کہ اُف توبہ ——— لال قلعہ کے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی (ایک "عرض" ہوگئی) راشٹرپتی بھون میں یہ غزل پڑھی (ایک اور غزل) کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے ہاں یہ غزل پڑھی (ایک اور غزل) دہلی ریڈیو سٹیشن پر یہ غزل پڑھی (ایک اور غزل) اور ..... " یہ سلسلہ پھر جو چل نکلتا ہے تو جی چاہتا ہے ان "ہند و پاک" مشاعرہ بازوں کو کالے پانی بھجوا دوں ——— معاف کیجئے میں یہ غلط قسم کی خواہش کر گئی اگر "مشاعرہ باز" کالے پانی چلے گئے تو وہاں بھی اس قسم کی حرکتیں ہوں گی۔ اور یہ محترمہ دہلی کی بجائے کالا پانی جائیں گی ——— اور میری قسمت ایسی کی ویسی رہے گی۔

یہ "آل ہند و پاک" محترمہ اور بھی بہت طریقوں سے شعر سُناتی ہیں۔

"کل مشاعرے میں مجھ سے بہت سے لوگوں نے آٹو گراف لئے۔ میں نے ہر آٹو گراف بک پر ایک ایک شعر لکھا ——— ذرا سنو کتنے اچھے شعر تھے یہ"

یا پھر

"نمو تمہاری ہینڈ رائٹنگ بہت اچھی ہے ذرا میری کچھ غزلیں تو نقل کر دینا"

میں مروّت میں آ کر کاغذ اور قلم سنبھال لیتی ہوں۔ وہ بولتی جاتی ہیں اور میں لکھتی جاتی ہوں جب دس پندرہ غزلیں ہو جاتی ہیں تو محترمہ کو خیال آتا ہے۔

"نمو تمہاری ہینڈ رائٹنگ خراب ہوگئی ہے مت لکھو"

میں لکھنا چھوڑ دیتی ہوں اور وہ میرے سامنے سے غزلیں اٹھا کر پھاڑ دیتی ہیں۔

"ارے یہ کیا؟"

"اور کیا" جواب ملتا ہے۔ "اگر رسالے والوں کو یہ غزلیں بھیجیں تو وہ پڑھ نہ پائیں گے"

"تو پھر میرا وقت، خواہ مخواہ خراب کیا"

"مجھے کیا پتہ تھا تمہاری ہینڈ رائٹنگ اتنی خراب ہے"

میں کچھ ناراض سی ہو جاتی ہوں۔ پھر کچھ انھیں میرا خیال آتا ہے۔ اور مجھے منانے لگتی ہیں "ارے چھوڑو بھی ——— یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو بتاؤ یہ غزلیں کیسی تھیں"

اب آپ بتائیے جہاں ایسے ایسے سُنانے والے ہوں وہاں مجھ جیسی "سامعین" کی کیا حالت ہوتی ہوگی ———

یہ تو تھی میری حالت۔ ممکن ہے دوسروں کا مجھ سے بھی بُرا حال ہو۔ آخر میں ایک راز کی بات بھی سُن لیجئے۔ کہ یہ "سُننے سُنانے" کا طریقہ ہماری معاشی ترقی میں بڑی مدد کرے گا ——— حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے اس قول کی صداقت سے خود ہی واقف ہو جائیں گے کچھ دنوں بعد اخبارات میں کچھ اس قسم کے اشتہارات شائع ہوں گے۔

ضرورت ہے

"ایک ایسے شخص کی جو باذوق ہو۔ شعر سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ شعر سُن کر مناسب انداز سے داد دینا جانتا ہو۔ لکھنؤ کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ مناسب، رہائش اور خوراک کا انتظام بھی معقول ہوگا"

وہ زمانے لد گئے

ہری چند اختر ● یادِ رفتہ

عام طور پر گذرا ہوا زمانہ ہر شخص کو موجودہ دور کے مقابلے میں بہتر اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کوئی انسان اپنی موجودہ حالت سے خوش اور مطمئن نہیں ہوتا۔ جو لوگ زندگی کی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں ان کا غیر مطمئن ہونا تو ایک قدرتی بات اور لازمی امر ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ لوگ بھی تو خوش نہیں جن کے ہاں بظاہر کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ بات یہ ہے کہ انسانی خواہشات اور ضروریات میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ وہ تکمیل کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جوں جوں خواہشات اور ضروریات کی تکمیل ہوتی جاتی ہے نئی نئی اور پہلے سے وسیع خواہشات پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ انسان کی بے اطمینانی کی حقیقی وجہ یہی ہے۔ یعنی جن لوگوں کو خدا نے کچھ دے رکھا ہے۔ وہ بہت کچھ چاہتے ہیں اور جب بہت کچھ مل جاتا ہے تو بہت ہی کچھ کی خواہش پیدا ہو کر اسے بھی حقیر اور بے حقیقت بنا دیتی ہے۔

اس بے اطمینانی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنے موجودہ ماحول اور صورتِ حال کی شکایت کرتے کرتے موجودہ زمانے سے ہی بیزار ہو جائے۔ کیونکہ کسی انسان کے حالات یعنی خوشیاں اور غم۔ سکون اور بے اطمینانی۔ کامیابیاں اور مایوسیاں۔ آخر موجودہ زمانے کے سماجی۔ اقتصادی اور سیاسی حالات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ پھر چونکہ کسی چیز سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کسی دوسری چیز سے مقابلہ کرنا ایک نہایت موثر طریق عمل ہے۔ اس لئے موجودہ زمانے کو نفرت اور لعنت کے قابل ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ عہد ماضی کو اچھے لفظوں سے بلکہ حسرت بھرے انداز میں یاد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم کو ہر روز بلکہ دن میں کئی کئی بار یہ جملہ سننا پڑتا ہے کہ "صاحب وہ زمانے لد گئے۔"

اب ہمیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ عادت یا رجحان درست اور معقول ہے یا قسمت کے کھونٹے سے بندھے ہوئے بے ہمت لوگوں کی شکست خوردگی کا مظاہرہ۔ آپ جو چاہیں کہہ لیں مگر ایک بات سے انکار نہیں ہو سکتا یعنی یہ ایک جملہ کہہ کر بہت سے لوگوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی۔ مگر ایک تسکین سی ضرور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ ہزاروں لاکھوں مرتبہ کے دُہرائے ہوئے الفاظ ہر مرتبہ ایسے انداز اور اس یقین کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں۔ جیسے کہنے والے نے کوئی بہت ہی بڑی دریافت کی ہو۔ یا زمانے بھر کی برائیوں اور خامیوں کی وجہ حقیقی بتا کر سننے والوں پر ایک کبھی فراموش نہ ہونے والا احسان کر دیا ہو۔

اور سچ پوچھئے ہو تو میں اس معاملے کے اسی پہلو پر نظر رکھا کرتا ہوں کیونکہ اس کے دامن میں بہت سی دلچسپیاں پوشیدہ ہیں بعض اوقات تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ آدم و حوا اور ان کی اولاد یا جو لوگ بھی دنیا میں سب سے پہلے پیدا ہوئے ان بے چاروں کے لئے کتنی مشکل ہوگی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اپنی موجود حالت پر وہ بھی مطمئن نہ ہوں گے۔ لیکن ان کے لئے تو کوئی گذرا ہوا زمانہ ہی نہ تھا۔ وہ اپنے موجودہ زمانے کا مقابلہ کس دور سے کرتے ہوں گے۔ اور انھیں ایک لمبی سی آہ بھر کر بھرائی ہوئی سی آواز میں یہ کہنے کا موقع کہاں ملتا ہوگا کہ "صاحب وہ زمانے کہاں لد گئے!"

اب ذرا خیال فرمایئے کہ موجودہ زمانہ خواہ کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو۔ مگر اس سب سے پہلے انسان اور اس کی ابتدائی اولاد کے

زمانے سے تو بہر حال بہتر ہے۔ مثلاً اس انسان کے لئے یہ کہنے کے لئے یہ کہنے کا کوئی موقع نہ تھا کہ "صاحب! آج کل کے بچوں کی کچھ نہ پوچھئے۔ عقل اور تمیز تو ان کو چھو نہیں گئی۔ بزرگوں کا ادب اور ان کا لحاظ ان کی بلا جانے کس چڑیا کا نام ہے۔ ہاں بھئی وہ زمانے لد گئے جب ادب اور اخلاق گویا بچوں کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔"

اس کے مقابلے میں اپنے زمانے کو لیجئے۔ ہم سے پہلے بہت سے زمانے گذر چکے ہیں۔ پتھر کا زمانہ۔ دھات کا زمانہ۔ شجاعت کا زمانہ۔ فرصت و فراغت کا زمانہ۔ بیکاری کا زمانہ۔ تحریکوں اور ہڑتالوں کا زمانہ وغیرہ وغیرہ۔ اب جس زمانے کی چاہے جتنی تعریف کر لیجئے اور اس کے مقابلے میں موجودہ زمانہ کو جتنا جی چاہے بُرا کہہ لیجئے۔ مگر لوگ اس خداداد سہولت سے خوب خوب فائدہ اٹھاتے ہیں مثلاً ایک بڑی بی نئے فیشن پر برسنا چاہتی ہوں تو خوب چیخ چیخ کر کہہ سکتی ہیں "اُوئی اللہ۔ آج کل کی لڑکیاں۔ شرم نہ حیا۔ ایک سے ایک چرب زبان دیدہ۔ پردہ نہ پلو۔ ننگے سر۔ ننگے مُنہ بازاروں میں ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرتی پھرتی ہیں۔ آخر ہم بھی تو کبھی ان جیسی ہی لڑکیاں تھیں۔ کیا مجال جو کسی کے سامنے ہونے کو بھی جی چاہے۔ توبہ! توبہ۔ اس خیال سے ہی جیسے جان سی نکل جاتی تھی۔ کیا غضب ہے کہ سیتا۔ ساوتری اور چاند بی بی کے ہندوستان میں اب یہ فرنگنیں دولتیاں جھاڑتی پھر رہی ہیں۔ ہاں بہن، وہ زمانے لد گئے جب بھارت کی بیٹیاں چراغِ خانہ ہوتی تھیں۔ اب تو ہر چھوکری کے سر پہ شمع محفل بننے کی دُھن سوار ہے۔"

اسی طرح کوئی بڑے میاں موجودہ زمانے کی بے غیرتی، بے حیائی یا اقتصادی مشکلات کا ذکر کر سکتے ہیں۔ مثلاً "اماں آپ کیا پوچھتے ہو۔ بس زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں۔ کوئی چیز ٹھیک بھاؤ سے ملتی ہی نہیں اور خالص چیز کی تلاش تو ایسی ہے جیسے آپ چڑیوں کا نومن دودھ لینے گھر سے نکل پڑیں۔ کانوں سُنی نہیں آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔ یہی گندم یہاں ایک روپے من بکا کرتی تھی اور ایک آنہ کا سیر وہ دودھ ہوتا تھا جس پر دو بہنے میں ہی مکھن کی تہ جم جائے۔ مگر بھائی وہ زمانے لد گئے۔ اب تو ... ... وغیرہ وغیرہ۔"

آپ کہیں گے کہ بڑے میاں اور بڑی بی بیوں کو تو بے شک یہ سہولت ہے۔ مگر نوجوان لڑکے لڑکیاں کیا کریں؟ ان کے لئے تو یہ زمانہ بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت آدم کے بچوں کے لئے تھا ——— آپ کا یہ خیال بظاہر بالکل درست معلوم ہوتا ہے اور میں بھی غالباً آپ کی تائید کر دیتا۔ لیکن ایک ایسا واقعہ یاد آگیا۔ جو سچ مچ افسانہ سے زیادہ دلچسپ ہے اور وہی واقعہ مجھے آپ کی ہاں میں ہاں نہیں ملانے دیتا۔

ایک دن ایک دعوت میں شریک تھا۔ اتفاق سے صاحبِ خانہ کے چند نوجوان عزیزوں کا جمگھٹا تھا اور بوڑھا کہلانے کا مستحق خود صاحب خانہ اور اس خاکسار کے سوا کوئی نہ تھا۔ کھانے کے بعد دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور آخر گفتگو کا سلسلہ بزرگوں اور خوردوں کے تعلقات تک پہنچ گیا۔ بہت سے پہلوؤں سے اس مسئلہ پر اظہار خیال ہوا اور قدرتی طور پر ان نوجوانوں نے تان اس بات پر توڑنے کی کوشش کی کہ آج کل کے بزرگ خود معقولیت پسند نہیں اور خواہ مخواہ نئی پود کی حرکت اور ہر اُمنگ میں کیڑے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس مرحلہ پر گفتگو میں ذرا گرمی آگئی تھی اور خوب خوب جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا تو اتنے میں ایک نوجوان چہک کر بولا۔

"آج کل کے بزرگ ہر معاملے میں خواہ مخواہ ناک بھوں چڑھانے کے عادی ہو گئے ہیں اور سچ پوچھو تو ہم خوردوں پر نکتہ چینی بھی ایک فیشن کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ہم بھی کوئی بالکل بچے نہیں۔ آج سے پندرہ بیس سال پہلے کے بزرگوں کو دیکھئے۔ بے چارے کتنے فراغ دل اور معقولیت پسند ہوتے تھے۔ خواہ مخواہ کی نکتہ چینی اور دخل در معقولات تو درکنار۔ اُلٹا بزرگانہ شفقت اور چشم پوشی سے کام لیا کرتے تھے۔ مگر صاحب وہ زمانے لد گئے۔ آج کل ایسے بزرگ کہاں پیدا ہوتے ہیں!"

اس جملے پر جو قہقہہ پڑا۔ اور اُن صاحب زادے پر جھینپ سے جو عالم طاری ہوا اس کا اندازہ آپ خود لگا لیں۔ سبحان اللہ کیا ارشاد ہوا ہے "کہ آج کل ایسے بزرگ کہاں پیدا ہوتے ہیں" کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ کہنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ نوجوانوں

کے لیے موجودہ زمانے میں کوسنے کا کوئی موقع نہیں؟

خیر یہ تو شاید اپنی قسم کا واحد یا کم سے کم پہلا واقعہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ عہد ماضی کے مقابلے میں زمانۂ حال کی بُرائی کرنے والے خواہ نوجوان ہوں یا عمر رسیدہ بزرگوار۔ ان کے نظریے اور دلائل دلچسپ ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک بڑے میاں کی داستان سُنیے:-

آپ کا بینڈ باجہ شہر بھر میں مشہور تھا۔ اکثر شادیوں پر ان ہی کو بُلایا جاتا اور بڑے بوڑھوں کی موت پر بھی ان کو تکلیف دی جاتی۔ ملک کی تقسیم کے بعد اس شہر میں بھی بہت سے لوگ سرحد پار سے آ بسے۔ اُن میں سے ایک کھاتے پیتے شخص کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اُسے غریب الوطنی میں بھی باپ کا جنازہ دھوم دھام سے نکالنے کا شوق چرّایا چنانچہ بینڈ والے بزرگوار کے پاس پہنچا اور جب وہ مطلوبہ خدمت انجام دینے کے لیے آمادہ ہوگئے تو نقد زرِ ابن کا سوال پیدا ہوا۔ بڑے میاں سے پوچھا کہ آپ کتنے پیسے لیں گے۔ وہ بزرگوار تو گویا مدت سے بھرے بیٹھے تھے نہایت حسرت بھرے لہجے میں مگر بڑے طمطراق سے فرمانے لگے "ارے صاحب! اب آپ سے کیا کہوں۔ آپ مجھے جانتے ہی کہاں ہیں۔ میں نے اس شہر میں چار چار سو روپیہ نقد وصول کیا ہے۔ مگر وہ زمانے لد گئے۔ اب تو نہ وہ موتیں رہیں، نہ وہ مرنے والے۔ ارے بھائی آج کل کے مُردے تو ——— بس کیا کہوں؟"

سُن لی آپ نے بڑے میاں کی شکایت؟ کتنا جائز گلہ تھا بے چارے کو موجودہ زمانے سے! سچ تو ہے آج کل وہ اگلے سے مُردے کہاں؟

ان ہی بزرگوار کا ایک اور کارنامہ بھی سُن لیجیے۔ ایک اور شخص نے بھی اپنے بزرگ کی موت پر اُن سے معاملہ کرنا چاہا۔ مگر انھوں نے جو رقم طلب کی اس کے بارے میں کہہ بیٹھا کہ "بڑے میاں! فلاں بینڈ والا اس سے بیس روپیہ کم مانگتا تھا۔" یہ سُنتے ہی آپ نے بڑے مشفقانہ انداز اور نہایت رازداری کے لہجے میں فرمایا "اجی آپ کن چھوکروں کا ذکر کر رہے ہیں۔ انھیں تو بازار میں ڈھول بجانے کی بھی تمیز نہیں۔ ہاں کبھی اس شہر میں اچھے اچھے بینڈ والے ہوتے تھے۔ خدا کی قسم مردے کی اوقات بنا دیتے تھے۔ مگر وہ زمانے لد گئے۔ اب ایسے باکمال کہاں۔ لے دے کے یہ خاکسار رہ گیا ہے۔ خیر اب آپ سے سودا کون کرے۔ پیسوں کا معاملہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ خوش ہو کے جو چاہے دے دیجیے گا۔ میں تو آپ کو گا کہ بنانا چاہتا ہوں آپ کی دعا سے وہ بینڈ بجے گا کہ مُردہ بھی یاد رکھے۔"

لیکن اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے کہ وہ زمانے لد گئے۔ کہنے والے ہمیشہ پُرانے زمانے کی تعریف اور زمانۂ حال کی بُرائی ہی کرتے ہیں۔ بھائی خدا کی دنیا بہت وسیع ہے اور اس میں ہر قسم کے بندے آباد ہیں۔ آپ نے کئی مرتبہ لوگوں کو یہ کہتے بھی سُنا ہوگا کہ وہ زمانے لد گئے جب ہم آپ کی چالوں میں آجاتے تھے۔ اب ذرا منہ دھو رکھیے۔ اس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ یعنی گذشتہ زمانے میں تو ہم بے شک دُھلے دُھلائے احمق تھے مگر اب وہ زمانہ گذر چکا ہے۔ اس قسم کا ایک مزے دار واقعہ یاد آ گیا لگے ہاتھوں وہ بھی سُن لیجیے:-

ایک صاحب ریلوے سٹیشن پر ٹکٹ خریدنے لگے۔ اتفاق کی بات اُدھر بابو صاحب کو دو چار جھکّی قسم کے مسافروں سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ اِدھر ان ٹکٹ خریدنے والے صاحب کو اپنی آزادی اور نئے حقوق کا شدت سے احساس تھا۔ انھوں نے کچھ اینڈی بینڈی بات کی تو بابو صاحب کہنے لگے۔ بھائی صاحب آپ کو ٹکٹ لینا تھا۔ وہ لے لیا۔ اب جھگڑتے کیوں ہو؟ ہونہہ! ہمیں بھی کیسے کیسے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ یہ سنتے ہی مسافر صاحب چراغ پا ہو گئے۔ گرج کر فرمایا "خبردار جو مجھے انسان کہا۔ تم انگریز کے زمانہ میں بھی کہ ہم سے تو تڑاق کر لیا کرتے تھے۔ مگر وہ زمانے لد گئے۔ سمجھے!"

سمادھی بھائی رام سنگھ

● بھیشم ساہنی ● دھارمک طنز

اور عین سورج چڑھتے چڑھتے بھائی رام سنگھ نے چولا بدل دیا۔ صرف اُن کا جسم کیچڑ، مٹی اور خون سے لت پت ہو گیا تھا اور اس کے گرد بوتلوں اور ٹھیکروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ "اس خالی چولے کو مٹی میں تو ملنا ہی تھا ــــــ"

یہ واقعہ میرے شہر میں ہوا۔ یہ واقعہ اور کہیں پر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ شہروں میں شہر ہے تو میرا شہر اور لوگوں میں لوگ ہیں تو میرے شہر کے لوگ جو اپنے برابر کسی کو سمجھتے ہی نہیں۔ ہمارے شہر کے باہر ایک گندہ نالہ بہتا ہے۔ پتلا، بوڑھا، سست۔ جس میں اتنا پانی بھی نہیں کہ اس میں بھینسیں بیٹھ کر اپنا بدن ہی ٹھنڈا کر سکیں مگر ہم اسے دریا کہتے ہیں۔ ایک باغ ہے جس میں شیشم اور سفیدے کے پیڑوں کے علاوہ تیسرا درخت نہیں۔ اور کوؤں اور چیلوں کے علاوہ کوئی پرندہ نظر نہیں آتا۔ نیچے جھاڑ جھنکاڑ ہے۔ ہر وقت گرد اڑتی ہے۔ بہار کے موسم میں بھی وہاں ہریالی نظر نہیں آتی لیکن شہر والے اسے چمن کہتے ہیں۔ اور اُسے کسی بھی گلزار سے زیادہ خوبصورت مانتے ہیں۔ لوگ خود نہ ہنسوں میں نہ کوؤں میں۔ نہ وہ پٹھان نہ پنجابی لیکن وہ اپنے آپ کو پٹھانوں سے بھی بڑے پٹھان اور پنجابیوں سے بھی بڑے پنجابی مانتے ہیں۔ اس شہر کی کوئی چیز اپنی نہیں۔ پھل آتے ہیں تو کابل سے اور کپڑا آتا ہے تو ولایت سے۔ اس کے اپنے پھل تو گنتی کے آلوچے، لسوڑے اور گنڈے ہوتے ہیں۔ جنھیں اب بکریوں نے بھی کھانا چھوڑ دیا ہے مگر شہر والے اسے پھلوں کا نگر اور کپڑے کی منڈی مانتے ہیں۔ اس شہر والوں کی فقط ایک ہی چیز اپنی ہے۔ ان کی مونچھیں جن کے کونے ہمیشہ اوپر کو اٹھے رہتے ہیں اور ان میں کبھی خم نہیں آتا۔

اس لئے یہ واقعہ یہیں پر ہی ہو سکتا ہے۔

اگرچہ شہر بہت پرانا نہیں۔ کوئی تاریخی یادگار یا مندر نہیں۔ مگر کسی شہر واسی سے کہہ کر تو دیکھئے۔ وہ آپ کو اس نظر سے دیکھے گا جیسے وہ کسی گپھا میں رہنے والے کو دیکھ رہا ہو۔ اور پھر پوچھے گا۔

"تم نے بھائی رام سنگھ کی سمادھی دیکھی ہے؟"

اور اس کے بعد سمادھ کی تعریف میں اور بھائی رام سنگھ کی تعریف میں وہ ایک قصیدہ کہہ ڈالے گا۔ بھائی رام سنگھ کسی مذہب کے گورو نہیں تھے۔ تواریخ میں کہیں ان کا نام نہیں ملتا۔ اس شہر سے باہر اس بے چارے کو کوئی جانتا تک نہیں مگر یہاں اُسے اور اس کی سمادھ کو شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے اور اگر ملک بھر کا بچہ بچہ نہیں جانتا تو اس میں قصور ملک والوں کا ہے شہر والوں کا نہیں۔

جو واقعہ میں آپ کو سُنانے لگا ہوں وہ اسی سمادھ سے تعلق رکھتا ہے۔

یوں تو ہمارا شہر چھوٹا سا ہے جس میں ایک لمبا سا بازار کپڑے والوں کا۔ ایک بازار نانبائیوں کا۔ ایک سبزی منڈی۔ ایک

اناج منڈی۔ ان گنت گلیاں اور درجن بھر کے قریب محلے ہیں۔ شہر کے بیچ ایک اونچا سا ٹیلہ ہے جس پر ایک مندر ہے اور جس کے چاروں طرف لمبی لمبی سڑکیں اُترتی ہیں جیسے شو جی کی جٹا سے ایک کی بجائے چار ندیاں بہہ نکلیں۔ لوگ سست ہیں جو کام کرتے ہیں وہ بھی اور جو کام نہیں کرتے وہ بھی۔ چوبیں گھنٹوں میں شہر کا ایک چکر ضرور کاٹتے ہیں اس لئے گلیوں اور سڑکوں پر رونق رہتی ہے۔

اسی رونق بھرے ماحول میں آج سے کوئی بیس برس پہلے ایک روز اسی ٹیلے پر، مندر کی بغل میں سے نکل کر بھائی رام سنگھ چوراہے پر آکھڑا ہوا تھا۔ گورا رنگ، لمبی بچھیاتی داڑھی۔ کچھ کچھ کالی۔ کچھ کچھ سفید، اور تندرست ناٹا بدن۔ اس وقت اس کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب ہوگی۔ بغل میں ایک سفید گاگر اٹھائے۔ بدن پر سفید چادر اور سفید انگوچھا پہنے وہ ٹیلے پر نمودار ہوگیا مگر کسی نے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ چوراہے کے ایک طرف چند لڑکے کھیل رہے تھے۔ بھائی رام سنگھ آہستہ آہستہ ان کی طرف چلا گیا اور ایک لڑکے کو اپنی طرف بُلا کر بولا: "لو بیٹا۔ یہ پیو" اور گاگر میں سے کٹوری بھر کر لڑکے کی طرف بڑھائی۔

لڑکے سب اکٹھے ہوگئے اور بڑے تحیّر سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک لڑکے نے بھائی رام سنگھ کے ہاتھ میں سے کٹوری لے لی اور کئی مرتبہ ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد مُنہ سے لگائی اور دوسرے ہی لمحے اُسے تھوک دیا اور کٹوری پھینک دی۔

"یہ چرائتا ہے بیٹا۔ اس سے پھوڑے پھنسی نہیں نکلتے۔ لو۔ تھوڑا تھوڑا سب پیو"

مگر کسی نے ہاتھ نہ بڑھایا۔ جس نے چکھا تھا وہ اب تک تھو تھو کر رہا تھا اور باقی لڑکے کھڑے اس پر ہنس رہے تھے۔

آخر بھائی رام سنگھ اُن سے پرے ہٹ کر ایک سڑک سے نیچے اُترنے لگا اور راہ چلتے بچوں۔ بڑوں سب کو چرائتا پینے کی دعوت دیتا ہوا آہستہ آہستہ شہر کی گلیوں میں کھو گیا۔

اس طرح بھائی رام سنگھ کا اس شہر میں ظہور ہوا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں بھائی رام سنگھ کو شہر کے سب لوگ جان گئے۔ جہاں جاتا عورتیں اپنے کھیلتے بچوں کو پکڑ پکڑ کر اس کے سامنے لے جاتیں اور جبراً چرائتا پلواتیں۔ کیونکہ چرائتا سچ مچ پھوڑے پھنسیوں کا بہترین علاج ثابت ہوا جس گلی میں پہنچتا بچے فوراً چھپ جاتے اور عورتیں ان کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگتیں۔ لوگ ہنستے اور بھائی رام سنگھ کی کھلّی اڑاتے۔ لوگوں کے لئے بھائی رام سنگھ ایک تماشہ بن گیا مگر اس کی سرگرمیوں میں کوئی کمزوری نہیں آئی۔ بلکہ کچھ ہی دنوں بعد اس کی گاگر میں چھوٹا سا نل لگ گیا تاکہ چرائتا انڈیلنے میں آسانی ہو پھر ایک کٹوری کی بجائے تین کٹوریاں آگئیں تاکہ تین آدمی ایک ساتھ پی سکیں۔ پھر بھائی رام سنگھ کے کندھے سے ایک بگل بھی لٹکنے لگا جس محلے میں جاتا پہلے بگل بجا کر اپنی آمد کی خبر کر دیتا۔

لوگ طرح طرح کے قیاس اٹھانے لگے۔ کوئی کہتا کہ ساتھ والے قصبے سے آیا ہے۔ وہاں اس کی کپڑے کی دوکان تھی، کوئی کہتا جاسوس ہے کسی قاتل کی کھوج میں آیا ہے۔ میرے شہر والے قیاس بھی لگاتے ہیں تو چھاتی ٹھونک کر۔ کسی نے کہا اس کے پاس چالیس ہزار روپیہ نقد ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ لڑکے کہتے کہ شمشان بھومی میں رات کے وقت بھی شہر کے چکر کاٹتا ہے اور بھوتوں کو بھی چرائتا پلاتا ہے۔ طرح طرح کی باتیں ہوئیں مگر آہستہ آہستہ بند ہوگئیں۔ بھائی رام سنگھ زیادہ بولتا نہیں تھا۔ اس سے اگر کوئی پوچھتا تو کہتا:۔

"گورو مہاراج کے چرنوں میں رہتا ہوں۔ ان ہی کا داس ہوں۔"

جب جیٹھ بیساکھ گذر گئے تو بھائی رام سنگھ گاگر میں ٹھنڈا پانی پلانے لگا۔ جب موج آئی تو کسی دن پانی کی جگہ صندل کا شربت پلانے لگتا۔ ہمارے شہر کا صندل کا شربت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اور جاڑے کے دنوں میں کبھی کبھی الائچیوں والی چائے بھی لوگوں کو ملتی۔ غرض کہ بھائی رام سنگھ کا چکر جوں کا توں قائم رہا اور شہر میں وہ چرائتے والے سادھو کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اسی بے غرضانہ خدمت میں دس برس بیت گئے۔ اب جس سادھو کی اپنی کوئی جگہ ہو۔ اپنا اڈا ہو۔ وہ سادھو سے جلد ہی سنت بن جاتا ہے۔ مگر جو ہمیشہ گھومتا رہے اس کی چوچا چاہے جتنی بھی ہو وہ بھائی کا بھائی ہی رہتا ہے۔ بھائی رام سنگھ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ان دس برسوں میں بھائی جی کی داڑھی کے بال ریشم کی طرح سفید ہو گئے۔ چہرے پر جھریاں پڑ گئیں۔ حالانکہ چہرے کی رونق جوں کی توں قائم رہی کیونکہ جو آدمی گاگر اٹھائے تین چار میل کا چکر روزانہ کاٹے اس کے چہرے پر تو رونق رہے گی ہی۔ مگر اب بھی بھائی رام سنگھ پیاؤ والا سادھو ہی رہا۔ اب بھی گلیوں میں ہے گھومتا ہوا جاتا تو وہی لوگوں کو نمسکار کرتا۔ اُسے نمسکار کرنے کے لئے اپنی جگہ سے کوئی نہ اٹھتا۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ بھلا پیاؤ پلانے سے بھی کوئی سنت بن سکا ہے!

پر ایک دن نہ معلوم بھائی رام سنگھ کو بیراگ ہوا یا بھرم ہوا۔ یا اس نے کوئی خواب دیکھا، یا سچ مچ ہی اُسے الہام ہوا کہ وہ صبح سویرے ٹیلے پر آ کر کہنے لگا "بھگتو! رات کو گورومہاراج کا پروانہ آ گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ کل صبح دن چڑھتے ہی میں چولا بدل جاؤں گا۔"

یہ بات اس نے ٹیلے پر بدھ سنگھ بزاز کی دکان کے سامنے کہی، جہاں وہ دن میں پہلی بار بگل بجاتا تھا۔ آج بھی اس کی بغل میں گاگر تھی۔ بدھ سنگھ بزاز نے سُنا مگر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ مگر اس کے چھوٹے بھائی نے جو نام دھاری سکھ ہو گیا تھا سُن لیا۔ کہنے لگا: "سُنا بھائی رام سنگھ نے کیا کہا؟ وہ چولا بدلنے جا رہے ہیں۔"

سردار بدھ سنگھ نے جواب دیا: "میں نے سُن لیا ہے۔ تو سمجھتا ہے میں نے سُنا نہیں! چولا بدلتا ہے تو بدلے۔ مجھے اُس کے منہ میں آگ تھوڑے دینی ہے! تیرے بیٹے پیاؤ پیتے رہے ہیں۔ تو اس کے پاؤں پکڑ۔"

اس پر دونوں بھائی ہنس کر چپ ہو رہے۔

مگر دکان پر بیٹھی ہوئی دو عورتوں کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی۔ پہلے وہ بھی بے نیاز رہیں مگر جب کپڑا لیکر لوٹتی ہوئی وہ سیا رام کی گلی میں سے گذریں اور گلی کے موڑ پر بھائی رام سنگھ کو گھڑے پیاؤ پلاتے دیکھا تو ان کے دل میں رحم پیدا ہو گیا اور ایک نے دوپٹے کا آنچل منہ پر رکھتے ہوئے کہا

"ہائے بیچارا کل چولا چھوڑ دے گا مگر آج بھی پیاؤ پلا رہا ہے۔"

بس پھر کیا تھا۔ خبر پھیلنے میں دیر نہیں لگی۔ سیا رام کی گلی سے بات نئے محلے میں پہنچی۔ وہاں سے چھاچھی محلے میں۔ پھر منڈا بازار۔ بھاپڑ تھلہ۔ سید پوری دروازہ۔ ایک گلی سے دوسری گلی تک پہنچتے ہوئے اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ خبر بونڈر کی طرح شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھومنے لگی کہ پیاؤ والا بھائی رام سنگھ کل صبح ہی پو پھٹتے ہی چولا چھوڑ دے گا۔

اب بھائی رام سنگھ کی گاگر حسب معمول لنڈا بازار کے سرے پر پہنچ کر ختم ہو گئی اور وہاں سے اس نے قدم موڑ لئے اور شہر سے باہر جہاں پیڑوں کا ایک جھرمٹ ہے جسے ہم تپوبن کہتے ہیں ایک پیڑ کے نیچے جا پہنچا۔

تپوبن شہر کے باہر، کیکر اور پلاس کے درختوں کا ایک جھرمٹ ہے۔ جہاں ایک پرانا کنواں ہے جس پر ہم لوگ داتن کرنے اور نہانے جایا کرتے ہیں۔ وہاں کوئی رہتا نہیں۔ صرف کبھی کبھی آنے والے سنتوں کی کتھا ہوتی ہے۔

دوپہر تک تو تپوبن میں خاموشی رہی مگر جوں ہی دو بجے کا وقت ہوا اور عورتوں نے چوکے اٹھائے تو کئی بھگتنیاں ہری نام جپتی ہوئی۔ دل میں ہائے ہائے کرتی، بھائی رام سنگھ کو کھوجتی وہاں آ پہنچیں۔ چار بجتے بجتے عورتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ مردوں نے سُنا تو ہنسے مگر آہستہ آہستہ اُن کا صبر بھی ٹوٹنے لگا۔ کیا معلوم یہ بھی کوئی پہنچا ہوا سنت ہو! درشن کرنے میں کیا حرج ہے! کچھ تماشے کے خیال سے۔ کچھ درشنوں کے خیال سے۔ بچے بوڑھے، جوان سب وہاں پہنچنے لگے۔ آخر شہر تو وہی تھا۔

جائیں تو سب جائیں اور اگر سب جائیں تو گھر میں بیٹھنا حرام ہے!

بھائی رام سنگھ جو ابھی تک بھائی رام سنگھ ہی تھا دوپہر تک سنت بن گیا اور شام ہوتے ہوتے اسے سنت مہاراج کا خطاب بھی مل گیا کیونکہ مرادیں بن مانگے پوری ہو جاتی ہیں۔ جسے دس برس تک کسی نے نہیں پوچھا تھا آج اس کے درشن کو ہزاروں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر جھانک رہے تھے۔ درخت کے نیچے آسن بچھا دیا گیا۔ پھر کہیں سے چوکی آگئی۔ درشنوں کے لئے سنت مہاراج کا اونچا بیٹھنا ضروری تھا۔ ایک بھگت چنور جھلنے لگا۔ پھولوں کے ڈھیر لگنے لگے۔ کہیں سے گیس کا لیمپ آگیا۔ پھر دو لیمپ آگئے۔ عورتوں کی بھگتی کی تو کوئی حد ہی نہ تھی۔ آٹا، گھی نچھاور ہونے لگے۔ بھائی رام سنگھ کو بھی آنکھیں بند کئے ہوئے عالم مستی میں بیٹھنا پڑا۔ پھر کہیں سے باجے۔ طبلے وغیرہ آگئے۔ کیرتن ہونے لگا۔ لوگ جھک جھک کر بھائی صاحب کے نورانی چہرے کو پرنام کرنے لگے۔

بات مسلمانوں کے محلے میں بھی جا پہنچی۔ سنت پرسبھوں کے ساجھے ہوتے ہیں مسلمان بھی آپہنچے۔ واہ واہ! کیا جلال ہے! عورتیں گھروں کو ٹوٹتیں مگر گھروں میں ان کے پاؤں کب ٹکتے تھے؟ جو دال روٹی بن پاتی بنا کر پھر دوڑی دوڑی وہاں آپہنچتیں۔

رات کے بارہ بج گئے۔ بے قراری بڑھنے لگی۔ ایک نرم دل بڈھی عورت نے ہاتھ باندھ کر بھائی جی سے التجا کی کہ مہاراج! رحم کرو۔ چولا نہ بدلو۔ مہاراج نے سنا۔ مسکرائے اور چپ چاپ آنکھیں آسمان کی طرف کر کے پھر دھیان میں مست ہو گئے۔ سارے شہر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ تماشائی قسم کے لوگ اسی انتظار میں تھے کہ کب چار بجیں اور وہ چولا بدلنے کا معجزہ دیکھیں۔

رات گہری ہونے لگی۔ لوگ گھڑیاں دیکھنے لگے۔ اس رات بھر میں کوئی نہیں سویا۔ گلیاں سنسان ہو گئیں۔ اُن میں سے کوئی آواز اٹھتی تو صرف بھاگتے دوڑتے قدموں کی۔ ایک دروازہ کھٹکتا۔ ایک آواز اُبھرتی۔ دو بجے ہیں۔ بس اب دو گھنٹے باقی رہ گئے۔ تو بیٹھ میں ابھی آتا ہوں۔ تو جائے گی تو بچوں کو کون دیکھے گا؟ میں لوٹ آؤں گا تو تو چلی جانا۔ رات بھر یہی قصہ چلتا رہا۔ جب مرد کے قدم دور نکل جاتے تو عورت کے قدموں کی آواز آنے لگتی۔

تین بج گئے۔ پھر ساڑھے تین۔ کیرتن میں اب ہزار ہا دعوتیں حصہ لے رہی تھیں۔ بلند مکانوں میں گیت گائے جا رہے تھے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے بھی پتوں میں سے جھانک جھانک یہ زمینی معجزہ دیکھ رہے تھے۔

پونے چار بجتے بجتے جے جے کار ہوا اٹھی۔ مہاراج نے آنکھیں کھولیں۔ عورتوں نے رو رو کر ایک دوسری سے کہا: "وقت آن پہنچا۔ دیکھو انھیں خود بخود پتہ چل گیا ہے۔"

اندھیرا ابھی بہت گہرا تھا۔ مگر لوگ اپنی اپنی گھڑیوں پر ایک ایک منٹ اونچی آواز میں گن رہے تھے۔ ہمارے شہر میں چار بجنے کا وقت ہمیشہ پو پھٹنے کا وقت مانا جاتا رہا ہے۔

چار بجنے میں پانچ منٹ پر سنت جی چوکی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ جوڑے، سر جھکائے نیچے آکر عین چوکی کے سامنے لیٹ گئے اور چھاتی پر دونوں ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کر لیں۔ عقیدت اور بھگتی کے بندھ ٹوٹ پڑے۔ عورتیں سسکیاں لے لے کر رو اٹھیں اور مہاراج پر پھول برسائے جانے لگے۔

چار بجنے میں ایک منٹ پر ——— یکدم سناٹا چھا گیا۔ چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ ہری نام کی آواز بالکل ساکت ہوئی عورتوں کے آنسو سوکھ گئے اور آنکھیں بھائی رام سنگھ کے چہرے پر گڑ گئیں۔ سب لوگ سانس روکے گورو مہاراج کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ٹھیک چار بجے مہاراج نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور ہلنا جلنا چھوڑ دیا۔

لوگ چپ چاپ آنکھیں پھاڑے دیکھتے رہ گئے۔ دو ایک نے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر جیسے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "گئے! ہمیں چھوڑ کر چلے گئے!"

پھر شہر کے ایک حکیم نے آہستہ سے پاس آکر کچھ پھول ہٹاتے ہوئے مہاراج کی نبض دیکھی اور سر ہلا کر بولے: "آہستہ ہے۔

مگر چل رہی ہے۔"

لوگ چُپ تھے۔ اُن کی آنکھیں اب بھی سادھو مہاراج کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ چار بج کر تین منٹ پر پھر کھیا نے نبض دیکھی۔ پھر سر ہلایا اور آہستہ سے کہا: "دھیمی ہے مگر چل رہی ہے۔"

دوسرا کھیا بولا: "دنیاوی گھڑیوں کا کیا اعتبار؟ جب اُدھر چار بجیں گے تو چولا اپنے آپ چھوٹ جائے گا۔"

چار بج کر پانچ منٹ ہو گئے۔ نبض اب بھی چل رہی تھی۔ کھیا نے جھک کر کان میں مہاراج سے پوچھا: "مہاراج کیسے ہیں؟"

جواب دھیما سا آیا: "میں انتظار میں ہوں۔ میں نے اپنی طرف سے چولا چھوڑ دیا ہے۔"

لوگ ایک ایک سیکنڈ گن رہے تھے۔ چار بج کر سات منٹ پر پھر کھیا نے نبض پکڑی اور ایک منٹ تک پکڑے بیٹھے رہے۔ انھوں نے اب بھی کچھ اوپچی آواز میں کہا: "نبض جوں کی توں چل رہی ہے۔"

لوگ ایک دوسرے کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگے۔ سر ہلنے لگے۔ چہروں پر شک کے آثار نظر آنے لگے۔ پھر دوسرے کھیا نے کھڑے ہو کر کہا: "سادھو مہاراج کیا دیری ہے؟"

مہاراج نے آنکھیں بند کئے ہوئے جواب دیا: "میں تو تیار ہوں۔ اُدھر سے منظوری آئے جب نا؟"

جو عقیدت اور بھگتی پہلے محبوبانہ انتظار میں تبدیل ہو گئی تھی اب شک اور غصّے میں بدلنے لگی۔ لوگ سمجھنے لگے جیسے اُن کے ساتھ تماشا کیا گیا ہے۔ اُن کی بے عزتی کی گئی ہے۔

عین سوا چار بجے جب کھیا نے چلا کر پوچھا کہ اب کیا دیری ہے۔ ہم کھڑے کھڑے تھک گئے ہیں تو بھائی رام سنگھ ہاتھ جوڑ کر اٹھ بیٹھے: "بھگوان مجھے رُلا رہے ہیں۔ میں کیا کروں۔ میں ہر لمحہ انتظار کر رہا ہوں۔"

مگر اس فقرے کا الٹا اثر ہوا۔ عورتیں بھی بولنے لگیں: "ہیں۔ دیکھو یہ تماشہ دیکھو۔"

دو ایک صاحب جو کرشنے کے انتظار میں جاگتے رہے تھے اور عورتوں سے لڑ کر آئے تھے۔ آگے بڑھ کر آئے: "سالے جانتا نہیں یہ کون شہر ہے؟"

مہاراج ڈر کر اٹھ بیٹھے اور ہاتھ جوڑے ہوئے چوکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بولے:۔

"دن چڑھنے سے پہلے میں چولا چھوڑ جاؤں گا۔ بھگت مجھے یہی پروانہ ملا ہے۔ اب آپ گھر کو جائیے۔"

"اب دن کب چڑھے گا؟ چار تو کب کے بج گئے۔" لوگوں نے چلا کر کہا۔

"بھائیو آپ گھر لوٹ جائیں۔ میں نے یہاں کسی کو نہیں بُلایا۔ آپ لوگ جائیں۔۔۔۔ سورج چڑھنے سے پہلے۔۔۔۔"

مگر لوگوں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی باڑھ آگے بڑھ آئی۔ لوگ گھونسے کسنے لگے۔ شہر کے پانچ سات سنڈے اور مشٹنڈے سامنے آ گئے۔

بھائی رام سنگھ ڈر کر چوکی کے پاس سے ہٹ گیا اور ایک پیڑ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اس کے وہاں سے ہلتے ہی دھکم دھکا شروع ہو گئی۔ بھائی رام سنگھ کو گھونسے پر گھونسے پڑنے لگے۔ جس کے جو ہاتھ لگا اسی سے مرمت کرنے لگا۔

بھائی رام سنگھ کا بھاگتا ہوا اڈھا نچہ کبھی ایک پیڑ کے پیچھے کبھی دوسرے کے پیچھے آسرا ڈھونڈنے لگا۔ مگر جہاں کہیں بھی وہ جاتا بھگت وہیں جا پہنچتے۔ بھلا بھگتوں سے بھی کبھی کوئی بھاگ سکا ہے؟ پہلے گھونسے اور لکے پڑتے رہے۔ جب وہ بھاگ کھڑا ہوا تو جوتے اور پتھر پڑنے لگے۔ بھائی رام سنگھ بار بار چلایا: "بھائیو! میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ مجھے مت مارو۔ میں نے تمہاری سیوا کی ہے۔"

مگر بھگتوں کے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کسی ایک نے چھڑانے کی بھی کوشش کی۔ مگر پتھروں کے ڈر سے وہ پیچھے ہٹ گئے

پھر سچ مچ ایک کرشمہ ہوا جس کی چرچا آج بھی ہمارے شہر کے لوگ بڑے غرور سے کرتے ہیں۔ عین سورج چڑھتے چڑھتے بھائی رام سنگھ نے چولا بدل دیا اور اس کے سانس کا پرندہ اڑ کر بھگوان کے پاس جا پہنچا۔ ہاں صرف اس کا جسم کیچڑ اور مٹی اور خون سے لتھ پتھ ہو گیا تھا اور اس کے گرد جوتوں اور پتھروں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ مگر وہ تو آخر خاکی چولا تھا۔ اُسے تو مٹی میں ملنا ہی تھا۔

اس کرشمے کا اثر ہونے میں دیر نہیں لگی۔ جب دن چڑھ آیا اور رات کا بھرم دور ہوا اور بھائی رام سنگھ کا جسم ایک مردہ ڈھانچے کی طرح سامنے نظر آنے لگا۔ تو ایک نے کہا: "ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ اُسے جو پرماتما سے حکم ملا تھا کہ سورج چڑھنے سے پہلے چولا بدلنا ہوگا تو وہ اُسے کیونکر ٹال سکتا تھا۔"

پھر دوسرے نے کہا: "بھلا پتھر مارنے کی کیا ضرورت تھی۔ مرتو اُسے یوں بھی جانا تھا۔ ہم لوگوں میں صبر کا مادہ بالکل نہیں؟"

بس پھر کیا تھا۔ عورتوں نے اپنے دوپٹے منہ میں ڈال لئے۔ آنسو بہنے لگے۔ بھگت پھر اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔ جوتے پتھر ہٹا دیئے گئے اور پھول برسائے جانے لگے۔ اور بھائی رام سنگھ کا خالی چولا پھولوں کے نیچے پھر دبنے لگا۔ اور بھائی رام سنگھ کی ارتھی اسی سج دھج سے نکلی کہ شہر والے خود اپنی عقیدت پر عش عش کرنے لگے۔

اور بھائی رام سنگھ کی سمادھی پیتوں کے پاس عین اسی جگہ پر بنائی گئی جہاں وہ آسن پر بیٹھے تھے! ایسی سفید۔ خوبصورت چمکتی عمارت ہے کہ رات کو بھی دور سے نظر آتی ہے اور اس پر ایک گول گنبد بھی ہے۔ سنت جی کی گاگر وہاں موجود ہے اور سفید نیا باتا بھی۔ کیونکہ خون آلودہ باتا تو چولے کے ساتھ چلا گیا تھا۔ اور ایک جوڑا کھڑاؤں کا بھی جسے کسی بھگت نے اپنے پیسوں سے خرید کر وہاں رکھ دیا تھا۔ اور ہمارے شہر کے بچے بوڑھے سچے دل سے مانتے ہیں کہ کوئی اولیا اس کلجگ میں ہوا ہے تو سنت رام سنگھ جسے بھگوان نے ایک دن درشن دے کر سورج چڑھنے سے پہلے پہلے اپنے پاس بلا لیا۔

●

بقیہ صفحہ ۱۱۴

باپ سینیٹر ہے اور اس کے بعد میں سینیٹر بنوں گا۔ میں اس کا اکلوتا بیٹا ہوں اور اس کی جائداد کا تنہا وارث۔ ہم نے اس ملک کو بنایا ہے اور اس ملک کی کہانی ہماری کہانی ہے۔ الاسکا میں بھی کلارک کنبہ رہا ہے۔ فلپائن میں بھی۔ نئے میکسیکو میں بھی کیا تم پورے امریکہ کو قتل کر دینا چاہتی ہو؟

لزی :۔ اگر تم اور نزدیک آئے تو .....

فریڈ :۔ گولی چلاؤ۔ چلاؤ گولی۔ دیکھا تم گولی نہیں چلا سکتیں تم ایسی لڑکی مجھ ایسے لڑکے کو قتل نہیں کر سکتی۔ آخر تم کیا ہو؟ تم کیا کر سکتی ہو؟ کیا تمہیں اپنے دادا کا نام بھی معلوم ہے؟ مجھے زندہ رہنے کا حق ہے۔ ابھی بہت کام باقی ہے اور کام میرا منتظر ہے۔ لاؤ یہ ریوالور مجھے دیدو۔

(لزی اسے ریوالور دیدیتی ہے۔ وہ اسے اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے)

فریڈ :۔ عبشی بہت تیز دوڑا۔ میرا نشانہ خطا گیا (توقف۔ وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیتا ہے) میں تمہیں پہاڑی پر ایک مکان خریدوں گا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر۔ نہایت ہی اچھا مکان جس میں باغ ہوگا۔ تم باغ میں چہل قدمی کر سکو گی۔ لیکن تمہیں باہر نہیں جانے دوں گا۔ میں بہت ہی حاسد ہوں۔ میں ہفتے میں تین مرتبہ تم سے ملنے آیا کروں گا۔ منگل۔ جمعرات اور سنیچر کی شام کو۔ تمہارے یہاں کالے ملازم ہوں گے۔ اور تمہارے پاس اتنی دولت ہوگی جتنی کہ تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھی۔ مگر تم کو میری بات کرنا ہوگی جو میں چاہوں گا۔ مجھے تم سے بہت کچھ چاہیئے۔

(لزی خود کو اُس کے بازوؤں میں ڈھیلا چھوڑ دیتی ہے) کیا میں تمہیں پسند آیا تھا۔ مجھے بتاؤ کیا میں تمہیں پسند ہوں؟

لزی :۔ (غنودگی کے عالم میں) ہاں۔ مجھے تم پسند ہو۔

فریڈ :۔ (اس کے گالوں پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے) پھر تو ہر بات کتنی لطف انگیز ہوگی۔ تم مجھے فریڈ کے نام سے پکار سکتی ہو۔

(پردہ)

طلبا کے لئے بنڈ مطلوب ہیں

● ایک مزاحیہ فیچر

غلام احمد فرقت

پنڈت نہرو سے معذرت کے ساتھ جن کا کہنا ہے کہ اگر یونہی ہنگامے ہوتے رہے تو ہم دوسری یونیورسٹیاں بنوا کر نئے لڑکے بھرتی کرلیں گے۔

فصل بدل رہی تھی۔ گرمی جاڑے میں اور جاڑا گرمی میں حلول کر رہا تھا۔ دونوں موسموں کے لبوں پر "من تو شدم تو من شدی" کی گردان تھی۔ فصل کی تبدیلی کا اثر نوجوانوں کے خون پر پڑ رہا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبا فصدیں کھلوانے میں مصروف تھے۔ فصدیں فائرنگ اور لاٹھی چارج سے کھولی جارہی تھیں۔ کمزور طلباء اور طالبات کو پہلے اشک آور گیس سے بے ہوش کر دیا جاتا تھا اسکے بعد لاٹھیوں سے عمل جراحی کے فرائض انجام دیئے جاتے تھے۔ نئے آزاد ملک میں اگر فصدیں کھلوانے میں جدت پسندی سے کام لیکر یہ "سائینٹفک" طریقہ نہ اختیار کیا جاتا تو دنیا کو ہرگز یقین نہ آتا کہ ملک شاہراہِ آزادی پر گامزن ہے اور دیس تحقیق اور تدقیق کی پٹریوں پر فاسٹ پسنجر سے زیادہ تیز رفتاری دکھا رہا ہے۔ اس فصد بازی میں ہاتھوں کی لغزش سے ایک رکشا والا، ایک خوانچہ والا ایک ہاؤس سرجن ذرا مرگیا۔ تو انسان مرنے کے لئے ہی تو پیدا ہوتا ہے۔ خود شاعر کہہ گیا ہے۔

آزاد ملک کے مہامنتری نے طلباء کے اتنے بڑے پیمانہ پر خون میں ہیجان ہونے کی شدید مذمت کرتے ہوئے ایک جلسہ میں کہا کہ اگر یہی تماشے ہوتے رہے اور ضرورت پڑی تو ساری یونیورسٹیاں بند کردی جائیں گی اور ان کی جگہ نئی یونیورسٹیاں کھول لی جائیں گی۔ نیا طریقۂ تعلیم جاری کرکے بیسک طریقۂ تعلیم رائج کر دیا جائے گا۔ دیس کے پردھان منتری بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند کرنا اسی کو تو کہتے ہیں۔ دیکھئے نا۔ ایک جملہ میں ملکی اور تعمیری پروگرام کی ایک دنیا بسا دی۔ کلام پر اشاریت، رمزیت اور تعبیر کے باریک ریشمی پردے پڑے ہیں۔ مگر ان پردوں میں "صنعتِ اندر سبھائیت" بھی تو ملاحظہ کیجئے۔ آپ نے غور سے نہیں دیکھا۔ ان پردوں کی اوٹ میں پنجسالہ پروگرام کی بہو بیٹیاں رقص کر رہی ہیں۔ پس پردہ کہیں بے روزگاری کے مسائل چھپن چھپری کھیلتے نظر آتے ہیں، کہیں دیس کے دیوتا نے آزادی کی روح اپنے طریقۂ تعلیم کے رواج دیئے جانے پر مسکرا رہی ہے کہیں بیسک ٹرینڈ ٹیچرس پروفیسرانہ انداز میں پشت پر ہاتھ باندھے ابھی سے رعونت اور فخر و مباہات کے ساتھ اپنی اپنی چالوں کا ریہرسل کر رہے ہیں کیونکہ نئی یونیورسٹیاں کھلنے پر انہی کو پروفیسر ہونا ہے۔ بیسک ٹریننگ کے لوہار، کمہار اور خرادیئے کھڑے مہامنتری کے بھجن الاپ رہے ہیں اور ان کے دہنِ اقدس سے لفظ "کن" کے منتظر ہیں کیونکہ ان کو مستقبل میں ڈین آف دی فیکلٹی آف آرٹس ہونا ہے۔ اگر مہامنتری کے اس چھوٹے سے جملے کی تعبیر کی جائے تو کسی بڑے سرکس کی سال بھر کی کمائی مفسر کو آسانی سے مل سکتی ہے۔ فقرے کی تہ میں ہزار ہا رمز چھپے ہوئے ہیں۔ اسی کا نام تدبر ہے اور اسی کو لغوی معنوں میں سیاست کہتے ہیں۔ اگر طالب علم ہیں تو بتایئے تاکہ اس فقرے کا کیا مفہوم ہے! آپ یہی بتائیں گے کہ "مہامنتری کا کہنا ہے کہ اگر اسی طرح خون کی جولانی کے مظاہرے ہوئے تو فصدیں کھلوانے میں

لاٹھی چارج، گولیوں اور اشک آور گیس کا استعمال کیا جائے گا۔ ساری یونیورسٹیاں بند کر دی جائیں گی تعلیم ختم ہو جائے گی اور جس طرح پڑھنے لکھنے سے پہلے وہ بلا تکلف وہ مارے مارے پھرنا شروع ہو جائیں گے"۔ ایک طالب علم کی عقل کی رسائی اور تخئیل کی پہنچ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر چونکہ آپ مادر زاد "یتیم العقل والغنی" واقع ہوئے ہیں اس لئے مہامنتری کی سیاست دانی اور باریک بینی تک آپ کی طفلانہ نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں۔ ابھی عقل پرنانہ اں ہیں اور یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے عقدہ ہائے لاینحل کا تجزیہ کرنے بیٹھے ہیں اور —— ارباب حل وعقد بھی کیسے جن کی جوتیاں افلاطوں اور سقراط سیدھی کرنے کی آرزو میں بند راجل ہو گئے۔ پس آپ کا فرض ہے کہ آپ اس فقرے کا مفہوم سمجھئے اور یاد کیجئے اس کے ہجے اور معنے ورنہ ایک دن آپ کو بھی ولیں کی اسمبلی یا پارلیمنٹ کا ممبر بنا دیا جائے گا اور پھر سر پکڑ کر روئیے گا کہ کیوں نہ سیاست کو سمجھا۔ اچھا تو سمجھئے اُن معنوں کو جو اس سنہرے فقرے میں ہیرے اور جواہر کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور ان سوالوں کا جواب دیجئے جو آپ سے کئے جانے والے ہیں:-

سوال۔ بتائیے یونیورسٹیاں کیوں بند کر دی جائیں گی؟

جواب۔ اس لئے کہ ملک میں اینٹیں کم ہیں۔ نئی یونیورسٹیاں ان ہی کو توڑ کر اسی ملبہ سے بن سکتی ہیں کیونکہ آزادی سے پہلے تعمیر کے لئے جو مسالہ تھا اس سے آزادی کی عمارت تعمیر کر لی گئی۔

(شاباش کچھ کچھ سمجھتے معلوم پڑتے ہو)

سوال۔ اچھا بتائیے کہ بغیر یونیورسٹیاں بند کئے نئی یونیورسٹیاں کیوں نہیں کھولی جاتیں؟

جواب۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہماری قومی حکومت کے پاس چونا لگانے والے تو ہیں مگر جہاں تک اینٹوں کا تعلق ہے وہ سب جشنِ خشت باری میں استعمال ہو جاتی ہیں اسی لئے بغیر ان کے توڑے نئی یونیورسٹیاں نہیں بن سکتیں۔

(ذہانت سے کام لے رہے ہو)

سوال۔ اچھا بتائیے کہ یونیورسٹیوں کی توڑ پھوڑ اعلان کئے بغیر ایک دم سے کیوں نہیں شروع کر دیتے؟

جواب۔ بات یہ ہے کہ اگر بغیر اعلان کے عمارت گرائی جانے لگے گی تو جو لڑکے پڑھتے ہوں گے وہ سب کے سب کچل جائیں گے اور سب کی سب جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

(احمق کہیں کے۔ پھر بہکے۔ ارے بیوقوف! لڑکوں کے کچل جانے اور مر جانے کا کس کو غم ہے۔ جتنے لڑکے مریں گے ان کی جگہیں دنیا میں خالی ہوں گی اور ان کی خالی جگہوں کو بیکاروں سے بچے پیدا کرا کے پُر کر لیا جائے گا۔ اگر اُن کے مرنے ہی کا غم ہوتا تو لاٹھی چارج اور گولیوں سے ان کی فصدیں کیوں کھلوائی جاتیں۔ پھر سوچکر جواب دو)

جواب۔ لڑکے جنھوں نے یونین کے تالے توڑ ڈالے وہ کھلی چیز کو بند کیوں ہونے دیں گے۔ وہ یونین کھولتے ہیں پولیس ان کا سر کھولتی ہے۔

(شاباش۔ اب کچھ دماغ میں مضم ہونے کی صلاحیت پیدا ہو چلی ہے)

سوال۔ اچھا! بتائیے کہ جب یونیورسٹیاں بند ہو جائیں گی تو لڑکے کہاں سے آئیں گے؟

جواب۔ اس سوال کا جواب ذرا بڑا ہے۔ اس میں قدرے وقت لگے گا۔

(یہ وقت کی قیمت کیا؟ سچ کہتا ہوں اگر تمہارے اس فقرے کو کوئی خالص پردھان منتری سُن لے تو تم کو آج ہی انگریزوں کی طرح دیس نکالا مل جائے۔ ہندوستان سے انگریزوں کو کیوں نکالا گیا؟ جواب دو)

جواب۔ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے میں آزادیٔ وطن اور محبّانِ وطن کی قربانیوں کو دخل تھا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں پر بڑے مظالم کیے تھے۔ جلیان والے باغ میں اُن پر گولیاں برسائی تھیں۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر اُن پر لاٹھیوں کی بارش کی گئی تھی اور بدنصیبوں نے بعد میں ۴۲ء میں بہت زیادہ قتل وغارت کی تھی۔

(تمہارے معلومات بالکل ناقص ہیں تم کو یہ تک نہیں معلوم کہ انگریزوں کی یہ ساری خطائیں بالکل بخش دی گئی تھیں لیکن ان کی ایک خطا ایسی تھی جس میں بخشش کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا اور وہ خطا ان کی وقت کی قدردانی تھی غضب خدا کا وہ قوم جس نے ڈیڑھ سو برس تک ہم ہندوستانیوں کی روٹیاں توڑیں ہوں اور ہمارے دیس پر قابض رہی ہو وہ مرتے مرتے وقت کی قدردانی میں شمہ برابر فرق نہ آنے دے۔ ہمارے سماجی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے بھلا اس کو ایک منٹ بھی برداشت کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانیوں نے وقت کو بتدریج وقت کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرکے ان پر وقت تنگ کردیا جس کے سبب ان کو ہندوستان چھوڑتے بنا خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اب یہ بتاؤ کہ جب نئی یونیورسٹیاں بن جائیں گی تو اُن کے لئے لڑکے کہاں سے لائے جائیں گے۔

جواب۔ نئی یونیورسٹیاں بننے پر نئے لڑکے بھی بنوالئے جائیں گے۔

(شاباش۔ شاباش۔ اس سے پہلے یہ ذہانت کہاں چھپائے بیٹھے تھے)

سوال۔ اچھا نئے لڑکوں کو بنوانے کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے گی؟

جواب۔ کمہاروں سے یا ہندوستان کے بے کار پڑھے لکھے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے۔

سوال۔ تو کیا ملک میں اسی وجہ سے بیکاری بڑھ رہی ہے کہ آئندہ ان بے کاروں کو لڑکے بنوانے کے کام میں استعمال کیا جائے۔

(ہیں تو کیا آپ یہ سمجھ رہے تھے کہ ابھی تک یہ ساری بے کاری بغیر کسی مقصد کے بڑھ رہی ہے اور ملک میں فسادات اور ہنگاموں کے ذریعہ مخالفین کی آبادی میں جو کمی کی جارہی ہے وہ سب مذاق ہو رہا ہے۔ ارے احمق! یہ سب کچھ ایک پنجسالہ پروگرام کا ایک جز ولاینفک ہیں اور یہ فسادات اور ہنگامے گو بادی النظر میں لڑائی جھگڑے معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں یہ پنجسالہ پروگرام کے چھوٹے بڑے ٹکڑے ہیں۔ فائرنگ، لاٹھی چارج اور اشک آور گیس جس کے ذریعہ سائنٹیفک طریقہ پر نصدیں کھولی جاتی ہیں۔ یہ سب اسی پروگرام کی کڑیاں ہیں جن کو عرف عام میں کمیونٹی پروجکٹ بھی کہتے ہیں۔ اگر لوگ نہ مریں گے تو گویا نئی روحیں زندوں کے سروں پر آکر ٹھیں گی نئی روحوں کے لئے بہرحال جگہ نکالنا ہی پڑے گی)

سوال۔ اچھا بتاؤ کہ نئی یونیورسٹیوں کے لئے جو لڑکے بنوائے جائیں گے ان کی وضع قطع کیا ہوگی؟ ان کی بنوائی کے پیسے کہاں سے آئیں گے؟ بننے کے لئے ان کے نمونے دیئے جائیں گے یا ان کی ناپ مقرر کردی جائے گی!

(جہاں تک پیسے کا سوال ہے روپیہ تعزیراتی جرمانوں کے ذریعہ وصول کیا جائے گا اور جہاں تک وضع قطع کا تعلق ہے سرکار ان کے لئے ٹنڈر طلب کرے گی۔ کہیں دنیا میں کوئی چیز بغیر ناپ تول کے بھی بنی ہے۔ سُنار سے جب ایک معمولی انگوٹھی بنوائی جاتی ہے تو پہلے اس کو انگوٹھی کی وضع اور انگلی کی ناپ دی جاتی ہے تب کہیں جاکر حسب منشا انگوٹھی بنتی ہے پھر یہ چونکہ سرکاری کام ہے اس لئے تمام یونیورسٹیاں کھلواتے کے بعد ہر کلاس کے لئے نمونے کے لئے بذریعہ اشتہار بنوائے جائیں گے اور بے کاروں کو بلوا کر سمجھایا جائے گا کہ وہ فلاں فلاں وضع اور فلاں فلاں ڈھانچے اور ذہنیت کے لڑکے ڈھالنا شروع کردیں۔ معاملہ چونکہ سرکاری ہے اس لئے ذرا بھی کھوٹ ہوئی اور لڑکا نامنظور۔ دوسرے اس سلسلہ میں ٹنڈر طلب کئے جائیں گے جس کے اشتہار کا سرکاری مضمون یہ ہوگا)۔

"ملک میں جو یونیورسٹیاں بننے جا رہی ہیں اُن کے لئے ایسے کارآمد بے روزگار نوجوان مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو مندرجۂ ذیل لڑکے اور لڑکیاں بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ امیدواروں کو ایک انتخابی بورڈ کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور طبی معیار پر پورے اُترنے کے بعد اُن کے نمبر منظور کئے جائیں گے۔"

نمبر۱۔ **فرسٹ ایر**۔ یعنی پرائمری درجہ پانچ کے لئے مندرجۂ ذیل وضع کے لڑکے بنوانا مطلوب ہیں:۔

خصوصیات:۔ کوتاہ عقل، جملہ ذہانتوں سے مبرّا۔ ناریل کی ٹہنی سے قدرے نکلتا سر، سر میں بجائے عقل کے پانی یا بھُس یا ہوا بھری ہو، بول سکتا ہو مگر ہندی اور اُردو بھی وہ جو نئی ٹکسال سے بن بن کر نکل رہی ہے اور وہ جو خود اس کے والدین سمجھنے سے قاصر ہوں۔

نمبر۲۔ **سکینڈ ایر**۔ یعنی پانچویں جماعت سے آٹھویں جماعت کے لئے۔

خصوصیات:۔ اپنی عمر سے زیادہ غبی ہو LEARNING BY DOING کا ان معنوں میں قائل ہو کہ اپنی حماقتوں کا آپ کفیل ہو۔ عقل و فہم سے کوتاہی ہر آن رکھتا ہو۔ ذہنی طور پر دیوالیہ ہو۔ سینہ بسینہ کو دن چلا آتا ہو۔

نمبر۳۔ **تھرڈ ایر**۔ یعنی نویں اور دسویں جماعت کا طالب علم۔

خصوصیات:۔ عقل وغیرہ پرائمری پیمانے کی۔ سرکار کی ہر نامعقول بات صحیح مخرج سے ادا کرتا ہو۔ کھدر میں بسایا ہوا پانی پیتا ہو اور چرخے پر کتی ہوئی روٹی کھاتا ہو۔

نمبر۴۔ **فورتھ ایر**۔ گیارہویں سے بارہویں جماعت تک کے طلباء کے لئے۔

خصوصیات:۔ اتنا بڑا غیرت دار ہو کہ اگر شریف گردش اس کی نااہلیت سے متاثر ہو کر اسے قلمدان وزارت عطا کرے تو جس وقت تک جنتا گردن میں ہاتھ دے کر اُسے نہ نکالے وہ پوری پامردی سے اپنے عہدے پر ڈٹا رہے گدھے سے زیادہ حلیم اور خچر سے زیادہ عجیب الطرفین ہو۔ بڑھتا ہوا ڈیل اور گھٹتی ہوئی عقل رکھتا ہو۔

اچھا جاؤ اور اب ان یونیورسٹیوں کے لئے نصاب بن رہا ہے اس کی ایک کاپی لے آؤ تاکہ اس کے نصاب کے بارے میں تم کو بعض ضروری ہدایات دی جا سکیں۔

تخلّص

ایک مرتبہ مولانا محمد علی مرحوم سے کسی دوست نے سوال کیا۔ "آپ تین بھائی ہیں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپ تینوں شاعر ہیں۔ آپ کا تخلص جوہر ہے۔ آپ کے دوسرے بھائی کا تخلص گوہر ہے۔ لیکن شوکت علی کا کیا تخلص ہے۔

مولانا محمد علی نے برجستہ جواب دیا "شوہر" مولانا کا جواب بڑا معنی آفریں تھا۔ کیونکہ مولانا شوکت علی واقعی چار بیویوں کے شوہر تھے۔

پالیسی کا فیصلہ

جگدیش چندر

جرنلسٹوں کے لئے

"کیا آپ ایک دیانتدار اور جرنلسٹ ہیں؟ تو مہربانی فرماکر آپ کسی بھی واقعہ کی رپورٹ حاصل کرنے کے لئے مت جایئے۔ ہاں اگر آپ صرف جرنلسٹ ہیں تو بلا خوف وخطر جایئے۔ کیونکہ آپ کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو آپ کی دیانت ہے۔

ٹیلیفون سن کر ایڈیٹر صاحب جلدی سے اٹھے اور کچھ دور تک کرسی گھسیٹتے ہوئے اخبار کے پروپرائٹر کے کمرے میں جا گھسے۔ ان کی میز کے قریب کھڑے ہو کر ہکلاتے ہوئے کہنے لگے "ہنومان ٹرانسپورٹ لمیٹڈ کے مالک سیٹھ رادھا کرشن کے ساتھ حادثہ ہو گیا"۔

اور پھر میز پر کہنیاں ٹکا کر اپنا منہ پروپرائٹر کے کان کے نزدیک لے جاکر رازدارانہ انداز میں بولے:

"ان کے زخم ایسی جگہ آیا ہے کہ پبلک کو پتہ چل جائے تو ناک کٹ جائے۔ ساری عزت آبرو مٹی میں مل جائے۔ پروپرائٹر نے چند لمحے اس بات پر غور کیا اور ایڈیٹر صاحب کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا "سیٹھ رادھا کرشن تو آل انڈیا..... ایسوسی ایشن کی سٹیٹ برانچ کے چیرمین ہیں" "اور میں اس کی ایگزیکٹو کمیٹی کا ممبر ہوں"۔

"جی ہاں۔ وہ یوگ سدھار سبھا کے سرپرست بھی ہیں۔ پچھلے دنوں انھوں نے ایک بہت بڑا یگیہ کیا اور ستھیا چار اور بلیک مارکیٹ سے توبہ کی۔ پچھلے پاپوں کا کفارہ کرانے کے لئے سادہ جیون بسر کرنے اور لوگوں کی سیوا میں زندگی صرف کرنے کا حلف لیا۔ ہزاروں روپیہ دان میں دیا۔ اس کا اشتہار ہمارے اخبار میں بھی شائع ہوا تھا"۔ ایڈیٹر صاحب نے خبر کی اہمیت کو بڑھانے کے لئے سیٹھ صاحب کی سوشل پوزیشن کو ذرا بڑھا چڑھا کر بتایا۔ پروپرائٹر کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا اور پھر لمبی "ہوں" کے بعد بات شروع کرتے ہوئے بولا۔

"ایڈیٹر صاحب اس خبر کی پوری پوری کھوج کی جانی چاہیئے۔ سیٹھ صاحب شہر کے ایک اعلیٰ رکن ہیں اور ان کی ہر حرکت شہریوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور عوام کے خادم اور ترجمان کی حیثیت سے ہمارے اخبار کا فرض ہے کہ لوگوں کو سچائی اور حقیقت سے روشناس کرائے"۔

"اسی لئے تو میں آپ کے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ میرا خیال ہے دیال داس کو اس کام کے لئے بھیجا جائے"؟ ایڈیٹر صاحب کرسی پر جم کر بیٹھ گئے۔

"ہم اس خبر کو اس اہتمام اور ڈھنگ سے شائع کریں گے کہ شام تک یہ ہر شہری کی زبان پر ہو"۔

پروپرائٹر نے لمبی سی ہوں کی اور دیال داس بلانے کے لئے بھیج دیا گیا۔

تھوڑی دیر بعد دیال داس ڈرتا ڈرتا کمرے میں داخل ہوا اور ایک کونے میں میز سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ایڈیٹر صاحب اس سے بولے۔

دیال داس۔ آج تمہیں بہت اہم رپورٹنگ کے لئے بھیج رہا ہوں"۔

دیال داس آگے کھسک آیا اور پروپرائٹر کا اشارہ پاکر کرسی پر بیٹھ گیا۔

شاہراہ

"جس طرح بھی ہو اس خبر کی تفصیلات نکال کر لاؤ" اور پھر ایڈیٹر صاحب کی طرف دیکھ کر پروپرائٹر کہنے لگا "دیال داس تجربہ کار آدمی ہے۔ خبر نکالنے میں اس کا بڑے بڑے اخبار نویس مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

دیال داس ذرا مسکرا دیا اور ایڈیٹر صاحب کی بات غور سے سننے لگا۔

"خبر ملی ہے کہ ایک بھنگن نے سیٹھ صاحب پر حملہ کیا ہے اور زخم ایسا آیا ہے کہ اگر بات نکل جائے تو اُن کی ناک کٹ جائے" ایڈیٹر صاحب نے اُسے اس خبر کے مختلف پہلو سمجھا دئے تو پروپرائٹر کہنے لگا۔

"اب تم جلدی چلے جاؤ۔ ٹیکسی میں چلے جانا۔ جلدی پہنچ جاؤ گے" اور پھر دوسرے لمحے سوچ کر کہنے لگے "وہاں تو بس بھی جاتی ہے۔ بس میں چلے جاؤ۔" اُن کا ہاتھ جیب تک بڑھا اور خالی واپس آگیا تو پروپرائٹر کہنے لگا۔

"تمہارے پاس سائیکل تو ہوگی۔ سائیکل پر جانا ہی مناسب ہے۔ شاید وہاں دو ایک جگہ اور جانا پڑے۔"

دیال داس پروپرائٹر کی ان باتوں پر خوش ہوتا ہوا باہر نکلا۔ اپنی میز پر آکر اُس نے جلدی جلدی کاغذ سمیٹے۔ پیڈ اُٹھایا۔ فاؤنٹین پن کو ٹھیک طرح سے جیب میں رکھا اور چاروں طرف دیکھ کر اس طرح قمیص اور پتلون کی جیبیں تھپتھپانے لگا جیسے کوئی بھولی ہوئی چیز یاد کر رہا ہو اور وہ سارے دفتر کی نظروں میں اپنے آپ کو اونچا اُٹھاتا ہوا باہر آگیا۔

اس نے سائیکل اُٹھائی اور سیدھا ہنومان بھون جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ آج وہ اپنے آپ کو ایک ذمے دار و سنجیدہ اور قابل فرد سمجھ رہا تھا۔ جس کے کندھوں پر بڑے لوگوں کی کرتوتوں۔ عوام کی بے چارگی اور شہر کی عام سماجی حالت کو منظرِ عام پر لانے کا بوجھ پڑ گیا تھا۔ اُس نے اس خبر کی اصلیت پانے اور سچائی تک پہنچنے کا پلان بنا لیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ آج اُسے اپنی قابلیت دکھانے کا موقع ملا تھا ورنہ آج تک تو وہ قلم سے کاغذ پر الفاظ کا گھاس بویا کرتا تھا۔

جب وہ ہنومان بھون کے سامنے پہنچا تو وہاں پر کچھ بھیڑ جمع تھی۔ وہ سائیکل پھینک کر ان لوگوں کے پاس گیا اور ایک ایک سے اِس واقعہ کی تفصیل پوچھنے لگا۔ سب لوگ جو کچھ انھیں معلوم تھا بتا کر کہہ دیتے۔

"جی۔ کچھ پتہ تو چلتا نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ سیٹھ نے بھنگن پر اُسے لوٹنے کے لئے حملہ کیا اور کئی لوگ کہتے ہیں کہ سیٹھ صاحب کی جیب میں نوٹ دیکھ کر بھنگن کا دل بے ایمان ہو گیا اور پھر ہنس کر کہتے۔ "شاید سیٹھ صاحب نے ہاتھ اُٹھایا ہے۔"

دیال داس نے لوگوں کی رائے سے اندازہ لگایا کہ معاملہ کچھ دگرگوں ہے۔ آوازِ خلق کبھی جھوٹ تو ہوتی نہیں۔ وہ اپنی پلان پر غور ہی کر رہا تھا کہ اندر سے ایک آدمی آیا اور ان لوگوں کو جھڑک کر کہنے لگا۔

"کیوں یہاں کھڑے شور مچا رہے ہو۔ جاؤ اپنے اپنے گھر جا کر آرام سے بیٹھو۔"

دیال داس آگے بڑھا اور اُس آدمی کے پاس جا کر کہنے لگا۔

"میں اخبار کا نمائندہ ہوں۔ اس حادثے کی تفصیل پوچھنے آیا ہوں سیٹھ صاحب کو چوٹ تو زیادہ نہیں آئی۔"

اُس آدمی نے دیال داس کو غور سے دیکھا اور اسے کوئی 'چار سو بیس' قسم کا آدمی سمجھ کر کہنے لگا۔

"جائیے جائیے تشریف لے جائیے۔ یہاں کچھ نہیں ہوا۔"

دیال داس نے اُس کی طرف حقارت اور غصّہ سے دیکھا۔

"جناب یہاں بہت کچھ ہوا ہے اور شام کے ضمیمے میں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔ مجھے تو سیٹھ صاحب سے ہمدردی ہے۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ اُن سے مل کر خبر کو اس طرح بدلوں کہ اُن پر حرف تک نہ آسکے۔"

دیال داس کو اس طرح باتیں کرتے دیکھ کر لوگ پھر اکھٹے ہو گئے۔ وہ کہنے لگا۔

"آپ ذرا جلدی سے چلیں۔ اگر ہجوم اس رفتار سے اکھٹا ہوتا رہا تو مصیبت بن جائے گا۔"

وہ آدمی دیال داس کو اندر لے گیا اور اس نے پوری کہانی سنائی کہ کس طرح بھنگن بنگلے میں آئی۔ اس نے سیٹھ صاحب کی جیب میں سبز نوٹ دیکھے۔ انھیں اکیلا پاکر اس کا دل بے ایمان ہوگیا۔ کس طرح وہ انھیں علیحدہ جگہ لے گئی اور ان پر حملہ کر دیا۔ دیال داس نے اس سے کچھ سوال پوچھے جن پر وہ آدمی گھبرا گیا اور کوئی جواب نہ بنا تو دیال داس تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"خیر یہ سوال تو سب بے معنی تھے۔ سیٹھ صاحب جیسے بڑے آدمی پر حملہ واقعی شرمناک ہے۔" لیکن اس آدمی کو شک پڑ گیا کہ دیال داس کو اصلی واقعات معلوم ہیں اس لئے جب وہ جانے لگا تو اس نے اسے روک لیا اور کمرے میں جا کر سیٹھ صاحب کا ایک تصویر اور ایک بند لفافہ لایا۔

"آپ نے ہمارے لئے اتنا کشٹ اٹھایا اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔" اور لفافہ دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"سیٹھ صاحب نے یہ آپ کو تحفہ دیا ہے۔" دیال داس نے لفافہ چاک کر کے ایک سبز نوٹ دیکھا تو جیسے وہ مفلوج ہوگیا۔ اس کے دماغ میں کئی خیالات بیک وقت اٹھے لیکن جب اسے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا تو اس نے لفافہ پھینک دیا اور کہنے لگا۔

"آپ اسے رہنے دیجئے صرف سیٹھ صاحب کی تصویر دے دیجئے اور جس ڈاکٹر کے وہ زیر علاج ہیں ان کا پتہ بتا دیں۔" یہ سنکر وہ آدمی شش و پنج میں پڑ گیا اور پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔

"ڈاکٹر کا ایڈریس لے کر آپ کیا کریں گے؟"

"یہ تو میرا کام ہے۔ ڈاکٹری رپورٹ کے بغیر خبر کیسے بنے گی؟"

اس آدمی نے دیال داس کو ڈاکٹر کا ایڈریس اور سیٹھ صاحب کی تصویر دے دی۔ جانے سے پہلے دیال داس اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا آپ نے پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی؟" اس آدمی نے سر ہلا دیا تو دیال داس سیٹھ کو گالیاں دیتا ہوا باہر نکل آیا اور سائیکل اٹھا کر سوچنے لگا کہ اب کدھر جائے۔ وہ وہاں سے سیدھا ڈاکٹر کے نرسنگ ہوم میں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب سے سیٹھ صاحب کے بارے میں پتہ کیا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ اس نام کا کوئی آدمی آج ان کے نرسنگ ہوم میں داخل نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کے لئے انھیں اپنا روزنامچہ دکھایا جس پر داخل ہونے والے مریضوں کا نام پتہ سب کچھ درج ہوتا تھا۔ دیال داس چند لمحوں کے لئے سوچتا رہا اور پھر ڈاکٹر صاحب کے کندھے پہ ہاتھ رکھکر انھیں ذرا پرے لے گیا اور سمجھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"میں تو آپ کی بھلائی کی بات کر رہا ہوں۔ سیٹھ صاحب آپ کے زیر علاج ہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کی مرہم پٹی ابھی ابھی ہوئی ہے اور میں کمرہ نمبر تک بتا سکتا ہوں۔ اخبار میں اگر لاعلمی کی وجہ سے آپ کے خلاف ایک آدھ جملہ لکھا گیا تو آپ کی پوزیشن خراب ہوگی اور لوگ آپ کو بدمعاشوں کا مددگار کہیں گے۔" ڈاکٹر صاحب گھبرا گئے اور اس کے کان میں آہستہ سے کہنے لگے۔

"آپ کی بات تو ٹھیک ہے۔ میں تو یہ کیس ہاتھ میں نہیں لیتا تھا لیکن لالچ میں آگیا۔ عام حالات سے دس گنا فیس لی ہے۔" اور اس نے زخم اور سیٹھ صاحب کی حالت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور دیال داس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"دیکھئے۔ میرا اس لپیٹ میں نہ آجاؤں۔ میں تو اپنے پیسے کی وجہ سے مجبور ہوں۔"

دیال داس اسے تسلی دے کر نرسنگ ہوم سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر صاحب دوڑے دوڑے اس کے پیچھے آئے۔

"آپ کے پاس سواری کا انتظام نہیں تو آپ میری کار سے جائیں۔"

"نہیں۔ میرے پاس سائیکل ہے۔" اور جب دیال داس سائیکل اٹھا کر کاریڈور سے باہر نکلنے لگا تو ڈاکٹر صاحب پھر کہنے لگے۔

"آپ خبر میں میرا ذکر نہ لائیں۔ میں نے تو آپ کو سب کچھ بتا دیا اور کبھی میرے لائق کوئی سیوا ہو تو ضرور تشریف لائیں۔ بندہ ہاتھ باندھ کر حاضر ہوگا۔"

دیال داس ان سے رخصت لے کر سڑک پر آگیا۔ اس کے پاؤں زمین پر ٹک نہیں رہے تھے اپنی فتح کے نشے میں مسرور وہ اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کے قلم کی جنبش سے ایک ہنگامہ بپا ہو جائے گا۔ وہ نفرت سے کہنے لگا۔

"یہ بڑے لوگ جتنے بڑے ہیں اتنے ہی کھوٹے ہیں۔ پیسے کو اپنا ایمان تو سمجھتے ہیں لیکن دنیا کا ایمان بھی سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان سب کو ایسا رگڑا دوں گا کہ کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔" وہ اس واقعہ پر مختلف پہلوؤں سے غور کرتا ہوا چوراہے پر آ کھڑا ہوا اور سوچنے لگا کہ اب کدھر جائے۔ چند لمحوں میں ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اسے بھنگیوں کی بستی میں ضرور جانا چاہیئے۔ وہاں سے اس واقعہ کی اصلیت کا پتہ چلے گا۔ وہ اندھا دھند پیڈل مارتا سائیکل کو بھگاتا اُن کی بستی میں جا پہنچا اسے دیکھ کر لوگ اپنے گھروندوں سے باہر نکل آئے اور پھر آہستہ آہستہ اکٹھے ہونے لگے۔ وہ سب اُسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ موقعہ کے مطابق اپنے ذہن میں سب باتیں سوچ کر ایک بزرگ بھنگی کے پاس گیا اور اُسے ہاتھ جوڑ کر نمستے کہہ کر بولا۔

"میں اخبار کا نمائندہ ہوں اور سیٹھ رادھا کرشن نے ایک بھنگن پر جو حملہ کیا ہے اس کی تفصیل پوچھنے آیا ہوں۔" اُن لوگوں نے گھور کر اُس کی طرف دیکھا جیسے یہ بات کہہ کر اُس نے زخموں کو کُرید دیا ہو۔ اُن میں سے ایک نوجوان خفا ہو کر کہنے لگا۔

"آپ یہاں سے چلے جائیں اور سیٹھ سے تفصیل پوچھ لیں۔ یہاں زیادہ بک بک کی تو چمڑی ادھیڑ دیں گے۔"

دیال داس کو اُن پر غصہ آ گیا۔ سوچنے لگا کہ عجیب لوگ ہیں۔ ان سے پوری پوری ہمدردی کر رہا ہوں اور یہ الٹا مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ اس نے انھیں یقین دلایا کہ وہ بھی اُن کی طرح غریب آدمی ہیں اور وہ اخبار میں ان کی حمایت میں آرٹیکل لکھے گا۔ لوگوں تک بڑے آدمیوں کی کالی کرتوتیں اور کارنامے پہنچائے گا۔ جب ان لوگوں کو یقین آ گیا تو انھوں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ سارا ماجرا سُن کر دیال داس کہنے لگا۔ "مجھے یہ تو معلوم تھا کہ سیٹھ نے ایک بھنگن پر حملہ کیا لیکن انھیں معلوم تھا کہ ساری بستی کو برباد کرنے کی دھمکی بھی دی ہے۔ آپ نے تھانے میں رپورٹ نہیں دی؟"

"دی تھی۔ لیکن پولیس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس معاملہ میں پولیس کا دخل دینا غیر قانونی ہوگا۔"

"تو پھر اب آپ کے کیا ارادے ہیں؟"

"ہم اس ظلم اور زیادتی کے خلاف ہڑتال کریں گے۔ اپنی آواز اُٹھائیں گے۔"

"میں آپ کی پوری پوری حمایت کروں گا۔" دیال داس جب وہاں سے رخصت ہوا تو وہ لوگ اُسے تھوڑی دور تک چھوڑنے آئے۔ دیال داس نے یقین دلایا کہ وہ ان کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

جب وہ دفتر پہنچا تو زیادہ گھومنے اور سائیکل تیز چلانے سے تھک چکا تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہ نہ کھا سکا تھا۔ لیکن وہ ان سے بے پروا ایک کونے میں جا بیٹھا اور سارے واقعہ کو اپنے ذہن میں تصویر بنا کر لکھنے لگا۔ اُس نے یہ خبر اس طرح بنائی کہ اس میں سیٹھ صاحب کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر پولیس اور دوسرے لوگوں کی جو اس جرم کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے کی غیر حسماتی کارروائیوں کا پردہ فاش ہو جائے۔ ایڈیٹر صاحب نے اسے دو تین بار کہا کہ اس کو اب رہنے دو اور آ کر دوسری خبریں بناؤ لیکن وہ اپنے کام میں مست رہا۔ سیٹھ صاحب کی تصویر اس نے کارٹونسٹ کو دے دی کہ وہ اس کا اس طرح کارٹون بنائے کہ سیٹھ صاحب کے اندر جو حیوان چھپا ہوا ہے وہ سامنے آ جائے۔ اُس نے خبر میں لالچ اور دھمکیوں کے ذریعے پردہ پوشی کی کوششوں کے خلاف بھی بہت زور سے لکھا۔

جب اُس نے خبر بنا دی اور ایڈیٹر صاحب کے سامنے اس طرح رکھ دی جیسے بہت بڑا قلعہ سر کر لیا ہو۔ تو اس نے خبر کو پڑھا اور اُسے پاس بلا کر کہنے لگا۔

"پولیس کو خواہ مخواہ اس میں لانے کی کیا ضرورت ہے۔ پولیس کے ساتھ بلاوجہ دشمنی اچھی نہیں ہوتی۔" اور اُس نے قلم اُٹھا کر وہ سب جملے کاٹ دیئے جن میں اس نے پولیس پر نکتہ چینی کی تھی۔ دیال داس سٹپٹا کر رہ گیا اور کہنے لگا۔

"لیکن یہ بالکل سچے واقعات ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن ہر سچی بات اخبار میں نہیں چھاپی جا سکتی۔ اور بھی بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔" اتنی دیر میں آرٹسٹ سیٹھ صاحب کا کارٹون بنا لایا۔ دیال داس نے اُسے خبر کے ساتھ ٹانک دیا۔ اُسے پولیس پر نکتہ چینی نکال دئے جانے کا افسوس ضرور تھا لیکن وہ خوش تھا کہ سیٹھ رادھا کرشن اور ڈاکٹر صاحب کا بھانڈہ تو ضرور پھوٹ جائے گا۔ ایڈیٹر صاحب نے خبر اُسے دیتے ہوئے کہا۔

"یہ خبر بہت اہم ہے ذرا ایڈورٹائزنگ منیجر کو بھی دکھا دینا۔"

دیال داس خبر لے کر اس کے پاس چلا گیا اور اس کے سامنے کاغذوں کا پلندہ رکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ خبر ذرا دیکھ لیں۔ بہت اہم نیوز ہے۔"

ایڈورٹائزنگ منیجر نے کارٹون کو غور سے دیکھا اور مُسکرا دیا۔ ساری خبر پڑھ کر اس نے قلم اُٹھا لی اور دیال داس سے کہنے لگا۔

"اصلی مجرم تو سیٹھ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو خواہ مخواہ کیوں بیچ میں گھسیٹ لائے۔"

دیال داس نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن منیجر نے پچھلے دن کا اخبار نکال اُس کے سامنے رکھ دیا اور اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ اُن کا اشتہار ہے۔ نرسنگ ہوم کے اس اشتہار سے ہمیں کم از کم سو روپیہ ماہانہ کی آمدنی ہے۔ اس چھوٹی سی خبر کے لئے اتنی بڑی پارٹی کو خراب نہیں کیا جا سکتا" اور اُس ڈاکٹر کے خلاف جو کچھ لکھا تھا وہ سب کاٹ دیا۔ دیال داس کو غصّہ تو بہت آیا لیکن وہ چپ چاپ خبر اُٹھا کر چلا گیا جیسے کسی بچّے کا جنازہ اُٹھائے جا رہا ہو۔ ایڈورٹائزنگ منیجر اُسے آواز دے کر کہنے لگا۔

"یہ خبر ذرا پروپرائٹر صاحب کو بھی دکھا لینا۔ بہت اہم نیوز ہے۔"

دیال داس پروپرائٹر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ پروپرائٹر نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

"لکھ لائے خبر" اور اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھنے لگا۔ ساری خبر پڑھ کر وہ کہنے لگا۔

"خبر تو تم نے بہت اچھی لکھی ہے لیکن سیٹھ صاحب کو اس طرح بدنام کرنا ہمارے اخبار کی پالیسی کے منافی ہے وہ آل انڈیا.... ایسوسی ایشن کی سٹیٹ برانچ کے چیرمین ہیں۔ لاکھوں روپئے دان دیتے ہیں سوسائٹی کے ایک اعلیٰ اور ذمے دار رکن ہیں۔ اوّل تو انھوں نے ایسی حرکت کی نہیں۔ اگر کی بھی ہو تو اسے اس طرح لکھنا نہیں چاہیئے" پروپرائٹر صاحب نے قلم سے کچھ حصّے کاٹ دئے اور دیال داس کو واپس بھیج دیا۔ وہ مایوسی میں ڈوبا ہوا اپنی کرسی پر آ گرا جیسے اسکی کمر ٹوٹ گئی ہو۔ تھوڑی دیر بعد انہیں پروپرائٹر صاحب نے پھر بلا بھیجا اور کہنے لگے۔" دیال داس اس خبر کو دوبارہ ٹھیک کرکے لکھو اور پھر ایڈورٹائزنگ منیجر کو بلا کر کہنے لگا آپ فوراً ہنوبان ملز لمیٹڈ کے دفتر میں چلے جائیں۔ ابھی اُن کا ٹیلیفون آیا تھا۔ وہ پورے صفحہ پر اشتہار دے رہے ہیں۔" اور پھر دیال داس کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔

"خبر میں لکھ دینا کہ کس طرح شہر کے مشہور ہریجن سیوک اور دان دیر سیٹھ رادھا کرشن پر ایک نیچ بھنگن نے حملہ کیا اور سیٹھ جی نے کاری زخم کھانے کے باوجود پولیس میں رپورٹ درج کرانے سے انکار کرکے اپنی ہریجن سیوا کا ناقابلِ تردید ثبوت دیا۔"

دیال داس کانپتے ہاتھوں سے لکھنے لگا اور جب ساری باتیں لکھ چکا تو پروپرائٹر صاحب سے کہنے لگا۔

"اس خبر پر عنوان کیا دوں؟"

"پہلے کیا دیا تھا؟"

"شہر کے مشہور سیٹھ کرشن کا ایک بھنگن پر شرمناک حملہ۔"

"اب لکھ دو........

"شہر کے مشہور و معروف سیٹھ رادھے کرشن پر ایک نیچ بھنگن کا قاتلانہ حملہ۔" اور وہ ایڈورٹائزنگ منیجر کو بلا کر کہنے لگے۔

"اشتہار دے کر یہاں فوراً ٹیلیفون کر دینا تاکہ خبر دی جا سکے۔ اگر ہو سکے تو پےمنٹ پیشگی وصول کر لینا۔"

خُدا چُھٹّی پر

دیویندر سنگھ ستھیارتھی
• پنجابی طنزیہ

دیویندر سنگھ کا خیال ہے کہ خُدا چُھٹّی پر گیا تھا تو نظامِ حیات بگڑ گیا تھا۔ لیکن اب وہ واپس آگیا ہے۔ مگر اپنا خیال ہے کہ نظامِ حیات کا بگاڑ تو اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے خدا دائمی چھٹی پر گیا ہوا ہے

اتوار کا دن تھا۔ میں علی الصبح اس گھری کی طرف جا رہا تھا جہاں سری گورو گرنتھ صاحب کا پرکاش تھا۔ ننّھے "شرن" نے رضائی سے مُنہ نکال کر انتہائی معصومیت سے پوچھا۔ "تایا جی۔ خدا کو چھٹی نہیں ہوتی کیا؟" میں "بالکل نہیں" کا "کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ مگر میرے دل میں ایک خلش سی لگ گئی۔

بچے نے سوال پوچھا تھا، اُسے جواب ملنا ہی چاہئے تھا۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے دل میں بچپن میں سُنی کسی کہانی کے نقش اُبھرنے لگے۔ دل ہی دل میں نے سوچا کہ اگر اُسے وُہ کہانی سُنا دوں تو اس کے لئے کافی دلچسپی کا سامان رہے گا۔

جب میں پاٹھ سے فارغ ہو کر آیا تو میں کہانی سُنانے کے لئے بیتاب تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے شرن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ننھے شیطان ادھر آؤ۔ تمھیں کہانی سُناؤں۔ خُدا کی چھٹی کی۔

شرن لگ بھگ نو برس کا نٹ کھٹ سا بچہ تھا۔ وہ پھدک کر بستر سے نکل آیا۔ ہم دونوں بیٹھنے کے کمرے کی طرف چلے گئے۔

"تو سُنو" میں نے شرن کو ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "خدا بھی چھٹی پر گیا تھا۔ صرف ایک دِن کے لئے۔ اپنی نوجوانی کے دنوں میں"

"ایک دن؟"

"ہاں صرف ایک دن"

"پھر کبھی چھٹی پر نہیں گیا وُہ؟"

"نہیں"

"کیوں۔ اُسے تھکان محسوس نہیں ہوتی؟"

"تھکے یا نہ۔ اُسے پہلی چھٹی اتنی مہنگی پڑی کہ اُسے دوبارہ چھٹی جانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی"

"وہ کیوں؟"

"یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خدا ابھی نوجوان تھا۔ دنیا بن رہی تھی۔ نیا نیا کام تھا۔ اس لئے خدا کچھ زیادہ مصروف رہتا۔ ایک دن علی الصبح جب ساری دنیا سوئی ہوئی تھی خدا بیدار ہوا۔ اس کا بدن تھکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ ساری رات وہ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ایک دن چھٹی لے کر آرام کرنے کو اس کا جی للچا رہا تھا۔

فرشتے بُلائے گئے۔ کافی غور و خوض کے بعد خدائی کا سارا کام ایک دن کے لئے ایک اچھے شاعر کو سونپنے کا فیصلہ ہوا۔ یہ سُنتے ہی شرن کچھ پوچھنے کے لئے بیتاب ہوا تھا اور اس نے میری بات ٹوکتے ہوئے کہا۔ "تایا جی آپ بھی تو شاعر ہیں"

"ہاں بیٹا"

"آپ کو نہیں بُلایا گیا تھا وہاں؟"

"نہیں بیٹا اُس زمانے میں میں نہیں تھا"

"باباجی وداداجی تھے۔؟"

"نہیں وہ بھی نہیں تھے۔ یہ بہت پُرانی بات ہے۔ بہت پُرانی"

"چلو پھر کوئی ہوگا" جب کوئی اپنا نہیں تھا تو اس میں شرن کی دلچسپی اڑ گئی تھی۔

"اچھا کوئی ہوگا۔ تم خاموشی سے بات سُنتے رہو"

"ہاں تو شاعر کو ایک دن کا خدا بنایا گیا۔ چارج لینے کے بعد نئے خدا نے کبیر کو حکم دیا کہ وہ ساری دُنیا کے لئے اس دن کے کھانے پینے کا انتظام کرے

"کبیر کون تھا۔ تایاجی۔ شاعر کا بھائی؟"

"نہیں بیٹا۔ وہ شاعر کا بھائی نہیں تھا۔ وہ خدا کا اسٹور کیپر ہے۔ دنیا میں کھانے پینے کی جو اشیا ہیں۔ ان سب کے ذخیروں کی کنجیاں اس کے پاس رہتی ہیں"

"باباجی کی طرح؟"

میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ شرن کے باباجی اور میرے چچا کمرے میں آ گئے تھے۔ شرن جھینپ گیا۔ میں نے کہانی پھر شروع کر دی۔

"چند لمحے ہی گذرے تھے کہ دروازہ پر چیخ وپکار کی آواز سنائی دی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کوئی بوڑھی سی عورت ہے جو کھانے کے لئے کچھ بھی لینے کو تیار نہ تھی۔ وہ خدا سے صرف مُلاقات کرنا چاہتی ہے۔

خُدا نے حکم دیا۔ "حاضر کرو"

"خدا کے دربار میں جو بڑھیا پیش کی اس کی شکل بہت بھیانک تھی۔ سارا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا جس پر گوشت کی بوٹی تک نہ تھی۔ اس کے بال لوہے کے تاروں کی طرح سخت تھے۔ اس کے گلے میں مختلف قسم کی کھوپڑیوں کے ہار پڑے ہوئے تھے۔ اس نے اندر آتے ہی نئے خدا کی تعریف میں چند فقرے کہے۔ داتا۔ میں بس تمہارے سہارے ہوں۔ پہلے خدا کو تو نئی دُنیا بنانے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ میری فریاد کون سُنتا۔ بہت مدت سے میں بھوکی ہوں، مجھے بھی کچھ کھانے کو مل جائے۔ آپ کا اقبال قائم رہے اور اس طرح اُس نے ان گنت دعائیں نئے خدا کو دیں۔

نئے خدا نے تعریف سے پھول کر کہا:۔ "مانگ کیا مانگتی ہے"

بڑھیا نے بہت انکساری سے کہا:۔ "حضور میری درخواست بس یہی ہے کہ آئندہ مجھے بھی پیٹ بھر کھانے کو ملے۔ جب آپ کی خدائی میں سب کچھ کھانے کو ملتا ہے تو مجھے کیوں نہ ملے"

فرشتے کانپ اُٹھے۔ تخت الٰہی سے فرمان ہوا۔ "جا تیری درخواست قبول ہوئی" ——————— کبیر نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا مگر خدا نے اُسے روک دیا۔ بڑھیا کھل کھلا کر ہنسی اور باہر ہوتے بولی: "شاید خدا کی بنائی ہوئی یہ ساری دنیا میرا ایک لقمہ بن سکے"

نیا خدا سکتے میں آ گیا۔ اُس کے منہ سے نکلا، کیا تم "موت ہو" اس وقت تک بڑھیا غائب ہو چکی تھی۔ نیا خدا اپنی سادگی اور جلدی کو کوس رہا تھا۔ مگر اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ تخت الٰہی سے دیا گیا فرمان واپس نہیں ہو سکتا تھا۔ خود خدا بھی اُسے واپس لینے کی طاقت نہیں رکھتا۔

دوسرے دن جب پُرانا خدا واپس آیا تو پہلے دن کی کارروائی سُن کر وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا کام اور بڑھ گیا تھا۔ جتنی دنیا وہ بنائے گا موت کھا جائے گی۔ یہ خیال اس کے لئے دکھ کا باعث بن گیا تھا۔

اس دن سے اس نے چھٹی پر نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

(پنجابی سے ترجمہ)

خطائے بزرگاں .....

کتاب کا مقدمہ عدالت کا کام کرتے اب تو میری حالت یہ ہوگئی کہ مقدمہ کے نام سے جی گھبراتا ہے خواہ وہ مقدمہ فوجداری یا دیوانی ہو یا مقدمہ کتاب۔ خدا کرے کوئی ذرا مجھے یہ بتا دے کہ کتاب کا مقدمہ کیا بلا ہے؟ عدالتی مقدموں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی بھلا مانس جیل خانہ پہنچ جاتا ہے یا کسی شریف آدمی کے گھر کی ترقی ہو جاتی ہے مگر کتاب کے مقدمہ سے تو اتنا بھی نہیں ہوتا۔ نہ اس سے کتاب کی وقعت بڑھتی ہے اور نہ قیمت۔ اگر کوئی کتاب اچھی ہے تو اس کے لئے کسی سفارش کی ضرورت نہیں۔ ع

باآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

اگر کوئی سڑیل کتاب ہے تو کسی افلاطون کا مقدمہ بھی اس کی قدر و منزلت نہیں بڑھا سکتا ع

کہ زنگی بشستن نہ گردد سپید

اگر مقدمہ سے مولف کا یہ مقصد ہے کہ اپنی تعریف کرائے تو اس کے لئے ہمارے ہاں شاعروں سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔ بھلا اس سے میرا کیا واسطہ نہ یہ کام میرے بس کا ہے اور نہ میں اس کام کے لئے موزوں ہوں۔ میں تو چھٹ سے انکار کر دیتا مگر کیا کروں کہ غلامی کا شوق روزگار کی صورت میں آکر عدالتی مقدمات کے فیصلے کراتا ہے اور میرے کرم فرماؤں کا جبر کتابوں کے مقدمے لکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ مزا تو یہ ہے کہ بعض احباب مجھ سے اپنی کتابوں کے مقدمے لکھواتے ہیں لیکن اپنی تعریف نہ پاکر ان کو چھپوانے سے گریز کرتے ہیں۔

(فرحت اللہ بیگ)

نیم ملّا ..... اتنے میں قاضی صاحب آگئے معہ تین چار احباب کے۔ اُن دونوں عربوں نے دوڑ کر اُن سے سلام علیک کی اور فوراً رخصت۔ قاضی صاحب کے ساتھ ہمارے وہ فارسی داں عراقی کرم فرما تھے جنھوں نے ہمارا قاضی صاحب سے تعارف کرایا تھا۔ جب سب آکر دوسرے کمرے میں بیٹھے تو بھائی اشذری نے کھانے کے وقت جو بدتمیزیاں ہوتی تھیں اُن کی سخت شکایت کی اور بالخصوص حبشی کی۔ وہ سخت متعجب ہوئے کہ "ہائیں تم کھانا کیسے کھا چکے؟ کھانا تو اب آئے گا" اب میں اشذری کی طرف دیکھتا ہوں اور اشذری میری طرف۔ قاضی صاحب حبشی پر آگ بگولا ہو کر گویا برس پڑے اگر کسی نے غضبناک عرب کو دیکھا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس نے غضبناک شیر دیکھا ہے اور پھر جبکہ عرب کے مہمان کی توہین کی گئی ہو۔ مگر حبشی نے جو جواب قاضی صاحب کو دیا اس سے وہ صرف خاموش ہی نہیں ہو گئے بلکہ ان کا غصہ رفو چکر ہو گیا اور شرمندہ ہو کر وہ معافی مانگنے لگے۔

قصہ مختصر ان فارسی داں حضرت نے بہت جلد معاملہ صاف کر دیا۔ واقعہ دراصل یوں تھا کہ باہر دوپہر کو قاضی صاحب کو دو سائل ملے اور ان سے قاضی نے کھانے کو کہا تھا کہ اول وقت آکر کھانا کھا جانا۔ ادھر اس حبشی سے کہہ دیا تھا کہ شام کو دو سائل آئیں گے ان کو کھانا کھلا دینا۔ قبل اس کے کہ وہ سائل پہنچیں ہم دونوں جا پہنچے اور پھر بھائی اشذری کی عربی دانی! حبشی نے اشذری سے جب پوچھا کہ "کیا تم وہی دونوں ہو جو بازار میں قاضی صاحب سے ملے تھے اور کھانے کو کہا تھا؟" اس کا جواب اشذری نے محض اس وجہ سے اثبات میں دیا تھا کہ حبشی کی گفتگو میں اگر وہ کوئی لفظ سمجھتے تھے تو وہ "طعام" کا تھا۔ جب دونوں سائل آئے اور انھوں نے حبشی سے کھانے کو کہا تو ایک طرف تو حبشی خفا کہ ہم دونوں نے اس کو دھوکا دیا اور دوسری طرف یہ سائل خفا کہ ہم دونوں کا کھانا یہ دونوں دھوکہ دیکر کھا گئے۔ خمیازہ اس غلط فہمی کا زیادہ تر خود بھائی اشذری نے بھگتا جو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا چکے تھے۔ کیونکہ جب دسترخوان

لگا اور اس پر بائیس قسم کے انواع و اقسام کے کھانے چُنے گئے تو میں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور بھائی بندری کو دیکھ رہا تھا کہ ان کی حالت قابل رحم تھی۔

(عصمت چغتائی)

پوٹاش پرمنگنیٹ حکیم سوزان مضبوطی اور استقلال سے اپنی تحقیقات پر یوں ڈٹا رہا جیسے پہرے کا سنتری جس تاریخ سے "لال دوا" والا تجربہ شروع کیا اب ذرا حساب تو کیجئے کہ اللہ کا بندہ روز لال دوا کا محلول پیتے پیتے سیر دن کیا بلکہ یوں سمجھئے کہ منوں پوٹاش پرمنگنیٹ نگل گیا۔ اب تو حضرت جب کبھی حکیم جی سے ملاقات ہوتی تو ان کو عجب حالت میں دیکھا۔ یقین جانئے کہ جس طرح پرانا بٹیر باز ہر وقت ایک نہ ایک بٹیر مٹھی میں دبائے ہلاتا پھرتا ہے بالکل اسی طرح سوزان بھی بند مٹھی میں دبائے منہ اور ناک سے پھونکا کرتے تھے۔ آپ جانتے ہیں اس دست شفا و کرم میں کیا ہوتا تھا! یعنی کبھی چند مکھیاں، کبھی کچھ مچھر، کبھی پسو، کبھی کھٹمل۔ یہی وہ حشرات تھے جن پر "دم عیسیٰ" نہیں بلکہ "دم عزرائیل" کا تجربہ ہوتا تھا۔ کئی دفعہ ہم سے مڈبھیڑ ہوئی اور کئی دفعہ ہم نے ٹوکا بھی کہ حکیم جی یہ کیا بجس حرکت ہے اماں بندے خدا کے جو کچھ کرتے ہو پورا کرو، اچھی طرح کرو۔ اماں کھلم کھلا پاگل ہو جاؤ۔ کپڑے پھاڑ جنگل کی راہ لو۔ حکیم ہمیشہ ہنس کر یہی جواب دیتے۔ آں حضرت آپ اس رمز کو کیا جانیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے میں ان جانوروں پر پھونک مار کر یہ دیکھتا ہوں کہ میرا تنفس ابھی مسموم ہوا یا نہیں۔ آپ جانئے کہ میرے پاس خوردبین تو ہے نہیں جو میں وبائی جراثیم پر اپنے سانس کا اثر دیکھا کروں۔ میں ان مرئی حشرات ہی پر تجربہ کر لیتا ہوں۔

حضرات اس حالت میں حکیم سوزان عجب کام کر گیا۔ لیجئے آپ کو مبارک ہو دس برس آہستہ آہستہ پوٹاش پرمنگنیٹ پیتے پیتے اب اتنی اہلیت ہو گئی۔ ایک پھنکار میں دس دس مکھیاں مرنے لگیں۔

(علامہ مضحک دہلوی)

جینے کا سلیقہ میں سمجھتا رہا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ایک محدود حلقہ میں ایک محدود زمانہ تک ایک محدود خدمت کے لئے پیدا کیا گیا۔ اس لئے اللہ نے مجھے اتنی ہی عقل، اتنا ہی حوصلہ اور اسی قسم کی شکل و صورت دی ہے کہ برابر اپنا کام چلاتا رہوں اور کسی ایسے چکر میں نہ پڑوں جو میرے بوتے نہ ہو۔ اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے دونوں کان پکڑ کے صبح شام جھنجھوڑ دیتی ہو تو میرے کان پر جوں تک نہ رینگے گی بشرطیکہ وہ شوہر میں ہی نہ ہوں اور خدا نہ کرے ایسا ہو بھی تو میں زیادہ سے زیادہ یہ کروں گا کہ کسی اچھے سرجن سے اپنے دونوں کان ترشوا کر ان نیک بخت کے حوالے کر دوں گا۔ اسی طرح کی زندگی بسر کرنے سے مجھے بڑا نفع ہوا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو میری جیسی معمولی استعداد رکھتے ہوں لہٰذا ان کو اتنی زیادہ نعمتیں میسر ہوتی ہوں گی جتنی کہ مجھے! اسئے کبھی کبھی سوچ میں پڑ جاتا ہوں کہ دنیا اب بھی کتنی معصوم اور سادہ ہے کہ میں اور مولوی دونوں ولادت اطفال اور سعادت دارین میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی سب سے بڑی نعمت جو مجھے نصیب ہوئی وہ یہ تھی کہ میں اس موذی مرض میں کبھی مبتلا نہ ہوا جسے جلنا کہتے ہیں۔

(رشید احمد صدیقی)

مشاعرہ علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگنیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب، وفاداری اگر اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگاتار بغیر دم لئے صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے کوئی گیارہ بجے ایک کتے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو انھوں نے باہر سڑک پر آ کر طرح کا ایک مصرع دے دیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتے نے مطلع عرض کر دیا۔ اب جناب ایک کہنہ مشق استاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چولھے میں سے باہر لپکے اور بھنا کے پوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمال مشرق کی طرف سے ایک قدرشناس کتے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے کم بخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ گرم ہوا کہ

ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے کئی دفعہ "آرڈر، آرڈر" پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سنتا۔ آپ سے کوئی پوچھے کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا۔ تو دریا کے کنارے کھلی ہوا میں جا کے طبع آزمائی کرتے۔ یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کون سی شرافت ہے۔

(پطرس بخاری)

بڑے آدمی بڑے آدمی رسالے خریدتے ہیں مگر پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ انھیں میز کے اوپر یا نیچے پھینکنے کے لئے۔ کتابیں خریدتے ہیں تصاویر دیکھنے کے لئے اور لائبریریاں بناتے ہیں نمائش کے لئے۔ ان کی ادبی واقفیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی کتاب سرورق سے آگے کھول کر نہیں دیکھی اور بیشتر کتب ان کی لائبریری میں ایسی بھی ملتی ہیں جن کے انھوں نے اوراق تک نہیں کاٹے۔ اب رہی ان کی آرٹ کی سرپرستی، جہاں تک شاعری، موسیقی، تصویر کشی یا سنگ تراشی کا تعلق ہے بڑے آدمی ان چاروں سے تقریباً کورے ہوتے ہیں۔ ہاں انھیں اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ اگرچہ وہ آرٹ کو نہیں سمجھتے لیکن وہ آرٹسٹوں کو جانتے ہیں انھیں بے شک یہ پتہ نہ ہو کہ مالکونس دن کے وقت گایا جاتا ہے یا رات کو مگر وہ بائی وحیدن یا مس زہرہ جان کو ضرور جانتے ہوں گے۔ وہ چاہے یہ نہ جانتے ہوں کہ کتھا کلی کس "ناچ" کا نام ہے مگر وہ اودے شنکر سے ضرور روشناس ہوں گے۔ کیونکہ پچھلی دفعہ جب بائی وحیدن اُن کے شہر میں آئی تھیں تو انھوں نے اُسے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ جس وقت اودے شنکر کا کسی تھیئٹر میں ناچ ہوا تھا تو وہ اگلی نشست پر بیٹھے تھے۔ تصویر کشی وہ اتنی سمجھتے ہیں کہ ہر وہ تصویر جس میں کوئی خوبصورت عورت مسکرا رہی ہے تصویر کہلانے کے قابل ہے۔ باقی سب بکواس۔

(کنھیا لال کپور)

فلمی شاعر فلمی شاعر، ادبی شاعر سے ذرا مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ادبی شاعر گیت کہتا ہے۔ فلمی شاعر گیت لکھتا ہے بلکہ اکثر گیت ٹھوکتا ہے جس طرح سے لوگ دیوار پر کیل ٹھوکتے ہیں۔ "ساعر بھائی! ایسا گیت ٹھوکو، ایسا گیت ٹھوکو کہ سالا لوگ "چل چل رے نوجوان" بھی بھول جائے۔ ادبی شاعر کہتا ہے۔ فلمی شاعر نثر لکھتا ہے جس کی سطریں میوزک ڈائرکٹر کی مرضی کے مطابق چھوٹی بڑی کر دی جاتی ہیں۔ شاعر نے گیت کی سطریں یوں لکھیں: "وہ پنگھٹ پر آئے" اب میوزک ڈائرکٹر نے گنگنانا شروع کیا "وہ پنگھٹ پہ آئے، وہ پنگھٹ پہ آئے۔ ہائے!" دیکھئے لفظ ہائے اس دھن میں کیا بیٹھتا ہے۔ ڈائرکٹر نے کہا تو لگا دو جی! ہائے اسکے ساتھ ہی ہوجا ساعر بھائی! اور شاعر بھائی نے دست بستہ عرض کیا "بجا ارشاد! تو پنگھٹ پہ آئے، ہائے ہائے اگر تین دفعہ آجائے تو لطف دوبالا کر دو نا جی دوبالا اس کو۔ ڈائرکٹر بولا شاعر بھائی اس کو جلدی سے میوزک ڈائرکٹر کے ما فق دھلد دوبالا بناؤ۔ اب گیت کی سطریں یوں ہو گئیں "وہ پنگھٹ پہ آئے، ہائے، ہائے، ہائے" میوزک ڈائرکٹر نے پھر گنگنانا شروع کر دیا "وہ پنگھٹ پہ آئے ہائے، ہائے، ہائے۔ ہارمونیم لے کے بیٹھے اور ڈائرکٹر سے اس دھن کے بارے میں پوچھا، کیسی رہے گی یہ دھن؟ ڈائرکٹر نے کہا۔ سالی جمتی نہیں۔ اس فلمی دنیا میں ڈائرکٹر کو کوئی جمتی نہیں۔ نہ پکچر، نہ ڈانس نہ گانا نہ مکالمے۔ سالا کچھ جمتا نہیں یہ گانا۔ اس میں دھم نہیں، نہیں جب تک پکچر ہاؤس میں پاؤں سے کھٹا کھٹ تال نہ دیں۔ یہ گانا بنڈل رہے گا۔ ایں سمجھے غلام صابر؟

ماسٹر غلام صابر نے پھر گنگنانا شروع کیا۔ —— وہ پن گھٹ

وہ پنگھن گھٹ

شاعر نے لقمہ دیا۔ وہ نٹ کھٹ

وہ نٹ کھٹ

ڈائرکٹر نے اصلاح دی وہ جھٹ پٹ

وہ جھٹ پٹ

وہ نٹ کھٹ، جھٹ پٹ، پن گھٹ پہ آئے۔

ہائے ہائے ہائے! شاعر نے اچھل کر کہا "ہو گیا، گیت ہو گیا۔ ڈائرکٹر نے شاعر کو گلے لگا کر کہا۔ ہاں ہو گیا، ہاں تو بڑا سالا شاعر ہے تو مہا کوی تلسی داس ہے مہا کوی کالی داس، مہا کوی مدھوک مہا کوی سا ہوا یا دھیائے۔ جنھوں نے چور بازار اور چنڈو باز کے گانے لکھے ہیں تو اُن سے بھی بڑھ کر ہے اور تو جوش اور مجاز کا بھی باپ ہے۔ وہ تیرے آگے کیا گانے لکھیں گے۔ لے یہ چونی اور بال پوری کھا لے بھار سے۔"

(کرشن چندر)

سارس اور لومڑی کی کہانی

قارئین کے مشورے

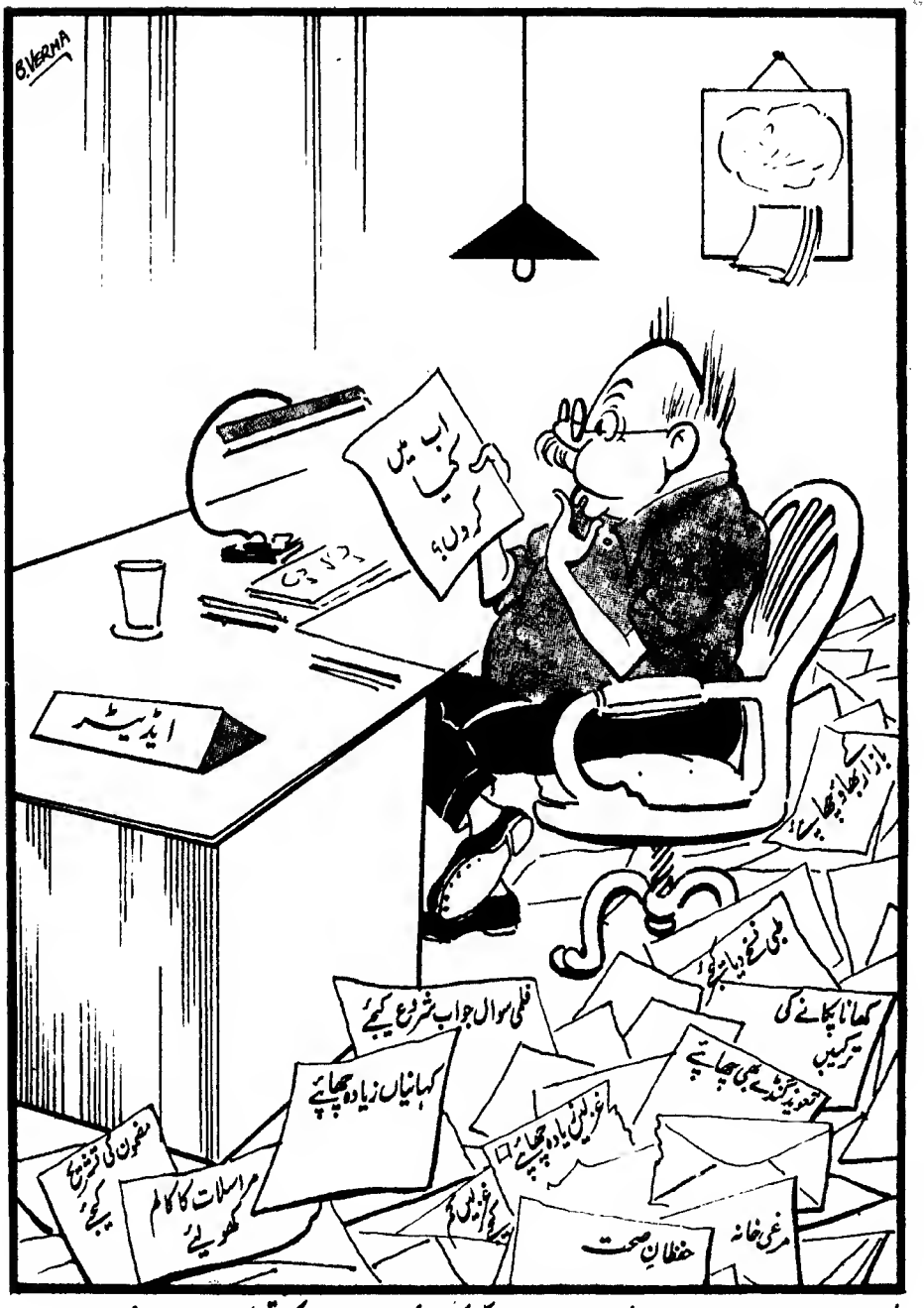

ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے قارئین سے مشورے طلب کئے کہ پرچے کی بہتری کے لئے کس قسم کی چیزیں دی جائیں۔

فراق کی رُباعیاں

فراق گورکھپوری

امریکہ پاکستان میں فوجی معاہدہ

پیدا جو ہوا ہو میں تیرے یہ فساد
ہل جائے گی جڑ سے زندگی کی بنیاد
لنگڑی ماریں گے دست گیری کر کے
لے ڈالے گی تجھے یہ فوجی امداد

لٹکے یہ ملوکیت کے اب بھی پہچان
ناداں یہ تپاکِ مرگ ہے بات تو مان
بیتاب ہے تو جس سے گلے ملنے کو
وہ خطرۂ ایشیا ہے اے پاکستان

امداد کے طوفان میں بہہ جاؤ گے
امداد کی بھونچال میں ڈھ جاؤ گے
دستِ شفقت سے پڑنے والی ہے، رکو
وہ مار کہ بلبلا کے رہ جاؤ گے

خود اپنے خلاف چال تو نے جو چلی
ہمسائے ممالک کو وہ کس درجہ کھلی
ڈوبیں گے تو یار کو بھی لے ڈوبیں گے
یہ بغضِ معاویہ ہے یا حُبِّ علیؑ

الزامِ مداخلت ابھی جاری ہے
ہر چال نئی بات ہر اک نیاری ہے
چور اُلٹے کو توال کو ڈانٹے خوب
کیا کیجیے سب سے کی بلہاری ہے

لیتے ہیں یہ چوم چاٹ کر خون نچوڑ
پھر بیٹھ کے اپنی ہڈیاں آپ چچوڑ
ایں نسبتِ امریکہ و پاکستان خوب
یہ شیر و شتر کا دیدنی ہے گٹھ جوڑ

بد حال ہے، ہو جانے کو ہے بد تر حال
ہو جاؤ گے تم نڈھال سے اور نڈھال
سب یانکیوں کے ہاتھ آ جائیں گے
صنعت، حرفت، زراعت و مال و منال

ہے اک پروانۂ غلامی امداد
خود اپنے کیے کی کیا ہو داد و فریاد
ہو جائے گا راج پاٹ یاراں کا
تیرے پلے پڑیں گے عرس و میلاد

کیا تو نے سُنی نہیں صدائے دلّی
کیا ہیں یہ طریقہ ہائے حفظِ ملّی
دُم تک وہ تڑپ جائیگی دھڑ کا کیا ذکر
چوہوں کی محافظ جو بنے گی بلّی

یارو ٹھینگا دکھا کے چھوڑیں گے تمہیں
گھر ہی میں دھتا بتا کے چھوڑیں گے تمہیں
حق کر کے خوانِ نعمتِ پاکستان
لیموں و نمک چٹا کے چھوڑیں گے تمہیں

سنگینوں سے گدگدا کے چھوڑ دینگے تمہیں
خاک و خوں میں ملا کے چھوڑ دینگے تمہیں
ان توپوں سے مناؤ اب جان کی خیر
جن کا ایندھن بنا کے چھوڑیں گے تمہیں

تا تا تھیہ سکھا کے چھوڑیں گے تمہیں
یہ انگلیوں پہ نچا کے چھوڑیں گے تمہیں
ہیں انکل سام[1] آج دنیا کے چچا
اس بار چچا بنا کے چھوڑیں گے تمہیں

اپنوں کو نہ چھوڑ کر کنارے ہو جاؤ
ایسا نہ کرو کہ بے سہارے ہو جاؤ
آزادیٔ قوم رہن کرنے والو
اس سے تو تم اللہ کو پیارے ہو جاؤ

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا

ان کا ہے رد س سے پرانا پردا
کرتے ہیں یہ چین سے بھی پورا پردا
گھونگٹ ہے برائے نام لوہیا جی کا
امریکہ سے کرتے ہیں یہ کانا پردا

ماضی کی پرستش

دامن ماضی سے ان کا اٹکا سو بار
کھایا ہٹ دھرمیوں کا جھٹکا سو بار
ماضی کے دوش پر گئے تھے پڑھنے
ماضی نے اٹھا اٹھا کے پٹکا سو بار

یہ نطق کے نو رباف ، مانے جانے
نیتا بھی ہیں روپ میں سترہ آنے
بھارت کا کفن بنتے ہیں پھر کے درست
ماضی کے یہ ٹوٹے ہوئے تانے بانے

ست جگ کی بات چھاننے بیٹھے ہیں
ڈھیلے تاروں کو تاننے بیٹھے ہیں
زربل اور بل سے ہو کر محروم
پر کھول کے گن بکھاننے بیٹھے ہیں

ماضی کی اہمیت کو سمجھاتے ہیں
کیا پھول حماقت کے وہ برساتے ہیں
درشن ہوئے جاتے ہیں ابھی بھگتوں کو
سوٹا لئے وہ راج رشی آتے ہیں

اس نظم کے بچنے کا نہیں کوئی اپائے
بیٹھے ہیں مگر چارہ گر اک آس لگائے
جیسے مرتے مریض کے سمبندھی
سوچیں کہ عجب کیا یہ کہیں بچ ہی جائے

اونچا سودا پٹا رہے ہیں بونے
پگلا رکھا ہے پانیوں کی رو نے
گھاٹے میں دے رہے ہیں مستقبل کو
اور حال کو بیچتے ہیں اونے پونے

⊙

---

[1] Uncle "SAM"

اے کراچی

☆ ــــــــــــــــــ سید محمد جعفری

اے کراچی کھٹمل اور مچھلی کے دیرینہ وطن — سب کو یہ دو نعمتیں ملتی ہیں تجھ سے تحفتاً
اور شہیدِ ناز ہو جاتے ہیں گلگوں پیرہن — کب تلک ہم سے تغافل کب تلک بیگانہ پن
سرد مہری اور گرمی کا تری کیا آسرا
سندھ صوبہ کی وزارت کی طرح موسم ترا

حسن تیرا دل فریب اور دل سے سب لاچار ہیں — اس لئے تصویرِ محشر کوچہ و بازار ہیں
گو مکانوں کی کمی سے سب زبوں و خوار ہیں — تیرے عاشق تجھ پہ مرنے کے لئے تیار ہیں
وہ نہ جائیں گے اگر بنیاد کو ڈھا دے قضا
تو ہی کچھ تدبیر بتلا کیا کریں "ہاشم رضا"

اولیں کوئی مکاں خالی نہیں آتا نظر — اور مکیں دو چار دن کے واسطے جائے اگر
چھوڑ جائے شومیٔ قسمت سے خالی اپنا گھر — سونگھتے پھرتے ہیں ہمسائے ادھر کوئی ادھر
بے تکلف گھر میں گھس جاتا ہے یہ کہہ کر ہجوم
"ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم"

پگڑیاں دے کر ترے دربار میں آتے ہیں لوگ — "ہاؤس بلڈنگ یونین" سے دل کو بہلاتے ہیں لوگ
ترے پہلو میں خیالی قلعے بنواتے ہیں لوگ — رات کو فرشِ زمیں پر تھک کے سو جاتے ہیں لوگ
گردِ غربت میں انھیں کوئی نشاں ملتا نہیں
مسجدیں کم ہیں خدا کو بھی مکاں ملتا نہیں

تیرے بازاروں کی رونق اور شہروں میں کہاں — حسن سے شرما کے بجھ جاتی ہیں اکثر بجلیاں
پر دلِ وحشی کو مل سکتی نہیں پھر بھی اماں — آ کے لٹ جاتا ہے بازاروں میں "بھولا پہلواں"
پھر نہ دنگل کام آتے ہیں نہ کوئی داؤ پیچ
ساری دنیا ہے مریضِ عشق کی آنکھوں میں ہیچ

زاہد و ملا کو یہ باتیں ہیں تیری ناپسند — راہ گذر میں شعلہ رُو دل کو بناتے ہیں سپند
ان کی صحت کے لئے یہ سب ہے بیشک سودمند — خاص کر راشن سے جب ملتی ہے شکر اور قند
ہیں نمایاں وہ سرِ رہ زور کی لاحول سے
ان کو بھی الفت ہے محبوبوں کے اس ماحول سے

شاہراہ

اے کراچی حسن کا تو نے لیا ان سے خراج   جو ترے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہیں با صد احتیاج
ان کے جسمِ ممدوح کے رخنے ہیں محتاجِ علاج   عاشقوں کا دل نہیں ہے کم تر "از سکھر براج"

شاعروں اور عاشقوں کی آہِ طوفانی سے ڈر
تو سرِ ساحل ہے بحرِ غم کی طغیانی سے ڈر

اور ہوں گے شہر جن میں اونٹ ہی بدنام ہے   اس زمیں پر "حضرتِ اُشتر" کا جلوہ عام ہے
اور ملکوں میں گدھا مجبور ہے ناکام ہے   ہر "خرِ عیسیٰ" یہاں پر واجب الاحترام ہے

قدرتِ حق دیکھنی ہو تو گدھا گاڑی کو دیکھ
اس پہ چڑھ کر جا کلفٹن اور کیماڑی کو دیکھ

ٹریم بھی چلتی ہے اور چلتی ہے اس میں بھیڑ بھاڑ   یوں نظر آتی ہیں جیسے جائے انسانوں کا جھاڑ
راستے میں اس کا کنڈکٹر سے ہوتا ہے بگاڑ   وہ مسافر اور ٹکٹ چیکر کی باہم چھیڑ چھاڑ

جیب کتروں کے لئے بھی عیشِ بے اندازہ ہے
خانۂ مجنوں نے صحرا گرد بے دروازہ ہے

تجھ میں گاندھی گارڈن اک سیرگاہِ عام ہے   طائرِ دل جس میں پھنس جائے یہاں وہ دام ہے
ہر نگاہِ فیصلہ کن موت کا پیغام ہے   لیک سکس بھی ہے اس میں مجلسِ اقوام ہے

بند ہیں پنجروں کے اندر ایسی اقوامِ کہن
مورثِ اعلیٰ جنھیں کہتے تھے مسٹر ڈاردن

ہیں ترے نقار خانے میں بہت سی بولیاں   اس میں چپ بیٹھی ہے تنہا طوطیِ شیریں بیاں
یعنی وہ اُردو جو ہجرت کر کے آئی تھی یہاں   جنگ آمادہ ہیں اس بیگم سے گھر کی باندیاں

اس کی قدر و منزلت سے دل ترا بیگانہ ہے
"گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے"

بس بھی چلتی ہے یہاں پر جیسے چلتی ہے ہوا   جی میں جب آیا چلیں اور جس طرف منہ اُٹھ گیا
ٹھہر جائیں راہ میں موسم جو دیکھیں جانفزا   دفعتاً چل کر رکیں اور رُک کے چلدیں بارہا

دور سے آئیں تو چل دیں ڈال کر ترچھی نظر
رہ گئے فٹ پاتھ پر عاشق کلیجہ تھام کر

اے کراچی اے عروسِ ساحل اے تاج البلاد   سینۂ صحرا پہ تو ہے جنتِ ذات العماد
قائدِ اعظم کو لے آئی یہاں بادِ مراد   مالکِ پاکستان کے مانند تو بھی زندہ باد

تو مری لیلیٰ ہے تجھ سے عشق مجنونانہ ہے
تیرے سینے میں نہاں اک گوہرِ یکدانہ ہے

سوچنے کی بات

(مستزاد)

شاد عارفی

رخنہ کارِ امنِ عالم جو بھی ہو بدذات ہے
لیکن اتنی بات ہے
چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے
سوچنے کی بات ہے

اُس طرف گلگوں شرابِ ناب کی برسات ہے
محوِ احسانات ہے
اِس طرف توپوں کے امریکن خدا کا ہات ہے
سوچنے کی بات ہے

اپنی من مانی پہ طاقت سے لیا جاتا ہے کام
فیصلے سب ناتمام
صاف یو۔این۔او کا دھندا اک سیاسی گھات ہے
سوچنے کی بات ہے

سیکڑوں من گندم بے دام پاکستان کو
مصر کو ایران کو
وہ عطیہ کہہ کے خوش ہولیں مگر خیرات ہے
سوچنے کی بات ہے

اب سمجھ میں آرہی ہے دشمنوں کی واہیات
کوئی فقرہ کوئی بات
کوبکو مشہور احمق جانور کی لات ہے
سوچنے کی بات ہے

اب نہ چمکا پاؤ گے ذہنوں میں جھوٹے آفتاب
ہے یہ سیدھا سا حساب
دن بتاؤ گے جسے تم ہم کہیں گے رات ہے
سوچنے کی بات ہے

مدرسوں میں پیٹتے پھرتے ہو شخصیت کے ڈھول
کیوں مچا رکھی ہے پول
شیخ صاحب آپ کی کیا ذات کیا اوقات ہے
سوچنے کی بات ہے

شادؔ ہجر و وصل تک محدود تھی فکر و نظر
اک زمانہ تھا مگر،
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے
سوچنے کی بات ہے

تاڑ مدظلہ

درمدح شاہِ شمشاد قداں فخر درختانِ جہاں عزت مآب تاڑ مدظلہ

نذیر بنارسی

رات کا گمبھیر سمراٹ اور دن کا منتری
میرے اچھے تاڑ میں تیری بلندی کے نثار
بالے پن سے تو کھڑا رہتا ہے اپنے پیر پر
تیرے رُخ پہ پڑتی ہے خورشید کی پہلی کرن
آسماں سے تو قریب اور آسماں تجھ سے قریب
تیرے پتّے پر گماں مجھ کو پرِ جبریل کا
نوجواں لاٹھی ہے بوڑھے آسماں کے واسطے
سنیاسی ہے کوئی جوگی ہے آخر کیا ہے تُو
صاحبِ دستارِ فطرت مالکِ تاجِ شہی
مست اپنے حال میں پگڑی میں دیوانہ ہے تُو
تُو ہی اُردو کا الف تو ہی مری ہندی کا آ
ظرف تیرا سارے کم ظرفوں کی خاطر پند ہے
تیری صہبا آتشی بھی اور سیمابی بھی ہے
جس کی ثابت ہے مسیحائی وہ عیسیٰ دم ہے تُو

یوں کھڑا ہے جیسے بھارت بینک کا اک سنتری
ہر شجر تیری رعایا تو ہے سب کا تاجدار
یہ حقیقت ہے کوئی طعنہ نہیں ہے غیر پر
تجھ پہ صدقے روز ہوتا ہے شجر کا بانکپن
ہے خدائے دو جہاں کا آستاں تجھ سے قریب
تیری لمبائی پہ دھوکا صورِ اسرافیل کا
تو ستونِ با محل قصرِ جہاں کے واسطے
جس قدر بے لاگ ہے اتنا ہی بے پروا ہے تُو
سر کی لیتے ہیں بلائیں ماہ بھی خورشید بھی
یہ نہیں کھُلتا کہ صوفی ہے کہ مولانا ہے تُو
کرشن[1] جی کا دستِ نازک پنت[2] جی کا فیل پا
تیرے ہر کوزے کے اندر ایک دریا بند ہے
یعنی دن کی آفتابی شب کی مہتابی بھی ہے
کتنے زخمی پھیپھڑوں کے واسطے مرہم ہے تُو

---

[1] مشہور افسانہ نگار کرشن چندر
[2] پنڈت گوبند بلبھ پنت جنھوں نے ہندی زبان کو ہاتھی کے پاؤں سے تشبیہ دی۔

زندگی کے بخشنے والے مسیحا السلام
السلام اے بیری بیری کے مداوا السلام

آنے والی آندھیوں کے اے گواہِ معتبر
ہر ہوائی حادثہ گاتا ہے تیرے ساز پر

اپنی اونچائی کا جھنڈا گاڑتا رہتا ہے تُو
اس بلندی سے بھی سب کو تاڑتا رہتا ہے تُو

تو اکیلا اور ٹکّر تیری ہر آندھی کے ساتھ
ہر بلا کا سامنا اور اتنی پامردی کے ساتھ

سامنا[1] توپوں کا تو نے توپ بن بن کر کیا
سر نہ ہو سکتا تھا جو میدان تو نے سر کیا

تو نے انگریزوں کو سر دے کر کیا تھا سرخرو
تو نے رکھ لی جنگ میں برطانیہ کی آبرو

مرد بھی مردِ جری مارے ہوئے میدان بھی
تو سپاہی بھی سپہ سالار بھی سلطان بھی

دادِ استقلال دیتا ہوں جو ہر لال کو
جس نے اپنایا ہے تیرے پائے استقلال کو

امن عالم کے ارادے سے لپٹ سکتے نہیں
آندھیو ہٹ جاؤ ان کے پاؤں ہٹ سکتے نہیں

[1] دوسری جنگِ عظیم پر ہندوستان کے مختلف شہروں میں تاڑ کے درخت کاٹ کر یوں نصب کر دیئے گئے تھے کہ حملہ آوروں کو ان پر توپ کا دھوکا ہو۔

غالبؔ کی غزل پر

(غالب)

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں لیکن
ہاتھ آویں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

(پیروڈی)

عشق چاہا جو لڑانا تو لڑائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

کوئی ٹھمری کوئی دھرپد کوئی ٹوڈی کا خیال
بات جب ہے انھیں کھڑکی میں بن آئے نہ بنے

مجھ کو لے ڈوبی یہ ایمان ایماں پسندی میری
پاس آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون وہ نرگس ہے ثریا کہ نگار
پردہ گہرا ہے کچھ اتنا کہ بتائے نہ بنے

عشق وہ تاج محل، لال قلعہ ہے پیارے
جو مٹائے نہ مٹے اور بنائے نہ بنے

(زبیر قریشی)

شامِ عمل

سلام مچھلی شہری

"——— اس مسئلے پہ بات کبھی پھر کریں گے ہم
آؤ چلیں کہ شام بڑی خوشگوار ہے!"

"——— سنجیدہ گفتگو میں نہیں لگ رہا ہے دل
مشکل تو یہ ہے ہم میں بڑا انتشار ہے
* * * میں کہہ رہا تھا فرق خیال و عمل میں ہے
جوشِ عمل ہو جس میں وہی حُسن کار ہے!"

"——— لیکن میں کہہ رہا ہوں فضائیں حسین ہیں
آؤ کریں گے چل کے کہیں اور ہم یہ بات!"

"——— اچھا اگر مُصر ہو تو آؤ کہیں چلیں
آخر گریز چاہتی ہے دُکھ بھری حیات
معلوم ہے مجھے کہ تمھاری نگاہ میں
ہے شام سے زیادہ حسیں میکدے کی رات!"

"——— وِسکی نے کر دیا ہے تمھیں سخت مضمحل
کیوں اب نہ دَور ہو ذرا دیسی شراب کا!"

"——— ہاں، اس شرابِ سادہ کی لذت لطیف ہے

جیسے کہ حُسن دوڑ گیا ہو گلاب کا
× × × پاتا ہوں موجِ بادہ میں عزم و عمل کی لہر
مرکز ہے میکدہ ہی نئے انقلاب کا!"

"——— آغازِ گفتگو بھی ابھی تک نہ ہو سکا
اس مسئلے کے بارے میں اب کیا خیال ہے؟"

——— بے موقع گفتگو کی یہ عادت عجیب ہے
کچھ اور میرے سامنے اس دم سوال ہے۔
ہاں، یہ ذرا بتاؤ کہ اس میکدے کے پاس
رقصندہ ان دنوں کوئی زہرہ جمال ہے؟

"——— اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن تمھارے دل کی عجب کیفیت ہے یہ!"

"——— گلیوں کے ماہ پاروں کی خدمت سے رُکنا
اے دوست! سخت "بورژوا" ذہنیت ہے یہ
موضوع زندگی کی وضاحت کے واسطے
اک دل نشیں کنایہ ہے، اک رمزیت ہے یہ!"

"تم کہہ رہے تھے فرق خیال و عمل میں ہے
اس مسئلے پہ اب تمہیں کہنا ہے کیا سلام!؟"

"——— اس کا جواب اب مرے فن کی اجل میں ہے
ہاں، اے رفیقِ خاص! ذرا اور ایک جام!!"

نیویارک جانے والے

(میرا سلام لے جا)

مجید لاہوری

(حفیظ جالندھری سے تصرف کے لئے معذرت کے ساتھ)

"ڈالر" کے آسماں پر سونے کے آستاں پر
پہنچا ترا غبارہ
"یونو"[1] میں حاضری کا تجھ کو ہوا اشارہ
اے بختیار بندے!
اے کامگار بندے!
تیری "سکوں پسندی" پستی کی ہر بلندی
تجھ کو پکارتی ہے
اب باریاب ہوجا
اے ذرۂ محبت عزت مآب ہوجا
دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رختِ سفر اٹھالے "گانجے" کا دم لگالے
نیویارک جانے والے! بس اک پیام لے جا
میرا سلام لے جا

پھیلی ہوئی یہ باہیں کشکول سی نگاہیں
ان کا خیال کرنا
اور "شارٹ ہینڈ" میں ہی کچھ عرض حال کرنا
وہ جانتے ہیں سب کچھ
پہچانتے ہیں سب کچھ
ناشاد آرزوئیں "نیفے" کی ساری جوئیں
بے تاب ہو رہی ہیں
تاہم خموش رہنا
"عینک" سے دیکھتا جا منہ سے مگر نہ کہنا
یہ "گولی مار"[2] میرا ہے "سورداس" تیرا
میلی سی اک رضائی ٹوٹی سی چارپائی
لے جا سکے تو بھائی یہ فیضِ عالم لے جا
میرا سلام لے جا

---

[1] "یو۔این۔او"۔ [2] کراچی کی ایک مہاجر بستی

ہر چیز کھو چکا ہوں "رفیوجی" ہو چکا ہوں
یہ زندگی ہے میری
اور "لالو کھیت"[1] میں اب اک جھونپڑی ہے میری
کچھ ارمغاں نہیں ہے جز "پاندان" نہیں ہے
بالکل فقیر خاں ہوں یعنی حقیر خاں ہوں
"سگرٹ" نہ مانگ مجھ سے نادم نہ کر خدا را
"بسکٹ" کا ایک ڈبہ دیدے مجھے ادھارا
میرا مکان کیا ہے
یہ "چو ہے دان" کیا ہے
یہ ارمغاں خوشی سے چاہے تو ہاں خوشی سے
اے مہرباں خوشی سے بھر کر گدام لے جا
میرا سلام لے جا
فریادِ ہاؤ ہو میں صہبائے آرزو میں
وہ جوش ہی نہیں ہے
ٹوٹا ہوا بھی ہے دل خاموش بھی نہیں ہے
سرشار کرنے والی
شے ہو چکی ہے خالی
میخانۂ یقیں سے اس کیفٹ "ڈالریں" سے
صہبائے "ایٹمیں" سے
پھر اس کو بھر کے لانا
پینے چلا ہے تو بھی اور مجھ کو بھی پلانا
ٹوٹا ہوا ہے بے شک
پھوٹا ہوا ہے بے شک
ہے عرض دست بستہ گو دُور کا ہے رستہ
اور جام بھی شکستہ لیکن یہ جام لے جا
میرا سلام لے جا
"اسکیم ریز" آنکھیں یہ "پلان خیز" آنکھیں
اب خشک ہو چکی ہیں
دریا کہاں سے لائیں قطرے کو رو چکی ہیں
ورنہ یہ آرزو تھی
مدّت سے جستجو تھی
"وہسکی" پلا کے دل کو "ریکٹ" بنا کے دل کو
نیویارک جانے والے
اس میں تجھے بٹھاؤں
اور "جنگ کوریا" کی منزل پہ لے کے جاؤں
"مٹّی کے شیر" اچھا
ہوتی ہے دیر اچھا
جا ہر طرح سلامت لے جا مری "بصیرت"
لے جا مری "بصارت" میرا سلام لے جا
میرا سلام لے جا

[1] کراچی کی مہاجر بستی

مسدّسِ حال

افضل پرویز

چھوٹا جو اقتدار کوئی پوچھتا نہیں — اُن کو وفا شعار کوئی پوچھتا نہیں
آج ان کا حالِ زار کوئی پوچھتا نہیں — رہتے ہیں بے قرار کوئی پوچھتا نہیں
جاتے ہیں بے مہار کوئی پوچھتا نہیں
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

یارانِ ہم جلیس و وفادار کیا ہوئے — جو تھے نثار ہونے کو تیار کیا ہوئے
وہ ہر گھڑی کے حاشیہ بردار کیا ہوئے — جلسے جلوس مسند و دربار کیا ہوئے
جاتا ہے جب وقار کوئی پوچھتا نہیں
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

اُس وقت لوگ آنکھیں بچھاتے تھے راہ میں — اپنے دلوں کے داغ جلاتے تھے راہ میں
پامال آرزوئیں سجاتے تھے راہ میں — نعروں کے زمزمے بھی لٹاتے تھے راہ میں
اب پھول ہیں نہ ہار کوئی پوچھتا نہیں
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

وجہِ نمود و نام تو کرسی تھی وہ نہ تھے — معبودِ خاص و عام تو کرسی تھی وہ نہ تھے
ان گوپیوں میں شیام تو کرسی تھی وہ نہ تھے — اور رہبرِ عوام تو کرسی تھی وہ نہ تھے
کرسی چھنی تو یار کوئی پوچھتا نہیں
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

انتخابی تقریر

افضل پرویز

ایک میراثن کسی گاؤں میں رہتی تھی کبھی
اس کی بذلہ سنجیوں پر ناز کرتے تھے سبھی

ایک وقت آیا کہ اس کی جگ ہنسائی ہوگئی
اور قصبے ہی کے لوگوں سے لڑائی ہوگئی
اس کی کرتوتوں سے جب تنگ آگئے بستی کے لوگ
تنگ آکر برسرِ جنگ آگئے بستی کے لوگ

گاؤں کے چوپال میں آئی وہ جھنّائی ہوئی
غیض میں بھری ہوئی غصے میں جھلّائی ہوئی
اپنی کل پونجی بس اک مرغا اور اک بچی لئے
رنج کی تلخی سمیٹے طیش کی گرمی لئے
گفتگو کی رو میں لاوے کیطرح بہنے لگی
سارے لوگوں کو اکٹھا کر کے وہ کہنے لگی

"موذی کاٹو۔ بے حیاؤ۔ باغیو۔ بد باطنو!
گاؤں کے غدارو۔ بھڑوؤ۔ بدقماشو۔ ظالمو
تم کہ اپنی محسنہ کی آبرو پر حرف لائے
غرق ہو جاؤ۔ تمہاری آبرو پر حرف آئے
مجھ پہ تہمت دھرنے والوں کو خدا غارت کرے
میری غیبت کرنے والوں کو خدا غارت کرے
مجھ نگوڑی کو ستانے والو پچھتاؤ گے تم،
اور بُرے اعمال کے بدلے سزا پاؤگے تم
اپنے اکلوتے حسیں مرغے کو لے جاؤنگی میں
جاتے جاتے گاؤں کو اک داغ دے جاؤنگی میں
اس بھرے سے میں تمھیں محروم ہی کر جاؤں گی
اور سحر سے میں تمھیں محروم ہی کر جاؤں گی
کون آشا کے سروں میں ککڑوکوں اُوں گائیگا
دیکھ لوں گی میں کہ پھر کیوں کر سویرا آئے گا
کوچ کرتا ہے خوشی کا قافلہ۔ اب روک لو
اُٹھو آؤ۔ منتیں کر کے مجھے سب روک لو
جاگنا ہے جاگ لو افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتے رہو گے خاک کے سائے تلے

مرا سحر کا راگ

عرش و فرش

سید ضمیر جعفری

ایفا نہ سہی وعدہ ہی سہی، وہ دل تو ذرا پرچا جائے
جیسے نلکا پانی کے لئے کھولو تو وہ ٹھہری گا جائے

اس تیزی و مشتاقی سے قدم اُٹھتے ہیں درِ جاناں کیطرف
جیسے کسی تانگے کا گھوڑا اڈے کی طرف دوڑا جائے

اللہ رے اُن کے طرزِ تکلم کی محاط پریشانی
جیسے کوئی شاعر گھبرا کر مصرعے کو ردیف سے کھا جائے

اب نامِ محبت پر یوں اُن کی وحشت دل بڑھ جاتی ہے
جیسے کسی قوالی میں کوئی اک لفظ ہی جان کو آ جائے

یہ فطرتِ حسن کہ صبح ازل سے شام ابد تک راز رہی
جیسے کسی افسر کا لکھا، سمجھا جائے نہ پڑھا جائے

دامانِ خیالِ یار بھی اب یوں ہاتھ سے نکلا جائے ہے
جیسے کسی بیوہ بڑھیا کی بکری رسی تڑوا جائے

روداد محبت کیا کہئے، سب بھول گئے، کچھ یاد نہیں
جیسے کسی کالج میں لڑکا جیسا آئے ویسا جائے

اظہارِ غمِ دل پر اب تو خود مجھ کو ندامت ہوتی ہے
جیسے لیڈر تقریر کرے اور جلسہ ہی شرما جائے

اس طرح ضمیر خیالوں میں اُمید چمکتی رہتی ہے
جیسے کسی سلّے کا برقعہ اٹھتا جائے، گرتا جائے

ادب برائے فحاشی

قیصر زیدی

محترم فکر صاحب!

میں نہ طنز نگار ہوں نہ مزاح نگار۔ ادب سے ایک ایسا تعلق ہے جو عملی کم ہے اور جذباتی زیادہ۔ آپ میری نظم شاہراہ کے طنز و مزاح نمبر میں شائع کر رہے ہیں۔ یہ بھی ایک طنز ہے اور مزاح نہ ہوتے ہوئے بھی مضحکہ انگیز ضرور ہے کہ قارئینِ شاہراہ میری ادبی زندگی کے ایک ایسے رُخ سے مجھے پہچانیں جو ادب کے چہرے کو مسخ ہوتے ہوئے دیکھ کر انتہائی کرب بنکر میری زندگی میں آیا۔ نظم کی تاریخ مجملاً یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء کے قریب کہی تھی یہ سنہ ۱۹۴۳ء میں "ادبی دنیا" میں مولانا صلاح الدین صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ اُن سے جا کر ملا۔ اور پیشانی پر بل دیکھ کر لوٹ آیا۔ مکتبہ اُردو میں حضرت محمود جالندھری اور دوسرے دوستوں کی موجودگی میں پڑھ کر دوستوں کو بیگانہ بنایا۔ بہرحال نظم حاضر ہے۔

قیصر زیدی

اس گذرتے ہوئے ٹھیلے کے تعفن کی قسم
جس نے شامہ کو مرے اس طرح مجروح کیا
عنبر و عطر کی جیسے کہ حقیقت ہی نہ ہو
یہ ہوں عنواں کسی موہوم سے افسانے کے
جنس کی بھوک سے بیتاب ہیں افسانہ نگار
پاک بینی کی حقیقت کو دھواں کیا جانے؟
جس میں بہنوں کا تحفظ ہے نہ ماؤں کا وقار
جشنِ نوروز ہے بدلے ہیں سعادت کے نشاں
اس میں شہوانی تصور کی کوئی حد ہی نہیں
اس کے پُر زور تقاضے ہیں کہ گلشن کو نہ دیکھ
رنگ و بو پھول کے بے کیف ہیں دھوکا ہے بہار
ان سے آسودگیٔ جنس تو ممکن ہی نہیں
تشنگیٔ جنس کی کب پھول بجھا سکتے ہیں؟!
رکھ مسافر کی کھسکتی ہوئی دھوتی پہ نظر
عفت و عصمت و تطہیر کے فرسودہ خیال
زندگانی کی تگ و دو میں بہت حارج ہیں
ان لحافوں پہ نظر ڈال کے دیکھ
فرخ آباد کی صنعت کے طلسمِ رنگیں
چشمِ بینا کے لئے اب یہ حجابات نہیں
ان کی کلیوں کی چٹکتی ہوئی آوازیں سُن
جن پہ زیر و بم صد نغمہ و آہنگ نثار
ساقِ سیمیں کے تصور کے سہاروں سے گذر
عسکری ذوق میں پیلن کے اشاروں کو سمجھ
ارتقائے ادبی اس طرح ممکن ہی نہیں
زندگی جب کہ جہنم ہو تصور فردوس
اس گذرتے ہوئے ٹھیلے کی عفونت پہ نہ جا
یہ تنفر ہے کہن سال اسے چھوڑ بھی دے
ورنہ یہ زندہ حقیقت ہی نہ جانی اب تک
زندگی کے لئے بنیاد ہے فضلے کا وجود
طشتِ زریں میں لئے پیش کئے جا اس کو
حاصلِ زیست سے دامانِ نظر بھرنے دے

گداگر

تاجور سامری

سبھا میں فنکار "فن" کی دولت لٹا رہے ہیں
گرج گرج کر کمال اپنا دکھا رہے ہیں
(نہ پوچھئے سننے والے کیا سٹپٹا رہے ہیں)

خلوص کی روح اگرچہ فن میں ذرا نہیں ہے
خود اپنا دل کیف و وجد میں جھومتا نہیں ہے
(سنانے پر زور ہے اثر کانپتا نہیں ہے)

رہا ہے ان کا تعلق اتنا ہی زندگی سے
بچائے رکھا ہے دل کو چوٹ آنکھ کو نمی سے
(مگر یہ غرہ کہ فن ہے معمور روشنی سے)

یہ نعرہ لب پہ کہ خدمتِ آدمی کریں گے
نوائے پُر نور جادۂ زندگی کریں گے
(مگر حقیقت میں! دل میں جو ہے وہی کریں گے)

یہ حال دل کا ہے اس میں کچھ غم جو ہے تو ذاتی
تڑپ اگر کوئی ہے تو ہے نام کی بقا کی
(نظر کوئی بھی نہ آئے اپنے سوا کوئی بھی)

بھری سبھا میں کوئی بھی چہرہ نہیں ہے ایسا
نشاں نظر پا سکے کہیں جس پہ محویت کا
(جو سنتے ہیں لوگ تو ہے اخلاق کا تقاضا)

ادھر یہ ضد آج فن کے جوہر دکھا کے دم لیں
کمال کی دھاک اس سبھا پر بٹھا کے دم لیں
(یہی ہیں فنکار آدمی کہلوا کے دم لیں)

بھری سبھا میں کمالِ فن کے تو دیکھو ریلے
کہ ڈنڑا کہیں جس طرح اکھاڑے میں کوئی پہلے
(نہ لطف ہی بات میں نہ جذبہ ہی رُخ پہ کھیلے)

سبھا کے لوگو! تمہیں ذرا اپنا فرض سمجھو!
بھلے ہی یہ دھن یہ گیت بھاتے نہیں ہیں تم کو
(بچاروں کا حق ہے داد۔ تم بھیک ہی میں دیدو)

اسی تمنا میں یہ بچارے جیا کئے ہیں
تمہارا جینا بھی خوب دُوبھر کیا کئے ہیں
(فریب خود کو نہ جانے کیا کیا دیا کئے ہیں)

نوکری کا کانسٹی ٹیوشن

مرزا عصمت اللہ بیگ عصمت دہلوی

کرتا ہوں نصیحت تمھیں اے یار ہمیشہ — تنخواہ سے بس رکھو سروکار ہمیشہ
دروازے پہ حاکم کے لگاتے رہو چکّر — گردش میں رہو صورتِ پرکار ہمیشہ
بھیگی ہوئی بلّی کی طرح سمٹے رہو تم — ہر بات پہ کہتے رہو سرکار ہمیشہ
دو گالیاں دل میں بھی مگر منہ سے نہ بولو — سنتے رہو حکام کی دھتکار ہمیشہ
لینا ہو جو رخصت تو کرو عذرِ علالت — اپنے کو بنائے رکھو بیمار ہمیشہ
رکھے رہو پھیلائے ہوئے میز پہ کاغذ — مسلوں کا رہے سامنے انبار ہمیشہ
ہر کام میں انگلش کو مقدّم رکھو لیکن — ہندی کا بھی کرتے رہو پرچار ہمیشہ
دفتر میں کبھی اہلِ غرض سے نہ ملو تم — کرتے رہو ہوٹل میں یہ بیوپار ہمیشہ
تحفہ کوئی دیدے تو اسے چپکے سے لے لو — ہاں نقدی سے کرتے رہو انکار ہمیشہ
جس چیز کو لینا ہے تو "لا" ہی کہو منہ سے — انکار کے پہلو میں ہو اقرار ہمیشہ
حکّام کو ہر طرح سے دیتے رہو تحفے — ڈھونڈا کرو ہر قسم کے تہوار ہمیشہ

جو کوئی بھی عصمت کی نصیحت پہ چلے گا
خود بھی رہے خوش، خوش رہے سرکار ہمیشہ

افلاس

اظہار ملیح آبادی

اے مرے نورِ نظر، اے مرے پیارے افلاس　　اے مری جان مرے دل کے سہارے افلاس
تجھ پہ قُرباں یہ مہ و خور یہ ستارے افلاس　　یہ بہاریں یہ بہاروں کے نظارے افلاس
خوش نصیبی سے مرا ہمدم و ہمراز ہے تو
جس پہ قربان ہر انجام وہ آغاز ہے تو

دلِ صد چاک نے پائی ہے جراحت تجھ سے　　بزمِ ادراک میں ہے جلوۂ حکمت تجھ سے
دُھل گیا غازۂ معیارِ شرافت تجھ سے　　کُھل گئی آدم و حوّا کی حقیقت تجھ سے
تو نہ ہوتا تو یہ اسرار نہ کُھلنے پاتے
عقل و حکمت کے یہ بازار نہ کُھلنے پاتے

میں نے ہر خار کو مثلِ گُلِ تر دیکھا ہے　　میں نے ذرّوں میں پہاڑوں کا جگر دیکھا ہے
میں نے ظلمت میں تماشائے سحر دیکھا ہے　　میں نے ہر شے پہ محبّت کا اثر دیکھا ہے
دل یہ کہتا تھا محبّت کے سوا کچھ بھی نہیں
اب کھُلا یہ کہ تجارت کے سوا کچھ بھی نہیں

ہاں وہ احباب جو تھے مائلِ صد لطف و کرم　　سرِ افلاک پہ تھے جن کی مروّت کے عَلم
بے طلب بخش دیا کرتے تھے جو ساغرِ جم　　جن کی نفرت بھی محبّت تھی، محبّت کی قسم
تیری دستک جو سُنی بن کے کٹاری نکلے
تو نے پردہ جو ہٹایا تو مداری نکلے

عطر کی طرح مہکتے ہوئے آتے تھے پیام — جن کے ہر لفظ کے ہاتھوں میں تھا سازِ الہام
زلفِ شب رنگ کے آنچل میں مچلتی ہوئی شام — لبِ نازک کی خموشی میں محبّت کے سلام

تجھ کو دیکھا تو ہر اک جلوہ نظر بند ہوا
تیرے آتے ہی ہر اک روزنِ در بند ہوا

لبِ فرہاد پہ تھا میرا فسانہ کل تک — بلبلیں گاتی تھیں میرا ہی ترانہ کل تک
یہ مہ و نجم بھی تھے میرا نشانہ کل تک — لوگ کہتے تھے مجھے عاقل و دانا کل تک

کوئی بھی سمجھا نہ دنیا میں کہ احمق ہوں میں
تو نے بتلایا مجھے جاہلِ مطلق ہوں میں

کل جو مانگے ہوئے لعل و گہر دیتے تھے — سنگ ریزوں کے عوض شمس و قمر دیتے تھے
وہ فرشتے جو کبھی ساغرِ زر دیتے تھے — اور سر دینے کا موقع ہو تو سر دیتے تھے

اب وہ ملتے ہیں تو چپکے سے نکل جاتے ہیں
تیری ہیبت سے فرشتے بھی بدل جاتے ہیں

اب نہ کچھ ساس کو مطلب نہ سسر کو ہے خیال — اب تو بیوی کی محبّت بھی ہے مائل بہ زوال
تھی ہر ایک بات مری، پہلے ذہانت کا کمال — اب تو ہر بات میں "نی" دیتا ہے ہر شخص نکال

تو نہ آتا تو یگانوں کو پرکھتے کیسے
جو کہ ممنوع تھے وہ ذائقے چکھتے کیسے

تیرا بندہ ہوں میں اے کاشفِ اسرارِ نہاں — تو نہ آتا تو سدا رہتا میں پامالِ زیاں
خار کو پھول سمجھتا تو ستم کو احساں — شکریہ اے مرے ہمراز مرے ہمدمِ جاں

وہ ہیں بدبخت جنھیں تو نے تباہی بخشی
تیری نظروں نے مجھے ژرف نگاہی بخشی

عاشق کی فریاد

پریم وار برٹنی

اجنبی شہر میں گھستے ہوئے جوتوں کی قسم
میں کئی بار تیرے گاؤں سے ہو آیا ہوں!
میں وہ مجنوں ہوں جو صحرا میں نہیں جا سکتا
میں فقط ڈھونڈتا ہوں تجھ کو گلی کوچوں میں
اور گاتا ہوں میں فلموں کے پرانے گانے
کوٹ ہاں کوٹ تو پہنا ہے کہ سردی نہ لگے
بھوکا رہتا ہوں میں ہر روز تری فرقت میں
چاندنی چوک کے بازار میں جا کر لیکن!
میری محبوب کہیں ملتا نہیں تیرا سراغ!

تیری فرقت میں دھڑکتا ہے مری یاد کا دل
چاندنی چوک کے ٹوٹے ہوئے گھنٹے کی طرح
پھیلتے جاتے ہیں ہر سمت بھیانک سائے
تو اگر آئے تو پھر چاند نکل سکتا ہے
سوچتا ہوں کہ کسی رات ترے آنے پر
بیٹھ کر کار میں 'پکنک' کے لئے جائیں گے
اور پھر بیٹھ کے جمنا کے کنارے دونوں
چاندنی رات میں ہم مونگ پھلی کھائیں گے

•

آرٹ کا اثر

اک سیٹھ بڑی توند کے کچھ کچھ مغرور
صورت کے سیہ فام غضب کے لنگور

کل دیکھ کے 'برسات' کمل تھیٹر میں
جس وقت ٹہلتے ہوئے گھر پہنچے حضور

فرمانے لگے بیوی سے ایکٹنگ کر کے
تو ہے مری نرگس میں ترا راج کپور

•

ملاحظہ ہو

(علامہ اقبال کی غزل پر ایک مزاحیہ تضمین)

فرقت کاکوروی

بڑی دیر کی تو نے جانے میں قاصد
تو شامل تھا ان کو نہ لانے میں قاصد
بتا فائدہ کیا چھپانے میں قاصد
تھا کیا کیا وہاں ان کے کھانے میں قاصد
"تامل تو تھا اُن کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی"

زمانے نے موسیٰ کو اس طرح ہونسا
کلیمی کا رس لن ترانی نے چونسا
اُدھر طور جب ہو گیا جل کے بھونسا
تو دنیا نے الزام یہ اُن پہ ٹھونسا
"کھنچے خود بخود جانب طورِ موسیٰ
کشش تیری اے شوقِ دیدار کیا تھی"

منایا گیا یوم ہر سال تیرا
مگر کوئی سمجھا نہ احوال تیرا
تھرکتا رہا لاکھ قوال تیرا
رقم تو نہ نکلی رہا کال تیرا
"کہیں رہتا ہے اقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی"

چھلاوہ تھی آندھی تھی گفتار کیا تھی
تری گفتگو ندی اس پار کیا تھی
مزا ہی مزا تھا مزے دار کیا تھی
بتائے تو وہ، وجہ انکار کیا تھی
"نہ آتے اگر اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی"

مقدّر کی گردش نے یوں زہر گھولا
پیامی تمہارا ہوا اتنا بھولا
کہ جب پاسباں نے اُسے کچھ ٹٹولا
وہ کھسیا گیا اور منہ سے نہ بولا
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی"

شکاری جو تھا تو فقط باوفا کا
کسی سے نہ اُلجھا کسی کو نہ مارا
کسی سمت بھی تو نے تاکا نہ جھانکا
رقیبوں میں تو نے کسی کو نہ تاکا
"بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا
تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی"

بڑا اندھیرا ہے

قتیل شفائی پوری

چراغِ حسن جلاؤ بڑا اندھیرا ہے
نقاب پھینک کے آؤ بڑا اندھیرا ہے

نہ چاند ہے نہ ستارے کہ ابر چھایا ہے
ذرا نظر ہی ملاؤ بڑا اندھیرا ہے

یہ راہ جاتی تو ہے اُن کے آستانے تک
مگر نہ جاؤ، نہ جاؤ بڑا اندھیرا ہے

اساتذہ نے کہا ہے شرار ہیں آنسو
گراؤ خوب گراؤ بڑا اندھیرا ہے

سُلگ رہا ہے مگر دل لپٹ نہیں دیتا
تمھیں کچھ ہاتھ بٹاؤ بڑا اندھیرا ہے

گزارنی ہے بہر طور یہ شبِ تاریک
ہمارا دل ہی جلاؤ بڑا اندھیرا ہے

ارے دیکھ اماں دیکھ

(شاعرِ انقلاب سے معذرت کے ساتھ)

نیاز حیدر

ہاں دیکھ ہر اک شخص ہے بکواس کناں دیکھ
بدھو پہ بھی بقراط کا ہوتا ہے گماں دیکھ
میخانے پہ چھا جاتا ہے بیڑی کا دھواں دیکھ
للہ ذرا مفلسیٔ بادہ کشاں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

پی لیتے ہیں بل دے نہیں سکتے یہ شرابی
شیشے میں اسی غم سے ہوئی زرد گلابی
گھیرے ہے خرابات کو پھر خانہ خرابی
اک بار کنکھیوں سے سوئے تشنہ لباں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

کُلہڑ کو مرے ساغرِ جمشید بنا دے
اک گھونٹ میں نظارۂ خرطوم دکھا دے
یعنی کہ سفر خرچ کی زحمت سے بچا دے
ہے وقت گراں وقت گراں وقت گراں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

میدانِ ادب میں ہوں ادب کاروں کا رہبر
ہے میرا قلم اپنے زمانے کا سکندر
وہ ماہرِ سازش ہوں جسے کہتے ہیں لیڈر

شاہراہ

ہوتا نہیں لوگوں کو ذرا مجھ پہ گماں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

چھلتی ہے مری فلم کے لوگوں سے بھی گہری
ہوتی ہی چلی جاتی ہے اب فکر سنہری
ہر پیڑ پہ چاندی کے مرے دل کی گلہری
چاندی کے درختوں پہ نہ آجائے خزاں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

جنگل میں رہا کرتے ہیں دو چار ایڈیٹر
رہتا ہے سر اکثر مرا ناشر کے قدم پر
ہے میری جبیں آج بھی نا واقفِ ٹھوکر
ٹھکرا نہ کہیں دے مجھے بیدار جہاں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

ہر ایک سخنور کا ہوں نقّال ازل سے
اقبالؔ و نذیرؔ و دا کے اڑا لیتا ہوں چربے
مَے تیری بتا ملتی ہے کس چیز کے بدلے
حاضر ہوں بہ چشم و بسر و گوش و زباں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

خرطوم کا حج کرنے کی توفیق عطا کر
لے جاؤں گا دیوان وہاں سر پہ اُٹھا کر
جو بیچوں گا میں خوشہ گندم کو دکھا کر
بس چھپتے ہی بک جائیگا دیوان وہاں دیکھ
اے پیرِ مغاں پیرِ مغاں دیکھ
ارے دیکھ اماں دیکھ

آئی لو اُردو

اشک امرتسری

بوائے بوائے! یس سر، یس سر!
وہسکی، برانڈی سوڈا واٹر ٹوسٹ، پوٹیٹو اینڈ ٹماٹر
ہری اپ، جلدی بیرا، بٹلر
بوائے بوائے! یس سر، یس سر!
اُردو کا ہوں شاعر بوائے آئی ایم ٹوٹنگ ٹوانجوائے
اُردو کانفرنس آف کلچر
بوائے بوائے! یس سر یس سر!
میں ہوں دُنیا میں لاثانی فیمس شاعر ہندوستانی
یعنی فادر آف لٹریچر
بوائے بوائے! یس سر یس سر!
دنیا جانے، بٹ نیور یو آئی لو اُردو، آئی لو اُردو
اُردو یولی سوئٹ اینڈ بیوٹر
بوائے بوائے، یس سر یس سر!
بوائے ہم پر موڈ ہے طاری کانفرنس کی ہے تیاری
ہیو یو گوٹ اے پیس آف پیپر
بوائے بوائے، یس سر یس سر
دنڈرفل اعجاز منی ہے فور ٹونٹی سے جو بنی ہے
علم اور فن سب نوکر چاکر
بوائے بوائے، یس سر یس سر
سوری! بوتل ہو گئی خالی ناؤ وانٹ کے چائے کی پیالی
پاکٹ پائیلس، ایمٹی ساغر
بوائے بوائے، یس سر یس سر!

بانگِ درا

سرشار صدیقی

(اس عذر کے ساتھ کہ ہر جسارت گستاخی نہیں ہوتی)

دہریت کے یہ پرستار ہیں، یہ کیا جانیں؟
جسم کے ساتھ تو روحیں بھی ہیں ان کی بیمار

ان کو رُوحانی غذاؤں سے سروکار ہی کیا؟
ان کی تسکین کا تو لے دے کے ہے روٹی پہ مدار

فقر و فاقہ سے قناعت کی حدیں ملتی ہیں
سرحدِ قحط کے بعد آتا ہے ایماں کا دیار

مضمحل ہوتا ہے جب بھوک کی شدت سے بدن
اور بھی ہوتا ہے محکم ملکوتی پندار

شکر، صد شکر، کہ اعصاب پہ عورت کے بجائے
آج بیماری و افلاس و مصائب ہیں سوار

رُوحِ اقبالؔ کو مژدہ کہ وطن میں اُن کے
جسم خوابیدہ ہوئے جاتے ہیں روحیں بیدار

کافی ہاؤس

حمایت علی شاعر

ہر اک عظیم یہاں پر، ہر ایک دانشور
یہاں پہ اے دلِ ناداں کہاں ہے تیری گذر

یہ وہ مقام ہے جس جا عوام کے فنکار
غمِ عوام میں دن رات ایک کرتے ہیں
یہیں پہ آتے ہیں زیرِ وجود وہ شہکار
کہ جن کے حُسن پہ ہم دلفگار مرتے ہیں
یہ پیالیاں ہیں کہ جامِ جہاں نما مت پوچھ
انھیں کی تہ سے یہ ارض و سما اُبھرتے ہیں
جو ایک گھونٹ اُترتا ہے حلق سے نیچے
تو ذہن عرش کے اسرار فاش کرتے ہیں
یہ سگرٹوں کے دھوئیں، حلقہ ہائے دامِ خیال
یہ ایک کش ہیں کہاں سے کہاں گذرتے ہیں
وہ کوریا ہو کہ کشمیر ہو کہ زلفِ حبیب
تمام گیسوئے برہم یہیں سنورتے ہیں
جو یاد آتے ہیں اک دم عوام کے دکھ درد
تو جبرئیل کے مانند شعر اُترتے ہیں

عوام۔ آہ عوام۔ اُف عوام ہیں برباد
غلط غلط یہ نظام۔ انقلاب زندہ باد
یہاں پہ اے دلِ ناداں کہاں ہے تیری گذر
ہر اک عظیم یہاں پر، ہر ایک دانشور

کہ اکبرؔ نام لیتا ہے

......اکبر الہ آبادی کے منتخب اشعار

شیعہ سُنّی کا شغل تھا پہلے　　پھر مسلمان ہو گیا بندہ
پھر رہا چند دن فقط انساں　　اور بالفعل صرف نیٹو ہوں

داخل مری دانست میں یہ کام ہے بن میں　　پہنچائے گا قوت شجر ملک کے بن میں
تحریکِ سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبرؔ　　کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کی دھن میں

شیخ صاحب کا تعصب ہے جو فرماتے ہیں　　اونٹ موجود ہے پھر ریل پہ کیوں چڑھتے ہو
یہ سوال ان کا ہے البتہ بہت با معنی　　کہ سمجھ بوجھ کے قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو

مرے شکووں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم　　کوئی یہ شیخ سے کہہ دے کہ سنئے قبلۂ عالم
جدھر صاحب ادھر دولت، جدھر دولت ادھر چندہ　　جدھر چندہ ادھر آنر جدھر آنر ادھر بندہ

بے گزٹ ہو کے جو رہئے تو محلے میں حقیر　　با گزٹ ہو کے جو چلئے تو فرشتوں میں خفیف
کیسے چکر میں بزرگوں کو پھنسا رکھا ہے　　حضرت پیر فلک بھی ہیں عجب ذات شریف

پردہ کا کیا ہے خود اڈھنگا پیدا　　خود ہم نے کیا ازار والگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے　　فطرت نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں　　اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرار النفیس نہیں　　پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

انجن آیا نکل گیا زن سے　　سن لیا نام آگ پانی کا
علم پورا اگر سکھائیں ہمیں　　تب کریں شکر مہربانی کا

پانی پینا بُرا ہے پائپ کا　　حرف پڑھنا بُرا ہے ٹائپ کا
پیٹ جلتا ہے آنکھ آئی ہے　　شاہ ایڈورڈ کی دہائی کا

عشرتِ گھر کی محبت کا مزا بھول گئے　　کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی　　کیک کو چکھ کے سیویوں کا مزا بھول گئے
موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی　　چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے
بخل ہے اہلِ وطن سے جو وفا میں تم کو　　کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں　　اور یہ نکتہ، مری اصل ہے کیا بھول گئے

اونچائیت کا اپنی زینہ رکھنا — احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل اکبر — لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

اک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کچھ خبر نہیں اے موالیو تمہیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا خبر کو چھوڑ دیں

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی — ملا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹی

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے — اسے کشتی نہیں ملتا اسے ساحل نہیں ملتا

کہاں کی پوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کی زمزم — ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر ایک ہیں بھی دو ایک جام صاحب
عزیزان وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل — یگانوں میں رہے بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے — ہاتھ اس مس سے لانا چاہیئے

سایہ مغرب میں شوق دل نے پھیلائے تو پاؤں — چار ہی دن میں مگر پتلون ڈھیلی ہو گئی
دھن دیس کی بھی جس میں گاتا اک دہاتی — بسکٹ سے ہے طائم پوری ہو یا چپاتی
شیخ بھی باہر نہ نکلے اور یہ کہلا دیا — آپ بی اے کے پاس ہیں تو بندہ بی بی پاس ہے
شوق لیلائے سول سروس نے مجنوں کر دیا — اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو
محاورات کو بدلیں براؤن ریل جناب — ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پابہ رکاب
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ
چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا — شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ — کر کلرکی کھا ڈبل روٹی خوشی سے پھول جا
ہو گیا ہے الہلال[1] آماجگاہ تیر غرب — اس نئے دور فلک کی چاند ماری دیکھئے
ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں — جنھیں پڑھ کر کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
مزے سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی
ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

---

[1] ابوالکلام آزاد کا مشہور اخبار

منتخبات

شعرِ آشوب

ظریف لکھنوی (مرحوم)

تجھ میں اے ہندوستاں کچھ آج کل حد سے سوا
چار سو پھیلی ہوئی ہے شاعری کی اک وبا
اس مرض میں اب تو اسّی فیصدی ہیں مبتلا
مستند شاعر ہے جس نے اک تخلص رکھ لیا

شاعری گو عہدِ ماضی میں تھی پایانِ علوم
اب تخلص میں سمٹ کر آ گئی جانِ علوم

ہے بہت تکلیف دہ شاعر کی وہ جنسِ عجیب
جو سنانے کے لئے بے چین رہتا ہو غریب
اس کو اچھا کر نہیں سکتا کوئی کامل طبیب
شاعری کی جس کو بدہضمی ہو ہیضے کے قریب

چاہتا ہے سب سنا دوں جو کہوں اک سال میں
مبتلا ہے شاعری کے سخت تر اسہال میں

طرح کا مصرع نہیں بجلی کی ہے اک بیڑی
جڑ دی شاعر میں جہاں اس نے غزل اک ڈھالدی
دعوتِ شعر و سخن اب دل لگی ہے دل لگی
سال میں جتنے ہیں دن تعداد ان سے بڑھ گئی

جس جگہ شرکت نہ کی جائے وہی آزردہ ہے
سب کو خوش کرتا پھرے شاعر ہی کا دل گردہ ہے

کچھ صعوباتِ سفر ہوتے نہیں مانا تجھے　　صحبتِ شعر و سخن میں فرض ہے جانا تجھے
کام شب بھر جاگنا مصرعے کا دہرانا تجھے　　ہر غزل کی داد دینا اور چلّانا تجھے

تیری شرکت لازمی ہر شہر میں ہر گاؤں میں
سر میں سودائے سخن ہے اور سنیچر پاؤں میں

دیکھ تیری قدر یوں کرتے ہیں تیرے قدرداں　　کوئی میلہ ہو کہیں پر یا نمائش یا نہان
جس میں سرکس بھی ہو دنگل میں لڑیں کچھ پہلوان　　یاد کر لیتے ہیں بھولے سے تجھے بھی مہرباں

دیتے ہیں لالچ میڈل کا تیری عزت کے لئے
تھرڈ کا تجھ کو ٹکٹ ملتا ہے شرکت کے لئے

وہ بھی جب کافی ضمانت ہو کہ شاعر آئے گا　　یہ کرایہ تو کہیں لے کر نہیں کھا جائے گا
ایک بھرتی کرنے والا خود ٹکٹ دلوائے گا　　اپنی ہمراہی میں تجھ کو ریل میں بٹھلائے گا

پڑھ نہ لے جب تک غزل ہوتی رہے گی دیکھ بھال
بعد اس کے ایک ۔ دوٹرا ور شاعر کا مآل!

تیری پالی دیکھنے کو جمع ہوتے ہیں عوام　　گردِ تیرے طالع کے اک گنوار دل اژدہام
وہ غزل پڑھنا خوش الحانی سے تیرا وقتِ شام　　واہ واہ کا شور پھر جھک جھک کے وہ تیرے سلام

جمع ہوتی ہے تجھے ساری خدائی دیکھنے
طرح کے مصرعے کے دانے پر لڑائی دیکھنے

اس طرح تعریف کرتے ہیں تیری اکثر گنوار　　کاہے رگھونندن کبھوں دیکھے رہیو ایسی بہار
یو بڑا ساعر پڑھے آوا ہے کو نو جور دار　　اس پڑھے ماں لام باندھس مچ گئی کوا کہار

جون بریا پڑ دیہس بانکی گجل جھلائے کے
کوؤ جھومے لاگ کوؤ رہ گوا منھ بائے کے

باک بریا اور ہم دیا کھارہے کر باندھاں   جب گگن کچو ماں جبین ہوئی چکا گنگا نہاں
کانگریس کا ایک بلم میر یہ کیس بکھاں   آل انڈیا مسہرا ہوئی ہے جلیں دیا کھے کساں
اس سماں دیا کھا کہی کا تم نے ہم بھیا کدار
باک بولا سب منس چچیاں جس بولیں سبار

لب کبڑیا سن کے یوں کرنے لگا اظہار رائے   یہ تو ساعر تھا پھسڈی اور بڑھیا کوئی آئے
جو گجل میں جُلف کا ماسوک کی نکسا دکھائے   ہم سے سوکھینوں کے دل پر کچھ رعاب اپنا جمائے
ڈاٹ کے للکار کے ہر ایک مے بھل میں پڑھے
جو گجل مو کے یہ پڑھ ڈالے مکابل میں پڑھے

بھائی مولا بکس جس بستی میں ہم آباد ہیں   اس جگہ ساعر بڑے بڑھیا ہیں مادرجاد ہیں
ان سبھوں میں سیکھ بدلو اک جگت استاد ہیں   ان کو ہر مو کے کی گجلیں منھ جبانی یاد ہیں
جس جگہ اُستاد نے دو تین گجلیں جھاڑ دیں
ساعروں نے ہو کے سرمندہ بیاجیں پھاڑ دیں

یہ نمائش میں ابھی دیوے گئے تھے پار سال   ایک حکائی گجل ایسی سُنائی بے مثال
حاکم اور رتے سیل دار ایسے ہوئے سُن کر نہال   دے دیا تمگا انھیں سونے کا جھٹ بے کیل و کال
اور جو ساعر نمائس میں گئے پھس ہو گئے
بس جگت استاد بدلو گول مڈلس ہو گئے

پیسے والوں کی سمجھ میں آگئی ہے اب یہ بات   صرف بے جا ناچ گانے کا ہے بالکل واہیات
جب کوئی جلسہ خوشی کا ہو کہیں پر ہو برات   منعقد بزم سخن ہوتی ہے تا کٹ جائے رات
پہلے ارباب نشاط آتے تھے گانے کے لئے
اب تو شاعر جاتے ہیں غزلیں سنانے کے لئے

★ ــــــــــــــــ ظریف لکھنوی (مرحوم)

شعر گوئی سے کبھی تم نہ ہراساں ہونا ساتھ مشکل کے اگر آئے نہ آساں ہونا
قہر ہے جا کے پلٹنا نہ مرے نالوں کا دونوں کانوں کا ترے بھول بھلیاں ہونا
خانساماں کئی صاحب کے گئے لینے مول سُن کے ان کے لبِ خنداں کا نمکداں ہونا
وہ مُنڈائے ہوئے سر وصل میں آنا اُن کا مختصر قصّہ طولِ شبِ ہجراں ہونا
جا کے چپکے سے رقیبوں کی پکڑ لینا ٹانگ کبھی دیوانہ جو تو اے سگِ جاناں ہونا
وہ مجھے خواہش وصل ان سے یہ تخئیل جدید وہ یہ تخئیل قدیم ان کا گریزاں ہونا
آئینہ خانے میں اب ایک نیا عالم ہے آپ ہی آپ ہیں اور آپ کا عُریاں ہونا
... دار یہ کیوں کانپ رہے ہیں تھر تھر کیا مرے گھر میں گھس آیا ہے بیاباں ہونا

غالب و میر کے پیرو جو ہیں اردو میں ظریف
ان کو اس عرس میں لازم ہے غزلخواں ہونا

اودھ پنچ کی ایک غزل

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

اک حسینے سے چپکے بیٹھے ہیں
واہ کیا واقعہ نگاری ہے

بیٹھے کوئی نہ آ کے دفتر میں
نادری حکم اب یہ جاری ہے

کیا کریں اب بے چارے اپرنٹس
رات دن شغل آہ و زاری ہے

مارے تخفیف اور ٹیکس کے نیچ
رو چکے سب ہماری باری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر کھلا ہے درِ عدالت ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

مفت کا مال کرتی ہے تحصیل
بس یہی اک وفا شعاری ہے

تھوڑے تھوڑے یہ اونٹ کی چوری
واہ کیا خوب پردہ داری ہے

(اودھ پنچ ۱۹۱۶ء)

نمک پارے

ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنیڈ چھو نہیں سکتے
ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا — اکبر

مریض ہے کہ خمیر اُٹھ چکا بے چائے کا
طبیب ہیں کہ خمیرے چٹائے جاتے ہیں

ادب نوازیٔ اہل ادب کو کیا کہیے
شاعروں میں اب احمق بلائے جاتے ہیں — احمق

جاگنے والے واہ کیا کہنا
سونے والے کو کچھ خبر نہ ہوئی — نامعلوم

خوش ہو رہا ہوں مسجد ویراں کو دیکھکر
میری طرح خدا کا بھی خانہ خراب ہے — 〃

میرے جینے کا طور کچھ بھی نہیں
سانس چڑھتی ہے اور کچھ بھی نہیں — فرخ نازی

آپ ہیں آپ، آپ سب کچھ ہیں
اور میں اور، اور کچھ بھی نہیں — پیروڈی

ان حسینوں نے اجاڑیں بستیاں
بوم سالا مفت میں بدنام ہے — بوم میرٹھی

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا — اقبال
کچھ بھی نہیں ہمارا، وہم و گماں ہمارا — پیروڈی

میخانے میں کیوں یاد خدا ہوتی ہے اکثر
مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا — ریاض

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکہ میں ملا ہو غازی — اقبال

احمق پھپھوندوی

گر خدا میری دعاؤں میں اثر دے ساقی
آبکاری کا منسٹر تجھے کر دے ساقی

اور رندوں کو کہاں ملک کی خدمت کے سوا
روز کے مرغ یہ ہر روز کے زر دے ساقی

تیرا ساغر نہیں پیمانہ میری عمر کا ہے
بس پس و پیش نہ فرما اسے بھر دے ساقی

اپنے رُخ سے جب اٹھائیگا کمیونزم کا نقاب
تیری آنکھوں سے جبھی اٹھیں گے پردے ساقی

زاہد و شیخ کو مے سے کوئی پرہیز نہیں
آج تیار ہیں پینے کو مگر دے ساقی

بس روپوں ہی کو نہ دیکھا اس مئے رنگیں کو بھی دیکھ
کاش! اللہ تجھے ذوق نظر دے ساقی

مل ہی جائے گی غریبوں کو بھی آخر میں کبھی
ہیں جدھر صاحب زر پہلے ادھر دے ساقی

خربزے ہند کے کھائیں گے تو لب چاٹیں گے
یہ ترے کابل و قندھار کے سر دے ساقی

ساقی آیا ہے جو محفل میں صراحی لیکر
ہر طرف سے ہے یہ ضد پہلے ادھر دے ساقی

ہم نشیں تجھ کو مرے ظرف کا اندازہ نہیں
شیشہ کیا خم بھی چڑھا جاؤں اگر دے ساقی

اس سے پہلے کہ بھرے عمر کا جام اے احمق
میرا ساغر مئے گلرنگ سے بھر دے ساقی

فحش ادب

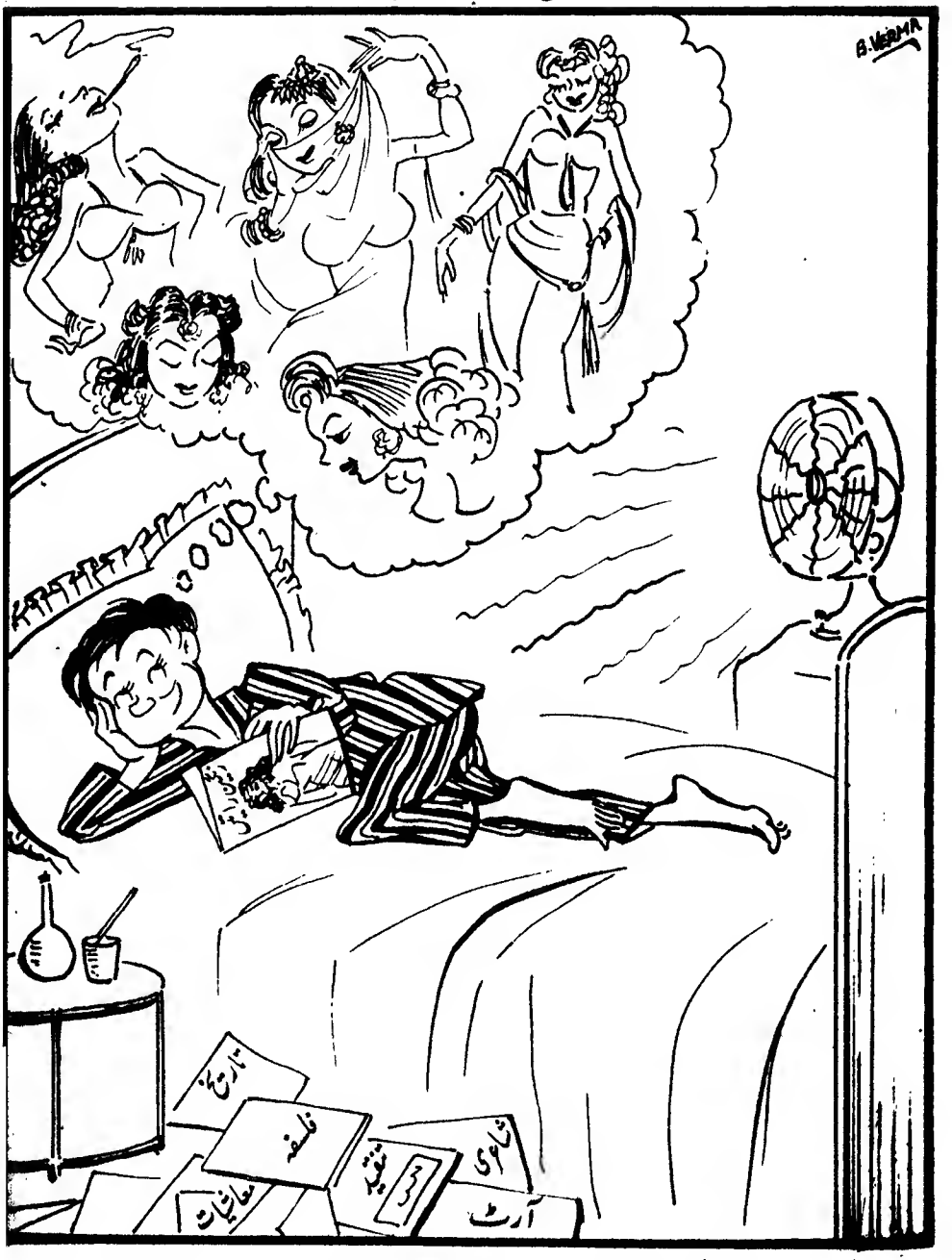

اُردو میں فحش اور بازاری ادب کی دھڑا دھڑ اشاعت ہو رہی ہے مگر ادب عالیہ کو .....

بتیس دانت اور ایک زبان

طنز کا کردار اور اس کے جدید مطالبے

● شکیل الرحمٰن

طنز، آرٹ اور نفسیاتی کیفیتیں

چھوٹا ناگپور کے آدی باسیوں کے گیتوں اور ناچوں میں جہاں مجھے اور بہت ساری باتوں کا پتہ چلا وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان گیتوں میں طنز کی بڑی اہمیت ہے۔ منڈاری قبیلے کے ایک رقص میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ایک خاص انداز سے آگے بڑھتی رہتی ہیں اور پیچھے ہٹتی رہتی ہیں اور ایک جھٹکے میں ایک دائرہ بنالیتی ہیں۔ دائرہ کے درمیان وہ اپنے جسم سے خاص لہر پیدا کر کے آگے بڑھتی ہیں۔ اور پھر فوراً پیچھے آجاتی ہیں۔ ان کے گیت میں طنز کی لہریں چھپی رہتی ہیں اور وہ جب بھی آگے بڑھتی ہیں طنز کی تمام لہریں سامنے آتی ہیں اور وہ ان لہروں کو اپنے دائرے میں اچھال کر پیچھے آجاتی ہیں۔ کچھ اس طرح جیسے اپنی طنز کی لہروں سے کوئی واقفیت ہی نہیں ہے۔ وہ بار بار طنز کو فضا میں اچھالتی ہیں اور ان کے ہونٹوں پہ ایک زہریلی مسکراہٹ پھیلتی ہے۔ ایسی زہریلی مسکراہٹیں ایسے گیتوں اور ناچوں میں نظر آتی ہیں جن میں طنز کی زہرناکی شامل ہوتی ہے۔ جب یہ لڑکے اور لڑکیاں محبت کے گیت گاتی ہیں۔ چاندنی کے دودھ میں محبت کی شیرینی اور مٹھاس شامل کرتی ہیں۔ اس وقت ان کے ہونٹوں سے یہ زہرناکی غائب ہوجاتی ہے اور طنز کا نام و نشان مٹ جاتا ہے۔ اس سلسلے کا ایک گیت مجھے یاد آرہا ہے، گیت کے بول یہ ہیں:-

نوسٹے ہو ، دُو دُو گر
سہ ما ہو کو آ سی
نی، ہین، دن، گی با نو آ
چھی منتی کا گے گا مائیا؟
آسار سا دن مویو دراتی ہو بانو آ
بھادور گی، دھرتی نور، جاتا
چھی منتی کا گے گا مائیا؟
سہ ماری، سنگ یو نگا ——————
اوترے مارنگ : بونا
چھی منتی کا گے گا مائیا؟
لائی، رنگی، ڈاتین
جی گی، سینوتانا —————!!!

اس گیت کا مطلب اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ دھول اور گرد سے فضا بھر گئی ہے۔ زمین کا ہوش اڑ رہا ہے، آسمان نیلا تھا لیکن اب گرد آلود ہے اور ہماری زمین پر بارش کا نام و نشان بھی نہیں ہے؟ آساڑھ اور ساون کے مہینے ہوں اور پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ملے، بھادوں کا مہینہ بھی آ رہا ہے، زمین ضرور گرم ہو جائے گی۔ لیکن بارش کیوں نہیں ہوگی؟ جنت میں سورج دیوتا کی حکومت ہے۔ اور زمین پر مارانگ دیوتا (یہ سب سے بڑے دیوتا سمجھے جاتے ہیں) رہتے ہیں پھر بھی بارش نہیں ہوتی ہے؟ بھوکوں کو موت آ رہی ہے، خشکی پیاس بڑھاتی جا رہی ہے، ہم موت کے دروازے پر تو نہیں کھڑے ہو گئے؟

منڈاریوں کے قبیلے میں یہ گیت کافی اہمیت رکھتا ہے، اس گیت میں اور اس گیت کے رقص میں طنز کی لہریں ہر جگہ موجود ہیں۔ اس قبیلے کے لوگ مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں اور اپنے دیوتاؤں کو کسی صورت میں ناراض دیکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ لیکن جب ان کی زمین میں اناج نہیں ہوتے، ان کی بھوک انہیں پریشان کرتی ہے، دھرتی پر پانی کے قطرے نہیں گرتے تو وہ اپنے دیوتاؤں پر بھی طنز کرتے ہیں اور کچھ اس طرح جیسے للکار، للکار کر یہ کہہ رہے ہوں کہ بڑے دیوتا بنتے ہو۔ ہمارے لئے بارش کیوں نہیں لاتے ہم تمہیں اتنا پیار کرتے ہیں اور ہم ظلم کو روک بھی نہیں سکتے، تمہاری قوت اس وقت کہاں چلی جاتی ہے جب ہماری زمین میں اناج نہیں ہوتے۔ ہم بھوکوں مرتے ہیں اور موت کے دروازے ہمارے لئے کھل جاتے ہیں۔

طنز انسان کی زندگی میں کچھ اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ وہ انسان کی فطرت میں داخل ہو گئی ہے، انسان کی نفسیات کی گہرائیوں میں اتر گئی ہے، سماجی حالات انسان کو طنز کی نئی اداؤں سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اور انسانی سماجی قدریں (values) سے ان اداؤں کو چن کر اپنی مسرت (pleasure) میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس طرح طنز کا مسرت سے گہرا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ طنز کبھی انسان کی آنکھوں کے اشاروں سے ٹپک جاتی ہے کبھی ہونٹوں پر ہمکتی ہے، کبھی گردن کی جنبش میں اپنی لچک شامل کر دیتی ہے۔ کبھی چہرے کی جھریوں میں رینگتی ہے، کبھی ٹھنڈی سانسوں میں الجھتی ہوئی باہر آتی ہے۔ کبھی انگلیوں کے اشاروں پر گھوم گھوم جاتی ہے اور مچل جاتی ہے، عام زندگی میں اس کا مشاہدہ ہر قدم پر ہوتا ہے۔ رقص میں یہ تمام باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ رقص کی ہر ادا، ہر جنبش، ہر لہر، ہر لچک طنز کو اچھالتی ہے اور اخلاقی قدروں کے اثرات اور پھر طنز اور انسانی مسرت کے گہرے ربط اور تعلق کو نمایاں کرتی ہے۔

رقص کے علاوہ سنگ تراشی، مصوری اور ادب میں طنز کی زہرناکی اور بت شکنی ہر جگہ نظر آئے گی۔ مختلف کیفیتوں میں اس کی تصویریں ہر جگہ جھلکتی ہیں۔ دنیا کے ہر آرٹ میں طنز کا اظہار ہمیشہ کھل کر ہوا ہے۔ مصر کی سنگ تراشی سے ایفٹا کی سنگ تراشی اور پھر موجودہ سنگ تراشی تک طنز انسان کی حماقت، شرارت، مسخراپن، سنجیدگی، بھولے پن، شعور کی بالیدگی، خیال کی بلندی، جنوں کی تیزی، غم کی تاریکی، سب پر اپنی چوٹ لگاتی نظر آتی ہے۔ چین کی قدیم مصوری اور ہندوستان کی قدیم مصوری میں بھی طنز کی قوت اپنی تمام حرارتوں کے ساتھ موجود ہے۔ انسان کی نفسیات کی سرحدوں میں طنز نے اپنی بنیاد اتنی مضبوط کر لی ہے کہ فن تعمیر میں بھی طنز کے ٹکڑے جا بجا لگتے رہتے ہیں، طنز میں مذاق اڑانے کا خیال جب انتہائی طور پر مضبوط ہو جاتا ہے (اور بعض وقت طنز کی سرحدوں سے باہر نکل کر یہ خیال رینگنے لگتا ہے) تو منہ چڑھانے والی کیفیت انسانی نفسیات کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے اور فن تعمیر میں بھی یہ شوخی اپنی تمام انفرادی خصوصیتوں کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ اس شوخی کے تجربے کے بعد طنز کا ایک خاص پس منظر مل جاتا ہے، جنگ کے دوران میں خیموں اور شامیانوں کی تراش و خراش میں یہ شوخی نہ جانے کب سے کام کرتی رہی ہے۔ جنگ کے وقت فتح کی ہوئی جگہوں پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں ان میں طنز کا اظہار ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے حرفوں اور لفظوں میں طنز کی کیا کچھ ہٹ موجود ہے۔ تجربوں کو نفسیاتی رنگوں میں ڈال کر ان تجربوں کو خاص نفسیاتی کیفیتیں دے دی جاتی ہیں۔ اور ان کیفیتوں سے شروع میں جو الفاظ تراشے گئے، ان میں جہاں اور بہت ساری سرمستیاں ہیں۔ وہاں طنز کی شوخی، اثر انگیزی اور بت شکنی اور مزاح کی گدگدی اور لہر بھی موجود ہے۔

قدیم مصری زبانوں کو پرکھتے وقت ماہرین لسانیات اس نتیجے پر آئے ہیں کہ مصری تصویری تحریروں میں بے شمار ایسے الفاظ موجود ہیں جن میں مصریوں نے طنزیہ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان تصویروں میں طنزیہ پہلو پر ابھی بھی کافی غور کیا جا رہا ہے۔ انسان طنز کی لہروں میں اپنے شعور میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ کسی نہ کسی صورت میں یہ لہریں ظاہر ہوتی ہیں۔ چین کی قدیم تحریروں میں بھی اس کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ غصہ، نفرت، بدحالی، فطرت کی ستم کاریاں، حکومت کا زور و ظلم، بیکاری، بھوک، نفسیاتی الجھنیں اور پھر محبت کے رنگین تصورات اور خلوص کی انتہا طنز کو نئی نئی صورتوں میں لاتی رہی ہیں اور قدیم تحریروں میں جب الفاظ تصویروں سے ترتیب پاتے تھے۔ یہ ساری باتیں موجود تھیں۔ شہنشاہوں کے خطوں میں طنز زیادہ ہوتی تھی۔ ایک بادشاہ جب دوسرے بادشاہ کو خط لکھتا تھا تو طنز کی تصویریں صاف نظر آتی تھیں۔ یوں مفکروں اور ادیبوں کے علاوہ عاشقوں کے خطوط اور کہی ہوئی باتوں میں طنزیہ تصویریں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسی تصویروں پر اس نقطۂ نظر سے زیادہ محنت ہو اور اس وقت کی طنز کی بھرپور تصویر ہمارے سامنے آجائے۔

کارٹون کی ابتدا ایک معنی میں اسی وقت ہوگئی تھی جب انسان نے لکھنا شروع کیا تھا۔ کارٹون سے طنز کے فن کو قوت ملی ہے۔ طنز کے بہت سارے مطالبے کارٹون سے پورے ہوگئے ہیں۔ اب تو سیاسی، سماجی، نفسیاتی، عمرانی، تاریخی، جغرافیائی، معاشرتی، تہذیبی، ثقافتی غرض ہر پس منظر میں کارٹون نے اپنی ایک بنیاد مضبوط کرلی ہے۔ اور طنز کی لہریں کارٹون کے ذریعے ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں۔ سوویت روس کے کارٹون نے طنز کو جس طرح پیش کیا ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی ہے۔ کارٹون کی طنز میں طنز کی ساری خصوصیتیں موجود ہوتی ہیں۔ اور ان ساری خصوصیتوں سے آج کارٹون میں کافی فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ فلموں میں بھی جو کارٹون شامل ہوتے ہیں۔ ان میں بھی طنز کی خصوصیتوں کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے۔ سماجی زندگی کے تجربوں کو داخلیت میں اچھی طرح سمو کر طنزیہ انداز میں پیش کر دینا ہی اس آرٹ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ کارٹون نے طنز کی قوتوں کا شدید احساس دلایا ہے۔ اور اس کا اثر فلموں پر گہرا ہوا ہے۔ اس قوت سے ایمانداری اور خلوص، محنت اور ریاضت کے ساتھ جب فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے تو کامیابی ضرور ہوئی ہے۔ گھٹیا قسم کے بھی کارٹون بنتے رہے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں، ظاہر ہے ایسے کارٹون میں طنز کی قوت دم توڑ دے گی۔ اور مضحکہ خیزی اپنی قوت کے ساتھ اس کی روح کو سنبھالنے کی کوشش کرے گی۔ طنز کا اپنا کردار ہوتا ہے۔ اس کی اپنی روح (زندہ، متحرک) ہوتی ہے۔ یہ نہایت ہی نازک فن ہے، اس کے کردار سے اپنے تجربوں کو ہم آہنگ کرنا اور اس کی روح کو پاکیزگی اور خوشبو کو پالینا بہت ہی مشکل ہے۔ دنیا میں طنز نگاروں کی کمی اب بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ نئے نئے مسائل سامنے آتے جا رہے ہیں۔ اور نفسیاتی کیفیتیں طنز کی لہروں میں تیزی چاہتی ہیں۔ اس لئے کہ ان کیفیتوں اور ان لہروں کی تیزی میں توازن اور ہم آہنگی قائم رہے تاکہ طنز اجتماعی اور انفرادی شعور و مسرت دے سکے جس مسرت سے سکون بھی ہو اور دل و دماغ میں آگ بھی لگے۔ انسان نے ان کیفیتوں کی وجہ سے طنز کو ایک جاندار بنا کر رکھ دیا ہے۔ لوک گیتوں اور لوک کہانیوں میں بھی طنز کی بڑی اہمیت ہے۔ جانوروں اور آدمی کے جسم کو اشاروں میں سمیٹ کر طنز کے کردار کو حاصل کر لینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ لوک کہانیوں (Folk Stories) میں نہ جانے کتنے اشاروں (Symbols) کو جمع کر دیا گیا ہے۔ اور ان اشاروں سے طنز پیدا کر کے مسرت کی تکمیل کی گئی ہے۔ سماجی حالات پر مختلف جانوروں کی زندگی سے طنز کی گئی ہے۔ ایسی کہانیاں بنائی گئی ہیں جو بظاہر معمولی کہانیاں نظر آتی ہیں۔ لیکن ان کہانیوں کی تہوں میں طنز کی شوخی، بے تکلفی اور چبھن سب کچھ موجود ہے۔ مزاحیہ کہانیوں کی بھی ترتیب کچھ ایسی ہے کہ طنز کو اچھی طرح ابھر جانے کا اچھا موقع ملا ہے۔ فارسی اور سنسکرت کی کہانیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ایشیا کی دوسری زبانوں میں بھی سینکڑوں کہانیاں موجود ہیں۔ چین، جاپان، تبت اور کوریا کی کہانیوں پر بھی ہماری نگاہیں جا چکی ہیں اور ہم نے محسوس کیا ہے کہ طنز کے کردار کو ہر جگہ حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

لوک گیتوں میں سماجی زندگی کے نشیب فراز اور ماحول کے اسرار و رموز کی کیفیتوں پر طنز موجود ہے۔ سینکڑوں ایسے گیت جمع کئے جا سکتے ہیں جن میں طنز کی قوت سے اتنا کام لیا گیا ہے کہ ہزاروں بت ٹوٹ گئے ہیں، بنیادیں کھوکھلی ہو گئی ہیں، اور وہ حقیقتیں جو عوام سے چھپی ہوئی تھیں اپنی ساری سماقتوں اور شرارتوں کے ساتھ سامنے آ گئی ہیں اور لوگوں نے تعجب سے ان حقیقتوں کو دیکھا ہے، پھر انھیں سمجھا ہے اور ان کے خلاف جد وجہد کی ہے۔

طنز اور مسرت کا تعلق گہرا ہے

طنز اور انسانی مسرت کا تعلق نہایت ہی گہرا ہے۔ سماجی قدروں کے ساتھ طنز کا انداز بھی بدلتا رہتا ہے اور مسرت کی لہروں میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ شعور کے زخم پر اس وقت مرہم لگ جاتا ہے جب شعور اپنے زخم کی نوعیت اچھی طرح سمجھ کر اور سماجی حالتوں کا تجزیہ کر کے طنز کی قوتوں سے مصرف لیتا ہے۔ اور طنز کے تیر پھینکتا ہے۔ سکون اور اطمینان کی تہیں شعور پر جمتی جاتی ہیں اور مسرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ لاشعور میں کچھ ایسی خواہشیں رہتی ہیں کہ انسان اس مسرت کے لئے ان خواہشوں کو اپنا لیتا ہے اور یہ خواہش انسانی جبلتوں کو جھنجھوڑتی رہتی ہے اور طنز اپنی ایک زبان پیدا کر لیتی ہے اور جب طنز کی یہ زبان پیدا ہو جاتی ہے اس وقت شعور پر کسی قسم کا کوئی دباؤ (Repression) پیدا نہیں ہوتا ہے۔

انسان کی نفسیاتی کمزوریوں اور نفسیاتی قوتوں کی تصویریں طنز کی زبان میں صاف طور پر جھلکتی ہیں۔ انسان اپنی مسرت کے لئے طنز کو مختلف ڈھنگ سے استعمال کرتا ہے۔ احساس کمتری اور احساس برتری کے ساتھ ساتھ دوسرے احساسات اور جذبات اور مختلف جبلتوں کی دائیں طنز میں اسی طرح سرمستی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جس طرح کوئی سپیرا بین کی آواز سے سانپ میں سرمستی پیدا کرتا ہے اور سانپ کو جھوم جھوم جانے پر مجبور کرتا ہے۔

طنز سے وہ مسرت پیدا ہوتی ہے جس کا سماجی قدروں اور سماجی حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسان کی نفسیات کی ساری لہک اور ساری شدت، سارا آہنگ اور ساری رعنائی، سماجی قدروں اور خارجی حالات کی تخلیق ہے۔ اس لئے طنز صرف لاشعور یا شعور میں وہ مسرت پیدا نہیں کرتی جس کا تعلق براہ راست فرد واحد کی اس ذات سے ہے جس ذات میں کاسٹ ریشن الجھن ——— (Castration Complex) اور ایڈی پس الجھن (Oedipus Complex) ہوں، صرف نرگسیت ——— (Narcissism) ہو۔ بعض ماہرین نفسیات اس پر مصر ہیں کہ طنز دبی ہوئی جنسی خواہشوں یا طفلانہ Repressed Infantile sexuality کے مکمل اظہار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ سماجی قدروں کی قوت کی طرف ایمانداری اور خلوص سے نہ دیکھنے سے ایسا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی تحریک سے طنز کا کردار موم کا کردار (Character of wax) بن سکتا ہے جسے کسی وقت بھی پگھلایا جا سکتا ہے۔ طنز کا جس مسرت سے گہرا تعلق ہے وہ مسرت جنس کی جبلت (Instinct of sex) کو بھی اپنے دائرے میں رکھتی ہے اس لئے کہ انسان کی دوسری ساری جبلتیں اس دائرہ میں موجود رہتی ہیں، وہ بھوک کی جبلت ہو یا فن تعمیر کی جبلت۔ طنز کی قوتوں سے مصرف لینے کے لئے جنس کو صرف داخلی زندگی میں رکھ چھوڑنا بھی عجیب بات ہو گی اس لئے کہ اس کا تعلق خارجی زندگی سے نہایت ہی گہرا ہے اور لاشعور میں پڑے ہوئے عناصر پر شعور کی وہ شعاعیں ہمیشہ پڑتی رہتی ہیں جو خارجی زندگی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ طنز کے کردار کے لئے ہمیں انسانی مسرت کی تمام اداؤں کو سمجھنا ہو گا۔

طنز اور اشاریت

اشاریت کو طنز کی زبان کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ طنز کی زندگی اور موت اشاریت پر منحصر کرتی ہے۔ طنز کے کردار کے لئے اشاریت کا

استعمال نہایت ہی ضروری ہے اس کے بغیر طنز کا کردار مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ اشاریت طنز کی ساری خصوصیتوں کو سمیٹ کر اپنے ساتھ لے آتی ہے۔ یہ اشارے طنز کو اس کی نزاکتوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ اور نزاکتوں کی تہیں جماتے ہیں۔ اشاروں میں کائنات اترتی ہے۔ ایک ایک اشارہ ایک دنیا بسائے رہتا ہے۔ طنز میں جو بات آتی ہے وہ نہایت ہی مختصر ہوتی ہے۔ لیکن بھرپور حقیقت کو سینے سے لگائے رہتی ہے۔ ایک ہی قطرے میں سمندر کی لہریں اور سمندر کا ابال نظر آنے لگتا ہے۔ جس طنز کو اشاریت پر مکمل عبور حاصل نہیں ہوتا وہ اچھی طنز نگاری کے راستے سے بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ طنز کا اپنا داخلی کردار بھی ہوتا ہے جو مختلف سماجی ماحول کے مختلف مزاج اور کیفیت سے تربیت پاتا ہے۔ اس داخلی کردار کو پانے کے لئے کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اور اشاریت اس جدوجہد میں طنز نگار کی مدد کرتی ہے۔ اشاریت سے طنز کی تکنیک کے راز کھلتے ہیں اور داخلی کردار حاصل ہو جاتا ہے۔ سماجی زندگی کی کش مکش میں طنز کے لئے جو مواد حاصل ہوتے ہیں اس مواد کے مطابق اشاریت کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ طنز نگار کی چابکدستی اور وسیع النظری پر منحصر ہے کہ وہ ہر شے کے لئے اس کے مطابق کوئی اشارہ تراشے طنز نگار کو اپنے مواد کے لئے اشارے بھی وہیں سے حاصل کرنا پڑتے ہیں جہاں وہ اپنے مواد کو حاصل کرتا ہے۔ خام مواد کے لئے جتنی محنت کرنی پڑتی ہے اور اسے سنوارنے میں جو قوت صرف ہوتی ہے اس سے زیادہ محنت ان کے اشاروں کو حاصل کرنے اور ان اشاروں کی تراش خراش کے لئے کرنی پڑتی ہے۔ طنز کی تکنیک کے لئے ضروری ہے کہ ماحول کے حاصل کئے ہوئے تجربوں کا اتنا تجزیہ کیا جائے کہ پیاز کے چھلکوں کی طرح ان کے بھی چھلکے اتر جائیں۔ یہی تجزیہ تجربوں کے اظہار کے لئے اشارے عطا کرتا ہے جو طنز نگار جتنی محنت تجربوں کے تجزئیے میں کرے گا اتنا ہی اسے اشاروں کی تکنیک کو سمجھنے کا موقع ملے گا اور طنز کی داخلی فطرت کو جاننے میں مدد ملے گی۔ یہ داخلی فطرت وہ شے ہے جہاں دنیا کے اچھے طنز نگار بھی باوجود اچھی خاصی محنت کے نہیں پہونچ سکے۔ اور طنز کا کردار کچھ اس طرح کھڑا رہا ہے جیسے اس میں کوئی خاص جان ہی نہ ہو۔ اشاریت کے استعمال میں بہت ہی غور و فکر سے کام لینا پڑتا ہے ــــ بعض طنز نگاروں نے اچھے اشاروں کا بھی خون کیا ہے۔ مبہم اشاروں کا بھی اس طرح استعمال ہوا ہے جیسے طنز کے لئے مبہم اشاروں کے علاوہ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ تجربوں کی پیش کش کے لئے جس احتیاط کی ضرورت ہے وہ احتیاط طنز نگاروں کو پیدا کرنا چاہیئے۔ ورنہ سپاٹ اور مبہم دونوں قسم کے اشارے طنز کی جان مار دیں گے۔ دنیا کے اچھے اور بڑے طنز نگاروں کے یہاں سپاٹ اور مبہم اشاروں کا ایک ہجوم ہے یہ صرف اس لئے کہ ان طنز نگاروں نے اپنے تجربوں کا تجزیہ اچھی طرح نہیں کیا۔ اور اشاروں کے انتخاب میں ان کے پاؤں ڈگمگا گئے۔ طنز کے لئے اشاروں کا انتخاب ایسا ہو کہ ان اشاروں میں نمائندگی کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ طنز میں یہ نمائندگی بہت کچھ ہے، اسے بڑی بات سمجھنی چاہیئے۔

طنز میں انفرادی اور اجتماعی مفاد اور ان کی کش مکش

فن کی دوسری صورتوں کی طرح اس صورت میں بھی فنکاروں کے یہاں انفرادی اور اجتماعی مفاد کی کش مکش جاری رہتی ہے رجعت پسند طنز نگاروں نے تو سطحی اشاروں کا انتخاب کرکے سطحی مواد کو انفرادی مفاد کے لئے ہمیشہ پیش کیا ہے۔ یہاں وہ ادیب بھی ہیں جو شعوری طور پر انفرادی خواہش کی تکمیل چاہتے ہیں اور یہ جانتے ہوئے کہ طنز اجتماعی مفاد کے لئے ایک ضروری ہتھیار ہے۔ وہ لاشعور کے ان الجھنوں میں گرفتار رہے ہیں جن الجھنوں میں شعور اور ادراک کو گرفت میں کر لینے کا ایک جنون ہوتا ہے۔

یہ ادیب ذاتی اور انفرادی مسرت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو بھی ڈھونڈتے رہتے ہیں اور اپنی شخصیت پر طنز کرتے رہتے ہیں۔ اسی میں ان کی مسرت پنہاں ہے۔ وہ اس طرح ایک لذت حاصل کرتے ہیں اور اس لذت کے لئے انھیں یہ گوارا ہے کہ اجتماعی مفاد اور اس کی کش مکش کو طنز کی قوتوں سے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

طنز کے اشارے طنز کے کردار کو اس لئے مضبوط کرتے ہیں کہ اجتماعی مفاد ہمیشہ پیشِ نظر رہے۔ اجتماعی مفاد سے الگ، رہ کر انفرادی مسرت ہی کو سب کچھ سمجھ لینا بہت بڑی فراریت ہے اور حقیقت نگاری یہ فراریت برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ طنز میں تلوار کی تیزی اس وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جب اجتماعی مفاد سے تجربوں کی ہم آہنگی اچھی طرح ہو جائے۔ بت شکنی بھی طنز میں اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ طنز کو تنقید بنا دینا بہت بڑا آرٹ ہے۔ اور طنز اس وقت تک تنقید نہیں بن سکتی جب تک کہ مواد تجربوں کے اچھے تجزیہ کے بعد ظاہر نہ ہوا اور اجتماعی مفاد کے لئے اس مواد کو اچھے اور جاندار یکدست اشارے حاصل نہ ہو جائیں۔ طنز جب تنقید بن جاتی ہے تو تجربوں کی گرفت مکمل ہو جاتی ہے۔ اور حقیقتوں کے تجزئے سے ان کی تمام گہرائیوں سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے لوتریامون کا ہیرو شارک مچھلی سے ہم آغوش ہو کر طنز کی تنقید نہیں بنا سکتا اور نہ سوئفٹ (Swift) گھوڑے کو انسان سے بہتر کہہ کر طنز کو تنقید کا درجہ دے سکتا ہے۔ طنز میں انفرادی مفاد کی کش مکش کچھ اس طرح ہوتی رہی ہے کہ لذتیت اور فراریت نئے نئے روپ لیکر طنز کی سرحدوں میں داخل ہوتی رہی۔ سوئفٹ کا یہ جملہ اس سلسلے میں بہت کچھ سمجھنے پر مجبور کرے گا اور ایسے ماحول میں انسان کا جو تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی جھلکیاں اس میں نظر آجائیں گی۔ وہ کہتا ہے:۔

"Man is the most pernicious race of Odeoims vermim that nature has suffered to crawl upon the surface of the earth"

"گلیورس ٹریول" کے تیسرے اور چوتھے حصے میں فلسفیوں اور سائنسدانوں پر بھی جو طنز ہے اس میں بے دھڑک فیصلہ کر دینے کا انداز ہے۔ ایسے طنز نگاروں کے یہاں جو انفرادی مفاد ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اجتماعی مفاد کی طرف نگاہیں نہیں لے جاتے ہیں وہ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں دنیا کو سمجھنے کی نہایت ہی غیر سماجی کوشش ہوتی ہے انسان دوستی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، خلوص کا نام مٹ جاتا ہے اور طنز کی ساری اثر انگیزی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے طنز نگاروں کے یہاں حقیقت کا کوئی مادی تصور بھی نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب بھی حقیقت کے قریب آتے ہیں "گمراہ" ہو جاتے ہیں۔ برنارڈ شا اس دور کا ایک نہایت ہی اہم طنز نگار تھا۔ اس نے اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود سماجی حقیقتوں اور اجتماعی مفاد کو طنز کی عینک سے دیکھا تھا۔ میں کاڈول کے اس خیال سے بھی متفق نہیں ہوں کہ:۔

"Shaw is helplessly imprisoned in the categories of bourgeois thought"

اور نہ اس کی تخلیقات میں فاشزم کی ابھری یا ہلکی ہلکی لکیروں کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ شا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے برسرِ اقتدار نظام حیات کی ساری کمزوریوں اور کمزوریوں کی ساری تھرتھراہٹوں کو طنزیہ انداز میں اچھی طرح نمایاں کر دیا ہے۔ کاڈول جب شا کو ایچ، جی، ویلس، لارنس۔ رسل اور گالسورددی کے دائرہ میں کھڑا کر دیتا ہے تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے خود کاڈول رچرڈس اور برگساں اور ایلیٹ کے درمیان کھڑا ہے۔ شا نے جو فرسودہ تہذیب و تمدن کو عریاں کیا ہے اور فرسودہ تہذیب و تمدن کے تراشے ہوئے بتوں کو توڑا ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اس کی طنز نے اس کی ظرافت میں بڑی جان پیدا کر دی ہے۔ طنز نگاروں کو سماجی زندگی کی حقیقتوں پر بھرپور نظر رکھنی چاہیئے۔ اور طنز کو ایک فن کی حیثیت سے دیکھتے ہوئے اجتماعی مفاد کی کش مکش کے قریب کر دینا چاہیئے۔

جدید مطالبے

طنز کے جدید مطالبوں پر جب نگاہیں جاتی ہیں اور پھر لوٹ کر ہم اپنی تخلیقات دیکھتے ہیں تو بہت مایوسی ہوتی ہے طنز

کے جدید مطالبے ایسے ہیں جن پر ہمیں کافی غور کرنا چاہیئے اور ان مطالبوں کے لئے اچھی محنت اور ریاضت کرنی چاہیئے۔ سماجی ماحول سے تجربوں کو حاصل کر لینا اتنی بڑی بات نہیں ہے جتنی بڑی بات ان تجربوں پر مکمل گرفت کی ہے اور طنز میں تجربوں کو مکمل گرفت ہی سے کام نہیں چل جاتا بلکہ ان تجربوں سے وہ پتھر اٹھانا پڑتا ہے جو سب سے زیادہ چمکتا ہو۔ اور اس پتھر کی روشنی میں طنز کی تیزی کی شمولیت ہوتی ہے۔ ہمارے طنز نگاروں کو اشاریت کا صحیح انتخاب چاہیئے۔ تجربوں کے لئے ان کے مطابق اشاریت کا انتخاب نہایت ہی کٹھن کام ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ناکامیابی زیادہ ہوتی ہے۔ اور کامیابی بہت ہی کم۔ اشاریت کو طنز کی زبان سمجھ کر اسے قریب کر لینا ضروری ہے۔ اشاریت کافی محنت چاہتی ہے، اسی سے طنز کی قوت بڑھتی ہے اور طنز کی لہروں میں اضافہ ہوتا ہے۔

جدید طنز نگاروں کو اس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ سماجی قدروں اور اپنی مسرت کا رشتہ زیادہ سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اچھی طنز پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی رشتے سے اجتماعی مفاد اور سماجی مفاد کا گہرا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور طنز کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں غم کا بھی ایسا اظہار ہو کہ بے اختیار ہنس دینے کی خواہش ہو اور پھر فوراً ہی غم کی تلخی شباب پر آجائے۔ غم پر طنز کرنا، تاریکیوں پر طنز کرنا اور ان گوشوں پر طنز کرنا جو گندے ہیں اور غلیظ ہیں۔ طنز نگاروں کے لئے ضروری ہے یہ حقیقت ہے کہ سماجی ماحول کے ہنگاموں کے مطابق طنز کی تلخی تیزی اور اثر انگیزی کا استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے طنز نگار طنز کے اس مطالبے پر غور نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں سپاٹ پن اور سطحیت نمایاں ہوتی ہے۔ شعور اور لاشعور دونوں سے تجربوں کے پس منظر کی تیاری میں مدد لینی پڑتی ہے۔ اس طرح شعور کے زخم پر نمک بھی لگتا ہے۔ اور مرہم بھی۔ اور دونوں حالتوں میں تڑپ جانے والی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کیفیت سے طنز نگاروں کو مدد لینی ہے۔ طنز کی تکنیک پر عبور حاصل کرنے کے لئے طنز کے کردار کی تراش وخراش اور اس کی خارجی اور داخلی فطرت پر کڑی نظر کی بہت ضرورت ہے۔ ہمارے طنز نگاروں کو بھی براہ راست حملوں سے بہت پرہیز کرنا چاہیئے۔ براہ راست حملوں کا بھی بعض وقت موقع آتا ہے۔ لیکن ایسے وقت میں سخت نفسیاتی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا ماحول، ہمارا مزاج، اور ہماری طنز کی زبان ان براہ راست حملوں کو برداشت کرنے سے مجبور ہے اسی طرح سیاسی طنز میں نفسیاتی احتیاط کی بہت ضرورت ہے۔ سیاسی طنز میں کوئی بات ایسی نہ ہو کہ طنز کی تکنیک کو سیاست کے الجھے اور بھاری بھرکم عناصر سے تکلیف پہنچے۔ سیاسی طنز میں بھی ترقی پسند نظریوں اور خیالوں کے بھرپور اظہار کی ضرورت ہر وقت ہے۔ قومی اور بین الاقوامی موضوعات کو حاصل کرنے کی جدوجہد بہت ضروری ہے۔ طنز کی اصل تلخی ابھی تک ہمارے طنز نگار حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ یہ تلخی طنز کے کردار میں عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے، اسے حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ طنز نگاروں کو اپنی انفرادیت کی طرف بھی مکمل دھیان دینا چاہیئے۔ تحریر میں اس انفرادیت کا وجود ضروری ہے۔ یہی انفرادیت تجربوں کو نیا رنگ دیتی ہے۔ اور کہنے کے لئے نئی باتیں پیدا کرتی ہے۔ طنز کے طرز بیان کی طرف بھی کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ طنز نہایت ہی نازک فن ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ترتیب کی طرف مکمل دھیان چاہیئے۔ تاکہ شہد میں زہر ملانے والی بات پیدا ہوتی رہے۔ اور فرسودہ تہذیب کے پردے چاک ہوتے رہیں۔ جب سماجی ماحول میں ہنگامے ہوں تو طنز کی تیزی شباب پر آجاتی ہے۔ ایسے وقت میں طنز نگار کے شعور کا سنبھل کر رہنا اور توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔ جدید طنز نگاروں کو اپنے کلاسکی ادب سے بھی خوب فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ کلاسکی ادب کا مطالعہ ذہنی پس منظر کو مضبوط بنائے گا۔ اور نئی باتوں کے لئے نئے راستے بنائے گا۔ طنز میں انسان دوستی اور خلوص کا جذبہ ہی یہ سارا کام کرا سکتا ہے۔

اردو ادب میں طنز نگاروں کی کمی ہے

سماجی حالات کے ساتھ طنز کی قدریں بدلتی رہی ہیں۔ سنہ ۱۶۵۹ء سے سنہ ۱۷۱۳ء تک میر زٹلی کے یہاں ہزل میں بعض جگہ اخلاقی

عناصر بھی نظر آجاتے ہیں۔ ۱۷۱۳ء سے ۱۸۳۰ء تک سودا، میر، انشا اور مصحفی کی طنز میں ایک نئی کیفیت نظر آتی ہے، سودا کی ہجو نگاری بھی قابل غور ہے۔ اگرچہ ان کے یہاں سنجیدہ مضامین کا فقدان ہے اور طنز میں سطحی اور گری ہوئی باتیں بھی ہیں۔ میر کی بددعاؤں میں طنز کی عجیب لہریں چھپی بیٹھی ہیں۔ انشا اور مصحفی نے بھی انفرادی ماحول کے مطابق طنز پیدا کر کے تاریخی حیثیت حاصل کی ہے۔ ۱۷۹۷ء سے ۱۸۶۹ء تک غالب نثر میں طنز و ظرافت کی عجیب گدگدی پیدا کرتے رہے ہیں۔ اس سرمایہ کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پھر اودھ پنچ اسکول میں سرشار، مرزا مچھو بیگ، اکبر الہ آبادی، جوالا پرشاد برق اور پروفیسر شہباز وغیرہ نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی اپنے مزاج اور اپنے ماحول کے مطابق طنز پیدا کی۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود طنز سے زندگی میں حرکت دینے کی کوشش کی۔ اقبال نے طنز کو حکیمانہ نقطۂ نظر سے ایک بھرپور پس منظر عطا کیا اور بہت ساری نئی باتیں پیش کیں۔ جوش ملیح آبادی کی طنز نے بھی بڑا کام انجام دیا ہے۔ ان کے یہاں طنز کی داخلی فطرت صاف نظر آتی ہے۔ وہ طنز کے کردار کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ طنز پر انھوں نے کافی محنت کی ہے اور سوچنے اور غور و فکر کرنے کی راہیں کھول دی ہیں۔ غزل گو شاعروں نے شیخ و برہمن، ملا، ناصح اور معشوق پر جو طنز کی ہے اس طنز میں بڑی جان ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے طنز کو اتنا سرمایہ نہیں دیا جتنا ظرافت کو دیا ہے۔ پھر بھی یہ تھوڑا سرمایہ اہم ہے۔ ملا رموزی، فرحت اللہ بیگ، پطرس اور رشید احمد صدیقی نے بھی طنز میں اضافے کئے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس جو لب و لہجہ ہے اس میں ان لوگوں کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے۔ شوکت تھانوی ظرافت کے میدان میں خوب مقبول ہوئے لیکن طنز سے ان کا واسطہ اتنا گہرا نہیں رہا ہے۔ ان کی ظرافت چلتی پھرتی چیزوں کو تھام لیتی ہے۔ طنز کے بھی جو اشارے مل جاتے ہیں وہ غنیمت ہیں۔ ان کی طنز میں چابکدستی ضرور ہے۔ لیکن زہرناکی اور بیت شکنی نہیں ہے۔ مانپوری کے یہاں بھی کم و بیش یہی رنگ ہے۔ سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی اور پھر قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، ہاجرہ مسرور کی کہانیوں میں طنز کی اچھی اور ستھری مثالیں مل جاتی ہیں۔ انور عظیم، مہندر ناتھ، شوکت صدیقی اور پرکاش پنڈت (میراث کی بعض کہانیوں میں) کے یہاں بھی طنز کی کچھ اچھی مثالیں مل جاتی ہیں۔ کنہیالال کپور، ابراہیم جلیس، فکر تونسوی وغیرہ نے طنز کی طرف خاص طور سے دھیان دیا ہے اور اچھی تخلیقات پیش کی ہیں۔ ان لوگوں میں ابراہیم جلیس زیادہ طنز کے کردار اور تکنیک کو سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی تخلیق کا زیادہ حصہ اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزلوں اور نظموں کی دنیا میں کوئی اہم اور بڑا طنزی پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ جدید اور جدید تر شاعروں کے یہاں طنز کی اچھی مثالیں مل جاتی ہیں فیض اور پروین شاہدی کی غزلوں میں طنز کا ایک نیا روپ نظر آتا ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود ہمارے ادب میں طنز کا کوئی بڑا سرمایہ موجود نہیں ہے۔ طنز کے کردار اور اس کے جدید مطالبوں پر شعوری طور پر بڑے خلوص کے ساتھ سوچنے کی کوشش نہیں ہوئی ہے اور نہ اس کی تکنیک پر محنت اور ریاضت کی گئی ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر غور کریں گے تو پتہ چلے گا کہ انھوں نے ابھی بہت ہی کم کام کیا ہے۔ طنز کے لئے دنیا کتاب کی طرح کھلی پڑی ہے۔ یہ فن ان کی محنت، ریاضت کے ساتھ ان کی انسان دوستی، خلوص، ایمانداری اور جانب داری بھی چاہتا ہے۔ طنز کے جدید مطالبوں پر ہمارے ادیبوں کو بار بار غور کرنا چاہیئے۔

(بقیہ ۲۳۳) لیکن ان میں بھی "اودھ پنچ" کا ردِ عمل سراسر جذباتی تھا۔ اودھ پنچ کے تیسرے حصے کا فسانہ داغ کی شاعری تھا۔ یہاں بھی اصل وجہ محض یہ تھی کہ داغ کی شاعری دہلی اسکول کی شاعری تھی اور اودھ پنچ لکھنؤ کا نمائندہ تھا۔ اودھ پنچ کا آخری معرکہ "گلزار نسیم" سے متعلق ہے۔ یہاں مولانا شرر پر اعتراضات کی بارش کی گئی۔

اودھ پنچ کی روحِ رواں منشی سید محمد سجاد حسین تھے جنھیں اُردو صحافت میں طنز و مزاح کا "بابا آدم" کہنا چاہیئے۔ "لوکل" اور "موافقتِ زمانہ" کے عنوان سے سیاسی اور سماجی معاملات پر بڑے دلچسپ طنزیہ انداز میں بحث کرتے تھے

مرزا فرحت اللہ بیگ

متین سروش

• شخصیت اور فن

> فرحت میدان میں آتے ہیں تو قہقہہ بلند کرتے ہوئے نہیں بلکہ نہایت سنجیدہ لب و لہجہ لئے ہوئے ——— سنجیدگی اُن کی خوش مذاقی کی ایک خصوصیت بن گئی ہے، اُن کی سنجیدگی اور خوش مذاقی کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ ان کی سنجیدگی میں مزاح اور مزاح میں سنجیدگی پوشیدہ ہے ——— (یزدانی)

ڈاکٹر غلام یزدانی[1] کے بیان کے مطابق مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ذی قعدہ ۱۳۰۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۸۳ء میں نیچی سلطان خاں کی ڈیوڑھی واقع محلہ چوڑیوالان دہلی میں پیدا ہوئے۔

وہ قوم کے مغل تھے۔ مرزا رفیق بیگ کے بیان کے مطابق جو ان کے سگے ماموں زاد بھائی ہیں ان کا تعلق ازبک اور برلالی سے ہوئے خاندان سے تھا۔ ان کا خاندان شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں ترکستان سے ہندوستان آیا۔ ان کے والد کے نام مرزا حشمت اللہ بیگ اور والدہ کا نام مشرف جہاں بیگم تھا۔ صرف دس دن ہی کے تھے کہ والدہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اس سے ان کی پھوپی حسن جہاں بیگم نے ان کو پالا۔ حسن جہاں بیگم ان کے والد سے عمر میں اتنی بڑی تھیں کہ انھوں نے مرزا حشمت اللہ بیگ کو گود لے کر پالا تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد پھوپی نے مرزا فرحت اللہ بیگ کی پرورش ماں سے بھی زیادہ بڑھ کر کی۔

ڈاکٹر غلام یزدانی نے ان کا حلیہ یوں لکھا ہے ——— "فرحت کا رنگ نہایت سرخ و سپید۔ جلد صاف۔ ہونٹ پتلے پتلے۔ دانت چھوٹے اور پیوستہ۔ چہرہ نہ لمبا۔ نہ زیادہ گول۔ آنکھیں البتہ چھوٹی چھوٹی، ایک آنکھ دبا کر دیکھتے تھے۔"........

"بچپن میں بہت دبلے تھے۔ جوانی اور بڑھاپے میں بھی بدن چھریرا رہا۔ لیکن پچھلی عمر میں پیٹ ذرا بڑھ گیا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر کہتے دانی دیکھو میری اب توند نکل آئی ہے۔"

اور آغا حیدر حسن نے ان کے چہرے کی مصوری یوں کی ہے:۔ "آکا فرحت شہر بربادی کے بعد پیدا ہوئے اور شہر بربادی سے کچھ پہلے جنت کو سدھارے۔ قوم کے مُغل تھے اور صورت کے بھی مغل تھے۔ اور سیرت کے بھی۔ سُرخ و سپید رنگ۔ سُرخی ایسی جیسے بخارا کا شفتالو۔ کشیدہ قامت۔ چوڑا سینہ۔ پتلی کمر۔ ہاتھ پاؤں متناسب۔ آنکھیں گویا نیبو کی پھانکیں جیسی۔ لیکن انتہائی نورانی، ذہانت برستی تھی۔ مسکراتا چہرہ۔ گفتگو کا انداز بانکا۔ جھوم جھوم کر چلتے اور ملنے والوں سے دل سے ملتے۔"

[1] ——— ڈاکٹر غلام یزدانی سابق ناظم آثارِ قدیمہ حیدر آباد نہ صرف مرحوم فرحت اللہ بیگ کے جگری دوست تھے بلکہ ان کے قریبی رشتہ دار بھی۔ یادگارِ فرحت کے نام سے ان کے مرنے کے بعد ایک کتاب بھی ترتیب دے چکے ہیں۔

ابتدائی تعلیم مشرقی طریقہ پر گھر اور مکتب میں ہوئی۔ ہائی اسکول کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد ہندو کالج دہلی سے ۱۹۰۵ء انٹر اور ۱۹۰۹ء مشن اسٹیفنس کالج دہلی سے بی۔اے پاس کیا۔ ایم۔اے کے امتحان میں بھی شریک ہوئے لیکن نامساعد حالات کی بنا پر چونکہ مطالعہ مکمل نہیں ہوا تھا کامیاب نہ ہو سکے۔

اس وقت ڈاکٹر یزدانی کے مطابق اسٹیفنس کالج کی فضا، ذہنی، اخلاقی اور جسمانی تربیت کے لئے بہت اچھی تھی۔ ان کی ذہانت کے باعث ان کے اُستاد ان سے بہت خوش تھے۔ تاریخ کی تحقیق میں انھوں نے بارکورٹ پرائز حاصل کیا۔ مضمون کا عنوان تھا۔ "بڑی بوڑھیوں سے سُنے غدر ۱۸۵۷ء کے حالات" کیمبرج یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ایک انجیل کا مقابلہ ہوتا تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس مقابلہ میں بھی اوّل آئے۔ ——— کالج کی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر یزدانی کے مضمون کا یہ اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"کالج کے اُستادوں میں پادری اے اور پادری اینڈریوز ان پر بہت مہربان ہو گئے۔ یہ دونوں پادری بڑے پایہ کے آدمی تھے۔ اینڈریوز نے تو جو کام ہندوستان کے پیشہ ور غریب لوگوں کی ہمدردی اور اصلاح کے لئے کیا ہے وہ اس ملک کی قومی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ......
پادری اینڈریوز شیکسپیر پڑھاتے تھے۔ اس سال ہنری دی ففتھ (HENRY THE FIFTH) اور مرچنٹ آف وینس (MERICHANT OF VENICE) نصاب میں شامل تھے۔ فرحت اللہ بیگ ہنری دی ففتھ کی یہ تقریر (Come anione into the Grand) ایسے موثر انداز میں جماعت میں سنایا کرتے تھے کہ لڑکے تو کیا پادری اینڈریوز تک کو تعجب ہوتا تھا کہ ایک ہندوستانی لڑکا انگریزی جذبات کو کس خوبی سے ادا کر رہا ہے۔ مرچنٹ آف وینس میں شائی لاک (Shylock) کا پارٹ نہایت عمدہ طور پر کرتے تھے۔ چنانچہ جب کالج کے سالانہ جلسہ میں یہ ڈرامہ کیا گیا تو دہلی کے انگریز حکام اور شہر کے پڑھے لکھے صاحب ذوق لوگوں نے فرحت کی اداکاری کی دل کھول کر داد دی۔ اس ہمت افزائی کا ایسا اثر ہوا کہ مرزا صاحب نے کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر ایک امیچور ڈرامٹک کلب (Amateur Dramatic Club) بھی بنائی۔ جس نے دلی اور اودھ میں شکسپیر کا مشہور ڈراما (   ) نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیا۔ کالج میں مرزا صاحب کی ہر دلعزیزی کا باعث ان کی گیت بازی اور سریلی آواز بھی تھی۔ جاٹوں تک کو بھی جو اس زمانے میں سینٹ اسٹیفنز کالج میں اچھی تعداد میں پڑھتے تھے انھیں کے دیہاتی گیتوں سے محو کر دیتے تھے۔ مجھے دو گیتوں کے بول یاد رہ گئے ہیں۔ پہلا :-

"کلکتہ سے چلا فریزن پانچوں پیر منائے"

فریزن، فریزر کی خرابی ہے۔ یہ دہلی کے ریزیڈنٹ مقرر ہو کر آئے تھے ایک جاٹنی سے عشق ہوا اور اس سے شادی کر لی۔ گیت دیہاتی زبان میں اس واقعہ کے متعلق کہا ہے۔

دوسرا گیت یہ ہے :-

"چلو مارو سپٹنے کے دیس"

اس میں ایک جاٹنی اپنے خاوند کے باہر جانے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے۔

فرحت اللہ بیگ کا کمال یہ تھا کہ ایسے اتار چڑھاؤ سے پڑھتے تھے اور ایسے لہجے سے گاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا سچ مچ کوئی دیہاتن گا رہی ہے"۔

کالج کی چاردیواری سے باہر بھی کھیل کے میدان میں مرزا صاحب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ایک سال تک کالج کی ٹیم کے کپتان رہے۔ گیند اچھی طرح پھینکتے تھے جس میں لیگ بریک تھا۔ بریک کے علاوہ گیند تیز ہوتی تھی اور پچ اکثر یوں کر (   ) اس لئے اچھے کھلاڑی بھی ان کی گیند پر جلد خارج ہو جاتے تھے۔ کرکٹ کا یہ شوق حیدرآباد بھی آ کر رہا۔ چنانچہ ان کی شادی جب مرزا ساجد بیگ صاحب کی بڑی صاحبزادی سے گلبرگہ میں ہوئی تو دوسرے دن براتیوں کی تفریح کے لئے کرکٹ میچ کا انتظام کیا گیا۔ اور اس روز فرحت بیگ نے گیند پھینکنے کا اور فصیح الدین صاحب نے کھیلنے کا کمال دکھا کر حاضرین کو محظوظ کیا"۔ [1]

[1] یادگارِ فرحت صفحہ ۳۹ تا ۴۰۔

اقتباس ذرا لمبا ہوگیا، مگر اس عظیم المرتبت ادیب کی زندگی کا ایک بڑا دلچسپ پہلو آپ کے سامنے آگیا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی طبیعت میں سادگی، اولوالعزمی، محبت اور حسن سلوک کا مادہ بہت تھا۔ مرنجا مرنج آدمی تھے۔ نہ کسی کی برائی کرتے نہ سنتے۔ دربارداری سے گریز تھا۔ صرف انھیں امیروں سے ربط تھا جن سے اُن کے ادبی مذاق کی تشفی ہوتی تھی۔ سیر چشم، کنبہ پرور، نیک نیت اور صداقت پسند بدرجہ اولیٰ تھے۔ معاملہ کے بے انتہا کھرے تھے۔

مرزا رفیق بیگ نے ان کے حسن سلوک کا ایک قصہ یوں بیان کیا ہے:۔

"تنخواہ کا ایک حصہ انھوں نے صرف اس لئے مختص کر رکھا تھا، اکثر بیواؤں اور غریبوں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ تنخواہ آتے ہی پہلے ان کا حصہ بڑے اہتمام سے بھیجا کرتے تھے۔ ایک مرحوم چچا کا ایک پروردہ تھا اس کو ہمیشہ اپنے پاس اس طرح رکھا کہ جب مکان بنوایا تو اس کے لئے ایک کمرہ اور ایک دالان خاص طور پر تیار کرایا تھا اور اس کے رہنے سہنے اور کھانے کپڑے کا انتظام کیا تھا۔ لوگوں کو اکثر مغالطہ ہوتا کہ شاید یہ بھی اسی خاندان کا فرد ہے اس کو ظاہرا جو تنخواہ دیتے تھے اس کے علاوہ چھپا کر بھی ایک خطیر رقم اس کو دیا کرتے تھے۔ لیکن ہمیشہ یہ تاکید کر دیتے کہ تو نے اگر کبھی اس کا کسی سے ذکر کیا تو اسی روز سے یہ بند کر دوں گا۔ کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو کوشش کرتے کہ کسی نہ کسی طرح مدد کیجائے۔ رحمت بھائی ذکر کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور بھائی فرحت کسی صاحب سے ملنے ایک جگہ گئے۔ مغرب کی نماز کے لئے قریب کی چھوٹی مسجد میں جہاں صرف چار پانچ ہی نمازی تھے چلے گئے۔ مسجد کے امام صاحب کی حالت بہت سقیم تھی۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ رحمت بھائی کہتے ہیں کہ نماز کے بعد میں ایک کونے میں بیٹھا وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ بھائی نے نماز پڑھ کے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی اُن کو دیکھ تو نہیں رہا اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکال کر چپکے سے امام صاحب کی جانماز کے نیچے رکھ کر چل دیئے اور شاید دل میں اُنھوں نے یہ سمجھ لیا کہ مجھ سمیت کسی نے ان کو نہیں دیکھا"۔

اسی طرح اُن کی خانگی زندگی اپنی سادگی، مشرقیت اور بے ریائی کے باعث ان کے مزاح کی طرح ہی اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا حال بھی لگے ہاتھوں مرزا رفیق بیگ سے سُنئے:۔

"گھر میں آکا بہت ہی سیدھے سادے طریقہ پر رہتے تھے۔ آرام کرسی یا صوفے وغیرہ پر اُن کو کبھی آرام نہیں ملتا تھا۔ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ جو مزہ لوٹ مارنے میں ہے وہ ان کرسیوں یا صوفوں پر بیٹھنے میں نہیں۔ البتہ رات کو نواڑی کے پلنگ پر سویا کرتے تھے۔ دن میں کبھی پلنگ پر لیٹے جاتے ورنہ زیادہ تر نیچے فرش پر یا تخت پر لیٹے رہتے تھے۔ اگر جاگتے ہوئے تو یا تو کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی یا کسی سے باتیں کرتے رہتے تھے میں نے ان کو خالی کبھی نہیں دیکھا۔۔ دن میں کبھی سونے کو جی چاہتا تو وہیں سو بھی جاتے"۔

"گھر میں لکھنے پڑھنے کے لئے کبھی میز کرسی سے کام نہیں لیا۔ لکھنا ہوا تو اکڑوں بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کر دیا۔ ورنہ عموماً الٹی ٹانگ کو موڑ کر سیدھی ٹانگ کو پھیلا دیتے تھے اور گھٹنے پر پیڈ وغیرہ رکھ کر لکھنا شروع کر دیتے سارے مضامین وغیرہ اُنھوں نے اسی ترکیب سے بیٹھ کر لکھے ہیں۔ جتنے چھوٹے مضامین اُنھوں نے لکھے ہیں، عام طور پر وہ ایک ہی نشست میں پورا لکھ دیا کرتے تھے۔ البتہ تاریخی یا تنقیدی مضامین میں بہت بہت دن لگ جاتے تھے۔ لکھنے کے بعد مضامین میں بہت کم کاٹ چھانٹ کرتے تھے ..... لکھتے لکھتے اگر سوچنے کا موقع آتا تو ایسے وقت اُلٹے ہاتھ کی مٹھی میں اپنی ٹھوڑی کو مضبوط پکڑ کر سوچا کرتے تھے"۔

"میز کرسی پر کھانے میں ان کو مزا نہ آتا تھا۔ جب نیچے دسترخوان پر کھانا کھاتے تو مرنے سے چند سال پیشتر تک اکڑوں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے ـــ کھانا ہمیشہ بہت تیز اور جلدی کھاتے تھے۔ ساتھ بیٹھنے والا اگر کوئی تکلف کرنے والا ہوتا تو اس کو اُن کے اس قدر جلد اُٹھ جانے پر بڑا شش و پنج ہوتا"۔

"ڈاڑھی ہمیشہ اپنے ہاتھ سے مونڈا کرتے تھے۔ ٹھوڑی کی بناوٹ کچھ ایسی ناہموار تھی کہ اس میں مستعد نیچے اونچے ٹیلے اور چٹانیں تھیں بڑی مشکل سے اس جگہ کی صفائی ہوتی تھی۔ ہمیشہ کہیں نہ کہیں سے خون ضرور نکل آتا تھا۔ طبیعت میں جلدی اور گھبراہٹ اوپر سے ٹھوڑی کی عجیب ساخت نے ان کو کبھی اچھی طرح داڑھی بنانے نہ دی"۔

مرزا حسین احمد بیگ نے جن کی سگی چچازاد بہن مرزا فرحت سے بیاہی گئی تھیں اُن کی خانگی زندگی کی ایک جھلک ان الفاظ میں پیش کی ہے :-

"روزمرہ کی زندگی میں سادگی کا اصول ہمیشہ پیش نظر رہا - نمائش اور فیشن کے قائل نہ تھے - لباس پر دھبے ہوں تو پروا نہیں - ٹوپی میلی ہو تو کوئی ہرج نہیں ، اس پر برش مجبوری سے ہوتا تھا - جوتے پر کسی نے پالش کرا دی تو ہوگئی - ورنہ اپنی طرف سے کبھی توجہ نہیں کی - یورپین لباس اور معاشرت کی طرف تو جہ اور رغبت نہیں تھی - ترکی ٹوپی اور شیروانی کے سوا کوئی لباس پسند نہ تھا - قمیص اور بنیائن سے نفرت تھی - جاڑے گرمی اور برسات بلا ایک ململ کے کرتے ہی پر گذار دیتے - پائتابے کی پابندی نہ تھی - خاص خاص موقعوں پر البتہ اس کو استعمال کرتے تھے - گھر کی آرائش کا خیال بہت کم تھا - احباب نے اصرار کر کے ملاقات کا کمرہ مغربی تہذیب کے مطابق آراستہ کر دیا - وہ اکثر بند ہی رہتا تھا - شکایت کرتے تھے کہ لوگوں نے بلا وجہ میرا روپیہ برباد کر دیا "

خانگی حالات اور اس سلسلہ میں اقتباس ذرا طویل ہو گئے ، - لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بغیر مفر نہ تھا - کیونکہ جس ادیب نے نذیر احمد اور وحید الدین سلیم اور اردو کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں کے جیتے جاگتے مرقعے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں ، اس کی ایک جھلک آپ کے سامنے ضرور آنا چاہئے - مضمون کا تنقیدی حصہ میں نے ۱۹۴۷ء میں میں نے مرزا صاحب کے انتقال پر آصفیہ لائبریری میں ان کی جملہ تصانیف کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا تھا

کاش میرے قلم میں اُن کے قلم جیسی عشر عشیر بھی شوخی اور جدت طرازی ہوتی ——— اور میں اُن کی پیکر تراشی میں خوش مذاقی کا اور شوخی کا جلوہ دکھا سکتا -

ہاں تو مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۹۰۷ء میں بسلسلۂ ملازمت دہلی سے حیدرآباد آئے - اس وقت اُن کے کئی عزیز اور قرابت دار یہاں اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے -- اس وقت عزیز مرزا مرحوم ہوم سکریٹری تھے آدمی مردم شناس تھے - مرزا فرحت کی لیاقت اور ذہانت دیکھ کر چادر گھاٹ اسکول میں ہیڈ ماسٹری کی جگہ دیدی - کچھ دنوں کے بعد وہ عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) کے مترجم مقرر ہوئے - اور اپنی قابلیت محنت اور مستعدی کے باعث ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ پر ترقی کرتے رہے - یہاں تک افسپٹنگ آفیسر مقرر ہوئے جس کا عہدہ ہائی کورٹ کے جج کے مماثل تھا -

اُردو زبان وادب کی خدمت کا جو ولولہ اور ذوق بچپن سے تھا وہ ملازمت اور مرتے دم تک قائم رہا - حیدرآباد میں ان کی قائم کی ہوئی اُردو مجلس اب تک ہے - اس کا اجلاس پہلے انھیں کے گھر منعقد ہوا تھا جس میں نواب مقصود یار جنگ بہادر (حکیم مقصود علی خاں) نے آغا حشر کاشمیری پر مقالہ اور انھوں نے غالب کے رنگ میں اپنی ایک غزل بقول مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم لہک لہک کر سنائی تھی - اس کے چند شعر یہ ہیں :-

دل مرا روز ازل سے بیقرار نغمہ ہے	ہر نفس اس کے لئے آواز تار نغمہ ہے
ابر ہے ساقی ہے سے ہے اور زمانہ ساز گار	چھیڑ مطرب وقت کی ہاں اب بہار نغمہ ہے
انقلاب دہر میں جب رنج و غم کا بھی ہے دَوْر	کیوں دل راحت طلب کو انتظار نغمہ ہے

اس کے بعد کوئی (۳۰) گھنٹے اور جیئے - اور دوسرے روز اتوار کو ۲۶ اور ۲۷ اپریل کی درمیانی شب ہنستے بولتے ایسا سوئے کہ پھر نہ اُٹھے -

اُس وقت ان کی عمر کوئی ۶۳ سال ۳ مہینے تھی - مولوی مسعود علی محوی نے تاریخ کہی :-

تھے فرحت بڑے پہلوان سخن ،	زبان و معانی تھے جانِ سخن !
جو وہ اُٹھ گئے - اُٹھ گئی اُن کے ساتھ	بہار زباں ، عزّ و شانِ سخن !
عنادل ، خزاں آگئی باغ میں	گیا بلبلِ گلستانِ سخن !
۱۹۴۷ء	۱۳۶۶ھ

مرزا رفیق بیگ نے لکھا ہے کہ ان کا پہلا مضمون "ہم اور ہمارا امتحان" ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں حیدرآباد کے ایک رسالہ "افادہ" میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر مرزا نظام شاہ لبیب تھے۔ یہ مضمون انھوں نے نام بدل کر شائع کرایا تھا اور جب ۱۹۳۱ء میں مرزا رفیق نے عظمت اللہ خاں مرحوم کے مشورہ پر رسالہ "نمائش" جاری کیا تو ان کے اصرار پر دو ایک مضمون انھوں نے اور لکھے۔ لیکن اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی — مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم نے لکھا ہے کہ "ہم اور امتحان" ان کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اسی طرح مرزا فرحت بیگ نے رسالہ "الحجاب" بھوپال میں کئی مضامین مرزا عصمت اللہ کے نام سے شائع کرائے۔ بہرحال عظمت اللہ خاں کے اصرار پر بھی وہ نام ظاہر کرنے پر تیار نہ ہوئے — تاہم "مرزا الم نشرح" کے نام سے اُن کے مضامین "نمائش" میں چھپتے رہے۔

ابتدائی مضامین "ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی، کچھ اُن کی کچھ میری زبانی" — "نواب صاحب کی ڈائری" "۱۲۶۱ھ کا ایک یادگار مشاعرہ" وغیرہ کی مقبولیت نے ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی۔ اور انھوں نے "مرزا الم نشرح" والی نقاب اُتار پھینکی۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے — آغا محمد اشرف نے اپنے مضمون "دلی کا آخری ادیب" میں لکھا ہے کہ "مرزا فرحت اللہ بیگ کا پہلا مضمون میں نے لکھنؤ کے رسالہ "الناظر" میں پڑھا۔ یہ مئی ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے — رسالہ الناظر میں اُن کا مشہور مضمون "دلی کا آخری مشاعرہ" چھپا تھا — اور مجھے اب تک یاد ہے کہ اس مضمون کی پہلی قسط پڑھنے کے بعد دوسری قسط کا مجھے کس قدر بے چینی کے ساتھ انتظار رہا"

لیکن یزدانی صاحب کے بیان کے مطابق (یادگارِ فرحت صفحہ ۴۴) مرزا فرحت اللہ بیگ نے پہلے "مولوی نذیر احمد کی کہانی" مولوی عبدالحق صاحب بابائے اُردو کے کہنے پر لکھی تھی اور پھر "دہلی کا آخری مشاعرہ" اورنگ آباد کالج جلسے کے لئے لکھا تھا۔ چونکہ انھوں نے جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے باقاعدہ مضمون نگاری ۱۹۳۱ء کے بعد سے شروع کی — جبکہ رسالہ "نمائش" جاری ہوا۔ اس لئے "دہلی کا آخری مشاعرہ" بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں لکھا گیا —

اُردو نظم و نثر کے ارتقا کے ساتھ ساتھ مزاح بھی اپنی گوناگوں اداؤں کے ساتھ محفلِ اردو میں داخل ہوا۔ کہیں سودا کی ہجویات کی شکل میں، کہیں جرأت، انشا اور رنگین کی پھکڑباز شاعری کے قالب میں۔ کہیں داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کے مختلف کرداروں اور کہیں سرشار کے میاں آزاد اور نوابوں کے مصاحبوں کے کارناموں کی صورت میں۔ اور نثر میں اُس کا جلوہ غالب کے رقعات میں موجود ہے۔ لیکن بقول پروفیسر سروری غالب کا انداز شخصی ہوتے ہوئے اتنا گہرا اور لطیف تھا کہ وہ مخصوص ہو کر رہ گیا اور عام نہیں ہو سکا۔ صحیح فنی طور پر اردو میں مزاح نگاری کی داغ بیل انیسویں صدی کے آخر نصف میں "اخبار اودھ" اور بالخصوص "اودھ پنچ" نے ڈالی۔ جسے منشی سجاد حسین اور ان کے رفیقوں نے مشہور انگریزی مزاحیہ اخبار "پنچ" کے نمونہ پر جاری کیا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ اپنے زمانہ کے سیاسی اور سماجی حالات کو موضوع بنا کر مضحک حالات اور واقعات کو پیش کرتے تھے۔ مگر ان کی مزاح نگاری بقول عزیز احمد مقصود بالذات رہ گئی۔ ان کی مزاح نگاری "ہنسنے ہنسانے اور قہقہہ ریزی" سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جو موضوع کے اصلی خط و خال کو بگاڑ کر مضحک الفاظ اور خیالات کے استعمال سے پیدا کیجاتی ہے۔ الفاظ کی یہ شعبدہ بازی بقول پروفیسر عبدالقادر سروری ایک پھلجھڑی ہے جو شرارے اڑاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ یہی حال "اودھ پنچ" کے لکھنے والوں کی ظرافت کا ہوا۔

بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ کچھ تو حالات کی تبدیلی۔ کچھ مغربی ادب کے مطالعہ سے نگاہ و فکر اور ادبی مذاق میں وسعت و بلندی پیدا ہوئی۔ اور مزاح نگاری کا بھی بلند تر اور وسیع تر مفہوم پیدا ہوا۔ بیسویں صدی کے تیسرے دہے (   ) نے اُردو کو چند نامور مزاح نگار دیئے میری دانست میں اس محفل میں صدر نشین کی حیثیت مرزا فرحت اللہ بیگ کو حاصل ہے۔ اپنے موضوع کے تنوع۔ اسلوب کی تازگی و ندرت اور طرز ادا کی شگفتگی اور زبان و بیان کی حلاوت کے لحاظ سے وہ اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ سربلند ہیں۔

رشید احمد نے اپنے "فقرۂ متضاد" اور "علیگڈھ" کو عجیب دے کر ایک بڑے اچھوتے اور ذہنی معیار کا رنگ پیش کیا ہے۔ مگر ان کے مزاح میں آورد اور تصنع ہے جیسے کوئی روتے ہوئے کو زبردستی ہنسانے کی کوشش کرتا ہے — پطرس کے یہاں ذہنی بلندی اور معصومیت پائی جاتی ہے

مگر زبان کی شگفتگی اور انداز بیان کی وہ فنکاری جو دل کو موہ لیتی ہے مفقود ہے۔ ان کے مضامین کو پڑھ کر ان کے کرداروں سے ایک خاص ذہنی بُعد محسوس ہوتا ہے۔ عظیم بیگ چغتائی نے شریف مسلمان گھرانوں کی پردہ دار شریر لڑکیوں اور لڑکوں کی عشقیہ داستانوں کو اپنا موضوع بنا کر بقول پروفیسر عزیز احمد "جنسی بُعد کو کم کرنے کی کوشش کی ہے" مگر ان کی تحریروں میں ایک خاص قسم کی یکسانیت اور سپاٹ پن اور سطحیت کا احساس ہوتا ہے۔

ملا رموزی اپنی "گلابی اُردو" کے باعث خاصے مشہور اور مقبول ہوئے۔ ان کا موضوع بھی زیادہ تر سماجی اور سیاسی ہے۔ مگر میری رائے میں ان کو طنز نگار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یوں بھی ان کی متعدد بیویوں کی بار بار دخل در معقولات ایک خاص قسم کا تنفر پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن مرزا فرحت اللہ بیگ اپنی فنکارانہ چابکدستی میں ان سب میں فوقیت رکھتے ہیں۔

پروفیسر سروری نے کتنا اچھا محاکمہ کیا ہے:۔

"مرزا فرحت اللہ بیگ کی تحریروں کو جب ان سے پہلے کے مزاح نگاروں کی تحریروں کے مقابلہ میں رکھ کر پڑھتے ہیں تو ہم کو اظہار اور خیال ہر لحاظ سے ایک نئی دُنیا نظر آتی ہے ـــ سب سے پہلی نمایاں خصوصیت جو مرزا صاحب کے مضامین میں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب بعض اور مزاح نگاروں کی طرح قہقہے بلند کرتے ہوئے انشا کے میدان میں نہیں اترتے۔ بلکہ وہ نہایت متین اور سنجیدہ لب و لہجہ بنا کر سامنے آتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ سنجیدگی معنی خیز ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی کامیابی و اثر کا یقین ہو جانے کے بعد وہ کبھی کبھی پہلا طریقہ بھی اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن سنجیدگی ان کی خوش مذاقی کی ایک خصوصیت بن گئی ہے اُن کی سنجیدگی اور ان کی خوش مذاقی کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہے۔ ان کی سنجیدگی میں مزاح پوشیدہ ہے اور مزاح میں سنجیدگی۔

ان کی نظر گہری اور ان کا مشاہدہ وسیع تھا۔ ان کا دل فراخ اور ان کی فطرت معتدل تھی ـــ جوں جوں ہم ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے جاتے ہیں ہماری یہ رائے قوی ہوتی جاتی ہے ـــ ان کے یہاں بلند قہقہہ نہیں۔ لطیف تبسم ہے۔ ان کے الفاظ شستہ اور ان کا طرزِ کلام شائستہ ہے۔ عظمت اللہ خاں مرحوم نے "ایک نواب کی ڈائری" پر جو نوٹ لکھا ہے اس میں لکھتے ہیں:۔

"ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک طرح کی بشاشت۔ یا زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیے کہ ایک نفسی انبساط ہے اگر دل و دماغ پر ایک انبساطی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مُسکراہٹ کھیل جائے اور ایک آدھ مرتبہ قارئین پھول کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑیں تو ایسا مضمون خوش مذاقی کا بہترین نمونہ ہوگا" ـــ

یہ خوش مذاقی کی بہترین تعریف ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کی تمام مزاح نگاری چند مخصوص مثالوں کے سوا، اس معیار کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کا فرحت بیز قلم نت نئے موضوع پر گُل کھلاتا اور قارئین کے انبساطِ روح کے سامان بہم پہنچاتا چلا جاتا ہے۔

اُنھوں نے ہمارے معاشرہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اونچے نیچے اور درمیانی ہر طبقہ کو پرکھا ہے۔ حاکم محکوم اور آزاد ہر گروہ کا جائزہ لیا ہے۔ قدامت پرست اور جدت پسند سب کی دانائیوں اور نادانیوں کو پیش کیا ہے۔ لیکن کبھی کہیں بھی تو ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ لکھنے والا تھک گیا ہے۔ یا پڑھنے والا اُکتا گیا ہے۔ بلکہ ہر مرتبہ ایک نئی کشش محسوس ہوتی ہے۔ طرزِ ادا کی لطافت۔ زبان کی سلاست اور الفاظ کی فصاحت ہر جگہ ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتی ہے۔!

پروفیسر اعجاز نے ان کے متعلق بہت صحیح لکھا ہے:۔

"مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے مضامین کو خاص ذکاوت و انشا پردازی سے اتنا دلکش بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد بھی غیر معمولی شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔ زبان کی لطافت۔ جملوں کی دل چسپی اور زورِ طبیعت مجموعی حیثیت ایسی فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں معنی خیز تبسم کی ایک لہر دوڑتی نظر آتی ہے"

ان کے یہاں بے جا عبارت آرائی اور محاورہ بندی نہیں ملتی۔ وہ الفاظ کے تانے بانے سے مزاح اور ظرافت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اظہار واقعہ کے ضمن میں ادبی لفظی صنعت کا استعمال بس اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ کھانے میں نمک۔ اس لئے کہیں تصنع یا آورد کا احساس نہیں پیدا ہوتا۔ انھیں جزئیات نگاری پر ایک قدرتِ کاملہ حاصل ہے۔ ہمیں ان کے یہاں موضوع اور ماحول سے حیرت انگیز قدرت کا احساس

ہوتا ہے۔ ان کے یہاں جو کچھ ہے "دیدہ" ہے۔ "شنیدہ" کا لفظ ان کے یہاں معدوم ہے۔ وہ اپنے موضوع اور ماحول کے ایک ایک رخ پر بڑے اعتماد سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس کے ایک ایک رُخ کو بڑے یقین کے ساتھ اُجاگر کرتے ہیں۔ ان کی شہرت اور عظمت کی بنیاد "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی" ۔ "دلّی کا یادگار مشاعرہ" اور "پھول والوں کی سیر" پر ہے۔ ان مضامین کی قبولیت نے انھیں بقائے دوام کی سند دیدی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کی طرح، انھوں نے وحید الدین سلیم، لالہ سری رام اور عظمت اللہ مرحوم پر بے باکانہ اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی میں انھوں نے کردار نگاری کا ایک نادر نمونہ اُردو ادب میں پیش کیا ہے۔ عقیدت اور شوخی کا ایسا متوازن امتزاج مشکل سے کہیں نظر آئے گا۔ اپنے استاد ڈپٹی نذیر احمد کا تذکرہ بڑے خلوص اور صداقت و بے باکی سے کیا ہے۔ ان کی شکل و شباہت وضع زندگی، عام انسانی زندگی کے پہلوؤں، اس کی بھلائیوں اور برائیوں کا نقشہ نیم مزاحیہ اور نیم سنجیدہ انداز میں انتہائی جاندستی سے کھینچا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی یہ سوانح عمری پڑھنے کے بعد ہم اس عظیم المرتبت ادیب و انشا پرداز سے مرعوب نہیں رہتے بلکہ اس کی سادہ انسانیت سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ مرزا فرحت کو اپنے استاد کے مرنے کا غم ہے لیکن اُن کی سیرت نگاری میں شوخی و مزاح اس لئے ترک نہیں کرتے کہ وہ خود ایک خوش مذاق آدمی تھے۔ لکھتے ہیں :-

"میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں۔ کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائے گی۔ لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانحعمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ کی اس قسم کی کردار نگاری کی تشریح اور تفہیم کے سلسلہ میں عزیز احمد نے لکھا ہے :- کہ

"اس مضمون میں مرزا صاحب کی تحریر اور کردار نگاری کی شوخی دراصل محبت کی شوخی ہے۔ یہ اسلوب کی بے تکلفی کی وجہ سے ادب بن گئی ہے۔ زبردستی کی ظرافت نہیں ہے۔ اس مضمون کی ہیئت اور تکنیک ادب اور حیات دونوں کے اعتبار سے انوکھی اور غیر معمولی ہے۔ کہانی کا حصہ نذیر احمد کی زبانی ہے اس میں ظرافت کی نوعیت مختلف ہے۔ کیونکہ وہ نذیر احمد کی ظرافت ہے۔ اس ظرافت اور اپنی شوخی میں فرق قائم رکھنا فرحت اللہ بیگ کے اسلوب کا بڑا کمال ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے کہ کیوں نذیر احمد یا سلیم یا دوسرے مشاہیر اہل قلم کی تصویریں مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضامین میں اس قدر زندہ اور جیتی جاگتی نظر آتی ہیں، تو مصنف کی فطری استعداد اور قوت مشاہدہ کے علاوہ ایک وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے ——— عام طور پر مشرق کا قاعدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد مرنے والے کی تمام کمزوریاں بھلا دی جاتی ہیں۔ صرف ان کی اچھائیاں یاد رکھی جاتی ہیں۔ یہ عفو اور درگذر نہ صرف اخلاقی بلکہ سماجی نقطۂ نظر سے جائز اور مفید ہے۔ مشاہیر کے احسانات یا ان کی خدمتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ لیکن اس میں ایک نقصان بھی ہے اور وہ یہ کہ مرنے والے کی جیتی جاگتی تصویر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ چند خصوصیات اور احسانات باقی رہ جاتے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نہ صرف مرنے والوں کی کمزوریوں کو یاد رکھا بلکہ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا۔ اُردو کے مشاہیر کی زندگی کو جتنا وہ جانتے تھے اتنا ہی ان کا ذکر بلا کچھ چھپائے ہوئے انھوں نے بلا رو رعایت کیا ہے اور مرنے والوں کی چلتی پھرتی تصویریں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی ہیں۔

"سنہ ۱۹۶۱ء میں دہلی کا یادگار مشاعرہ" ——— دہلی کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔ علما، شعرا اور دوسرے اہل قلم حضرات کی باہمی تعظیم و تکریم، سخنورانِ دہلی کی حریفانہ کش مکش اور بادشاہ سلامت کی معرفت پروری، ان کے حلیے، لباس، طرز معاشرت، ان کے مزاج و وضعداری کو نہایت چابکدستی سے پیش کیا۔ قلعہ معلّٰی کے آداب۔ قصر شاہی کے بہت سے حصوں کے ناموں۔ مختلف تقریبوں اور بہت اصطلاحات کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے ساحرانہ فن کاری کے ساتھ دہلی کے آخری دور کے سربرآوردہ شعراء، غالب، ذوق، مومن، شیفتہ، آزردہ، بہادر شاہ اور داغ کی چلتی پھرتی تصویریں ہمارے سامنے کھڑی کر دی ہیں۔

"پھول والوں کی سیر" بھی ان کا ایک عظیم ادب پارہ ہے۔ دہلی کے ایک ایک ذرّہ سے انھیں محبت ہے۔ قلعہ معلّٰی، تاج گنج۔ قطب صاحب اور دہلی کی دوسری سیر گاہوں کا ذکر بڑے ہی حسرت سے کرتے ہیں۔ بادشاہ کی حکومت اگرچہ ملک پر نہیں لیکن دلی کے دل پر اب تک ان کی حکومت ہے۔

"رعایا کی کونسی خوشی تھی جس میں بادشاہ حصہ نہ لیتے ہوں۔ اور بادشاہ کا کون سا رنج تھا جس میں رعایا شریک نہ ہوتی ہو۔" پھول والوں کی سیر بھی اسی باہمی محبت کا نتیجہ تھی۔ مرزا جہانگیر قید سے چھوٹ کر آئے تو شہر والوں نے خوشی منائی۔ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر اظہارِ مسرت کیا۔ کئی دن تک قطب میں میلا رہا۔ بادشاہ سلامت بھی اس میں شریک رہے۔ اُس وقت سے برابر یہ میلا قائم ہونے لگا۔

یہ دونوں مضامین سماجی نقاشی کے عظیم الرشہ کارنمونے ہیں۔ میرے خیال میں اگر مرزا فرحت اللہ بیگ مزاح نگاری نہ بھی کرتے تو یہ انھیں زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ ان کا دل بھی مشرقی اور دماغ بھی مشرقی تھا۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے مشرقی زاویۂ نگاہ سے سوچتے تھے۔ اور کہتے بھی مشرقی اسلوب سے۔ اکبرالہ آبادی کی طرح وہ بھی مغربیت کے مخالف تھے۔ "صاحب بہادر" میں ایک ایسے نوجوان کا مضحکہ اُڑایا ہے جس پر "صاحبیت" کا بھوت سوار ہے۔ لیکن وہ خود کندۂ ناتراش ہے۔ ٹائی باندھنے میں۔ سوٹ پہننے میں اور انگریزی طریقہ پر کھانا کھانے میں ایسی مضحک حرکتیں کرتا ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجاتے ہیں۔

——— اسی طرح "بہرا" ایک نمائندہ قسم کا کردار ہے۔ اس اہم شخصت اور اس کے فن اور پیشے کے اسرار و غوامض کو جس طرح مزے لے لے کر اور جس بے ساختہ شوخی اور تفصیل کے ساتھ مرزا صاحب نے بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ یہ ایسا بہرہ ہے جو اپنے فن میں کامل اور اپنے پیشے میں کامیاب ہے۔" ———

برطانوی دور کے آئی سی۔ ایس افسروں پر کس مزے سے تنقید کرتے ہیں:۔

"اگر آئی۔ سی۔ ایس والے نہ ہوتے تو ہندوستان کا کام کیسے چلتا۔ اور اگر ہم بہرا لوگ نہ ہوتے تو یہ بے چارے آئی۔ سی۔ ایس کہیں کے نہ رہتے۔ سچ یہ کہ ہندوستان کی باگ ان کے ہاتھ میں ہے اور ان کی باگ ہمارے ہاتھ میں۔"

اس طنز کا مزہ وہی لوگ لے سکتے ہیں جو ان آئی۔ سی۔ افسران کی ذہنیت سے واقف ہوں اور جنھیں کچھ قریبی تجربہ کا موقع بھی ملا ہو۔ اگرچہ وہ خود مشرقی تہذیب کے ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر وہ اس کی برائیوں سے بھی واقف تھے۔ اور جا بجا خوش مذاقی میں اس پر تنقیدیں کرتے ہیں۔ "ایک نواب صاحب کی ڈائری"۔ "مشرق اور مغرب کی ٹکر"۔ "آزاد نگار ستان اور دادا جان"۔ اس قسم کے بہترین مضامین ہیں۔

ان کی نظر گھریلو معاملات۔ خصوصاً میاں بیوی کے تعلقات پر گہری تھی۔ زن و شوہر کے باہمی مناقشات کے متعلق انھوں نے نہایت صحت مند محاکمہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر میاں بیوی اپنے اپنے حدود میں فرائض انجام دیتے رہیں در ایک دوسرے کی دل جوئی کا خیال رکھیں تو کوئی وجہ نہیں کہ زندگی سکون سے بسر نہ ہو۔

"بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر" میں اسی خیال کو ظاہر کیا ہے۔

"بیوی" ان کا ایک بہت مشہور قصہ ہے، جس میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے کہ بدصورت بیوی اپنے حسنِ سیرت و سلوک سے شوہر کو اپنا پرستار بنا سکتی ہے۔ گویا ظاہری صورت سے زیادہ بہتر اندرونی حسن ہے۔ یہ غلط قسم کے برخود حسن پرست مردوں کی شکست کا بھی اعلان ہے!———

جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے۔ ان کی مزاح نگاری کا مقصود تفریح اور اصلاح دونوں تھا ——— وہ انسانوں کی نادانیوں پر مسکراتے ہیں۔ مگر اس کی تحقیر اور اس سے نفرت نہیں کرتے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آہ! بے چارہ انسان" کہتے کہتے رُک جاتے ہیں۔ میرے نزدیک اُن کے فن کی عظمت کا بھید سب سے بڑا راز ہے!!!———

ابتدائی زمانہ میں انھیں مصوری کا بھی شوق تھا۔ لیکن ہائی کورٹ کی ملازمت کے کچھ دنوں بعد مصروفیت کے باعث یہ مشغلہ ترک کرنا پڑا۔ ڈرامے اور ایکٹنگ کا شوق بچپن سے تھا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دہلی میں ایک ڈرامہ کلب بھی قائم کیا تھا۔ اور

حیدرآباد میں بھی یہ دلچسپی قائم رہی۔ جب مولوی عبدالحق صاحب نے اورنگ آباد کالج ڈے کے موقع پر ان کا لکھا ہوا "دہلی کا آخری مشاعرہ" اسٹیج کیا تو یہ اس کے اسٹیج ڈائرکٹر تھے۔

کئی ڈرامے بھی لکھے، جس میں ایک ڈرامہ "خان بہادر" اسٹیج بھی ہوا۔ لیکن اس طرف زیادہ دن توجہ مبذول نہ رکھ سکے۔ ورنہ شاید اس میدان میں بھی اپنا نام اور مقام پیدا کر لیتے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ شاعری بھی کرتے تھے۔ کیوں نہ کرتے، شاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کے خاندان کے اکثر افراد صاحبِ دیوان تھے۔ اور کئی ممتاز شعراء غالب، مومن، خواجہ ، حکیم آغا جان عیش اور سعادت یار خاں رنگین سے قریبی رشتہ تھا۔ بچپن ہی سے شعر کہتے تھے۔ تیز کہتے تھے اور پُرگو تھے۔ نظم، غزل، ریختہ، ریختی اور ہجو سبھی کچھ لکھا لیکن کوئی بلند پایہ مقام پیدا نہ کر سکے۔

یہ بات مزاح نگاری کے بعد اُن کے لئے تحقیق اور تنقید کے میدان میں منتظر تھی۔ اگر وہ مزاح نگاری نہ بھی کرتے تو بھی اُن کا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ اتنا تخلیقی ہے کہ انھیں سندِ دوام عطا کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ زبان و ادب کے بہت اچھے عالم تھے اعلیٰ درجہ کے محقق اور تنقید نگار تھے۔ ان میں تحقیق و جستجو کی ایک خاص لگن تھی۔ خطبۂ صدارت اُردو سوسائٹی ۱۹۳۰ء بمقام مدراس، تاریخ زبان و ادب کے متعلق مبسوط اور فاضلانہ خطبہ ہے۔ اہلِ زبان کے غرور، مختلف اصنافِ سخن اور جدید شاعری کے بارے میں ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

انعام اللہ خاں یقین ۔ حکیم آغا جان عیش ۔ خواجہ بدر الدین خاں امان ۔ عبدالرحمٰن خاں احسان اور نظیر اکبرآبادی پر انھوں نے جو مبسوط طویل اور تحقیقی مقالے لکھے ہیں وہ بقول پروفیسر زور تخلیقی تحقیق کا بیش بہا خزانہ ہیں۔ عام طور پر اُردو میں تذکرہ نویسی کا فن بہت ناقص رہا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اشعار پر تبصرے زیادہ کئے ہیں اور شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کی صحت کے بارے میں کم دھیان دیا۔ اسی ان شعراء کے مرتبہ اور حالات کے بیان میں بہت سی کوتاہیاں اور ناانصافیاں بھی اور کوتاہیاں بھی ہوئیں۔ جس کا سب سے بڑا نمونہ آبِ حیات ہے۔ جیسے اردو ادب کی تاریخ نویسی میں کئی وجوہ سے افضلیت حاصل ہے۔ انھوں نے یقین کے دیوان کو جس محنت اور احتیاط سے مرتب کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جگہ جگہ سے قلمی نسخے جمع کئے اور (۱۳) نسخوں کے تقابلی مطالعہ کے بعد ایک مکمل اور صحیح نسخہ تیار کیا۔ اور بلا مبالغہ سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں اور یقین کے خاندانی حالات اتنی شرح و بسط سے معلوم کئے کہ دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔

اسی طرح حکیم آغا جان عیش پر ان کا تحقیقی مضمون اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنفِ آبِ حیات کی ذہنی عصبیت، طرفداری اور غلط بیانیوں کی تردید ہر قابلِ حصول ذریعے سے کی ہے اور اس کے بعد ان کے کلام کے تجزیے سے ثابت کیا ہے کہ آغا جان عیش اور ہدہد کے کلام میں کوئی ربط و تعلق نہیں تھا۔

اسی طرح خواجہ بدر الدین امان کی تو گویا بقول پروفیسر سروری بازتخلیق کی ہے ۔ ان کا مضمون نظیر اکبرآبادی پر سب سے زیادہ طویل اور مبسوط ہے۔ انھوں نے ہر قابلِ ذکر اور قابلِ حصول ذریعے سے ان کے حالات معلوم کئے۔ مولوی محمد حسین آزاد اور دوسرے تذکرہ نویسوں کی غلط بیانیوں کا بھانڈا پھوڑا، ان کے خانگی حالات، ان کی زندگی۔ ان کا حلیہ، ان کی وضع قطع، ان کے مذہب اور سماجی تعلقات غرضیکہ ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کی توصیف میں انھوں نے مبالغہ کیا ہے جس سے اختلاف ہے۔ نظیر اپنی نیچرل اور سماجی شاعری کے باعث (جو ان کی نظموں پر مشتمل ہے) بڑی عزت اور پایہ کے مستحق ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستانی عوام کے مزاج اور مذاق کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ لیکن غزل کا اپنا ایک مزاج اور فن ہے۔ اس کے پیشِ نظر نظیر کی غزلیں کمتر درجہ کی ہیں۔ ان کو میر و سودا اور دوسرے شعراء کے مقابلے میں لانا ایک اجتہادی غلطی ہے۔

فرحت اپنے گھر میں

• علی احمد حذقی

• اپنی روزانہ زندگی میں

ایک مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم گرامون فون بجا رہے تھے ——— نہیں گراموفون بجتے بجا رہے تھے مرزا صاحب صرف سُن رہے تھے "اشربو! اشربو!" ——— گراموفون ریکارڈ کہہ رہا تھا۔ اور مرزا صاحب سوچ رہے تھے۔ قافیہ بُرا نہیں۔ اس پر نظم لکھی جائے تو مزا آجائے ———

اُردو ادَب کی تاریخ میں مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا نام ہمیشہ یاد گار رہے گا۔ گزشتہ ربع صدی میں انھوں نے اپنے افسانوں کہانیوں اور تنقیدی مضامین سے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مذاق کے پیرایہ میں بڑے پتہ کی باتیں کہہ جاتے۔ اُن کے نزدیک ظریف کے معنی ہنسوڑ ے مسخرے، یاوہ گو اور بھانڈ کے نہیں تھے۔ بلکہ اُن کا ایقان تھا کہ ظرافت خوش طبعی اور ذہانت کا دوسرا نام ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ہماری حماقتیں اور عیوب دلکش طریقے سے بتائے جائیں اور سیاسی۔ سماجی اور معاشرتی اصلاح دلچسپ پیرائے میں کی جائے۔ ظرافت میں تو مذاق شستہ۔ پاکیزہ اور صاف ستھرا ہونا چاہئے۔ کیا بات ہوئی کہ بھانڈوں کی طرح ظرافت کے میدان میں اترائیں۔ کبھی پیٹ پُھلایا۔ کبھی پچکایا اور کبھی نیم برہنہ ہو کر تھرکنے لگے۔ اگر اسی کا نام ظرافت ہے تو اس ظرافت کو دور ہی سے سلام ہے۔ ان کے بھائی مولوی عصمت بیگ مرحوم نے جب اعتراض کیا کہ یہ نئی قسم کی ظرافت ہے کہ اُردو بھی سلیس اور بامحاورہ ہو۔ میدانِ سخن میں فصاحت کا گھوڑا دوڑتا رہے۔ کسی کی توہین بھی نہ کی جائے۔ رکیک اور سوقیانہ الفاظ بھی نہ آئیں۔ خواہ مخواہ لطیفے اور چٹکلے بھی نہ ٹھونسے جائیں۔ اُلٹی۔ سیدھی اور بے تکی باتیں بھی نہ کی جائیں تو پھر سیدھی سادی باتوں میں ظرافت کدھر سے آئے گی اور اس قسم کی باتوں سے لوگوں کو ہنسی کیسے آئے گی۔ مگر فرحت اللہ بیگ برابر یہ کہتے رہے کہ بڑا کمال تو یہی ہے کہ واقعات سے مذاق پیدا کیا جائے اور واقعات کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ پڑھنے والے کو گدگداتے رہیں اور اس کے دل و دماغ پر ایک انبساطی کیفیت پیدا کرتے رہیں۔ وہ کہتے تھے کہ تم مثلاً کسی بناوٹی آدمی کے حالات بیان کرو۔ کسی افیونی کو لو یا کسی بگڑے ہوئے نواب یا غائب دماغ پروفیسر کے حالات بیان کر دو پھر دیکھو۔ اسے پڑھ کر کون خوش نہیں ہوتا۔ جب اُن کی وضع قطع اور صورت شکل دیکھ کر ہنسی آجائے تو پھر اُن کے تحریری چٹکلے اور واقعات کی تصویریں دیکھ کر نہ ہنسنے کے کیا معنی ہیں۔

مرزا صاحب کی مزاحیہ نگاری کا مقصد کیا تھا اس کو معلوم کرنا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ انھوں نے اس بات کی صراحت کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"مضامین لکھنے میں میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک تو وہ پُرانے واقعات تحریر میں آجائیں جو بزرگوں کی زبانی مجھ تک پہنچے ہیں تاکہ کچھ دن بعد نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ ان اہلِ قلم حضرات کے واقعات قلمبند ہو جائیں جنھوں نے زبان اُردو کی اصلاح میں اپنی عمریں صرف

کریں۔ تیسرے یہ کہ اُردو زبان میں خوش مذاقی کے ذریعے اصلاح معاشرت کا پرچار کیا جائے۔ جہاں مرزا صاحب نے اپنے مضامین میں ہماری سماجی خرابیوں کا جائزہ لیا ہے وہیں اُن کے قلم نے واقعات کے حقیقی خد و خال کو اس طرح لوگوں کے سامنے پیش کر دیا کہ وہ ہنستے ہنستے اُس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اُن کی حالت اس کارٹونسٹ کی سی ہے جو اپنے کارٹون کے ذریعے گھڑی بھر کے لئے لوگوں کو ہنساتا ہے لیکن اس میں چھپے ہوئے طنز دیکھنے والے کو حالات کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ نقاد کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ کبھی کسی کو خوش نہیں کر سکتا۔ لیکن فرحت کی طنز میں ڈوبی ہوئی اصلاحی تحریروں کا لوگوں نے ہمیشہ ہنستے ہنستے خیر مقدم کیا اور ہنسی کا دور ختم ہوا تو انھیں محسوس ہوا کہ زندگی کی حماقتوں کو دلچسپ انداز میں پیش کر کے فرحت نے سماج کے دُکھتے ہوئے گال کو پہلے تو سہلا دیا لیکن بعد میں بھرپور طمانچہ جڑ دیا۔ ظرافت اور خوش مذاقی تو فرحت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ ہر چیز کو ظریفانہ رنگ میں رکھتے تھے اور اُسے ایسے دلچسپ اور لطیف پیرائے میں بیان کر جاتے تھے جس کو سُن کر خوشی اور مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ ان میں ہر چیز اور کیفیت کو پوری توجہ سے دیکھنے اور ہر بات کو دل سے سننے کا ذاتی ملکہ تھا۔ اُن کی ہر بات میں بے ساختہ پن اور ظرافت ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ بچے گراموفون بجا رہے تھے۔ کسی نے علی حسین نابینا کا گایا ہوا ریکارڈ "اشرپو۔ اشرپو!" لگا دیا۔ بس مرزا صاحب کو جوش آ گیا۔ قلم دوات لے کر بیٹھے اور اسی وقت دس بارہ بند کہہ ڈالے۔ دو ایک بند آپ بھی سُن لیجئے:۔

اس دِل میں ہے بس اک یہی آرزو، سب بھرے میکدے کے ہوں جام و سُبو
اور کہے مجھ سے وہ ساقیٔ شعلہ رُو میں بھی دیکھوں بھلا کتنی پیتا ہے تو

اشرپو۔ اشرپو۔ اشرپو۔ اشرپو

ایسا دیکھا نہ ہوگا تماشہ کوئی، ہے قیامت جو رہ جائے تشنہ کوئی
ختم ساقی نے کر دی ہے دریا دلی دوش پر خم ہے اور یہ صدا کو بہ کو

اشرپو۔ اشرپو۔ اشرپو۔ اشرپو

شاعری اُنھیں کیسے آئی۔ یہ ایک معمہ ہے۔ نہ تو وہ کسی کے شاگرد تھے اور نہ شاعری کے معاملہ میں اُستادی شاگردی کے قائل تھے۔ کہتے تھے میاں یہ بھی کوئی گانے کا فن ہے کہ کہیں اُستاد نے گٹکری بتا دی اور کہیں سُر تال درست کر دیا۔ شاعری تو ایک کیفیت ہے جو دل پر طاری ہوتی ہے اور شاعر اپنی زبان میں ادا کر جاتا ہے۔ اب رہے زبان اور محاورے تو اس حد تک خیر اُستاد ہاتھ بٹا سکتا ہے ورنہ شاعری کے لئے تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔

مرحوم تابڑ توڑ مضمون پہ مضمون لکھنے لگے اور دھڑا دھڑ مضامین نئے حصوں پر حصے چھپنے لگے تو بعض اہلِ قلم جل اُٹھے اور ان کے خلاف محاذ تیار کرنے لگے۔ مرحوم کو سب خبر تھی۔ لیکن ایک لفظ بھی زبان پر نہ لاتے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ مرزا صاحب آپ نے اپنے متعلق کچھ اور بھی سنا فلاں صاحب نے آپ کے متعلق یہ ریمارک کیا کہ فرحت اللہ کو تو ہیضہ ہو گیا ہے۔ ہنس کر کہنے لگے کہ اگر یہ بات ہے تو بابا ہم دُنیا کے ادب سے جاتے ہیں۔ خدا کے واسطے تم ہی زندہ رہو اور تحریر کے قبض میں مبتلا رہو۔

ایک مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ عزیز مرزا۔ اور وحید الدین سلیم باتیں کر رہے تھے۔ اتفاقاً فرحت مرحوم کا ایک ضروری کاغذ کھو گیا۔ بہت ڈھونڈھا مگر وہ نہ ملا۔ فرحت مرحوم سخت پریشان تھے۔ اتفاقاً اس کاغذ پر مولانا وحید الدین سلیم کی نظر پڑ گئی۔ انھوں نے فوراً اپنے ہاتھ کے نیچے چھپا لیا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ فوراً بھانپ گئے۔ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا بزرگوں کا قول صحیح ہے کہ جو چیز گم ہو جاتی ہے اس کو شیطان اپنے ہاتھ کے نیچے دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ذرا دیکھنا تو میرا کاغذ آپ کے ہاتھ کے تلے تو نہیں ہے۔

ایک صاحب مرزا صاحب سے مذہبی مسائل پر گفتگو کر رہے تھے اور مرزا صاحب خاموش سُن رہے۔ ایک موقع پر مرزا صاحب کو مخاطب کر کے بولے کہ اچھا مرزا صاحب جس وقت صحابۂ کرام میں خلافت کا جھگڑا اُٹھا تھا اگر آپ وہاں ہوتے تو کس کی تائید

کرتے۔ مرزا صاحب نے کہا مجھے کسی کی خلافت سے کیا مطلب۔ میں اگر وہاں ہوتا تو اپنی ہی خلافت کا ڈنکا بجاتا۔

جب مرحوم ناظم ثالث سوم عدالت پر ناظم مقرر ہوئے تو ایک صاحب نے مبارکباد پیش کی اور پوچھا کہ آپ کہاں کی نظامت پر گئے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں تھرڈ کلاس مجسٹریٹ بن گیا ہوں۔

ایک مرتبہ مشاعرہ میں آغا شاعر نے غزل پڑھی۔ لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر تعریف کی۔ خصوصاً اس شعر کو تو بار بار پڑھوایا:-

ہر بن مو پر رکھے ہیں اس نے تلواروں کے منہ
کر رکھا ہے اس نے دامن چاک چاک کے لئے

مشاعرہ ختم ہونے پر فرحت آغا شاعر سے کہنے لگے کہ میاں تمہارا شعر تو بلبلا سا ہے۔ اس کا تو کوئی مطلب ہی نہیں۔ پھر چاک پہ چاک دامن تو میں نے آج تک نہیں سنا۔ ہاں پلک بچکیاں تو بولتے ہیں۔ آغا صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ لوگوں کو آزمانے کے لئے دو ایک ناسخ کے رنگ کے بھی ہونے چاہئیں تاکہ اہل مشاعرہ کی سخن فہمی کا اندازہ ہو سکے۔

حکیم معشوق علی خاں جوہر کی محفل میں فرحت اللہ بیگ۔ خورشید حسن قادر اور عصمت اللہ بیگ کے علاوہ اور بھی شعراء موجود تھے کسی نے سنگلاخ زمین میں شاہ نصیر کی کہی ہوئی وہ غزل سنائی جس کا مصرع یہ ہے:-

نہاں ہے کب چشم بر بشر سے، فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

فرحت اٹھ کے ٹہلنے لگے اور پھر گھر چلے گئے اور کوئی دس بارہ شعر لکھ کر لے آئے۔ بہر حال اس غزل کی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ ایک صاحب کو جوش آگیا انھوں نے عصمت اللہ بیگ مرحوم کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ نے کوئی کمال نہیں دکھایا مشکل سے مشکل طرح عصمت کو دو اگر وہ غزل نہ لکھے تو آپ اس کی ناک کاٹ لینا۔ فرحت مرحوم نے کہا کہ اگر اس قسم کی دو چار شرطیں آپ بدیں گے تو چند روز میں خدا نے چاہا تو اس کی ناک جڑ سے غائب ہو جائے گی۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ فصاحت جنگ جلیل کے مکان پر اختر یار جنگ۔ فرحت اللہ بیگ اور دوسرے شعرا بیٹھے ہوئے تھے۔ اختر یار جنگ نے ایک شعر پڑھا جس میں فکر کو مونث باندھا گیا تھا۔ استاد جلیل نے فرحت سے پوچھا آپ فکر کو مونث باندھتے ہیں یا مذکر۔ کہنے لگے کہ میں دونوں طرح باندھتا ہوں۔ پوچھا وہ کیسے تو کہنے لگے کہ جب دیکھتا ہوں کہ واقعی کوئی زبردست فکر آپڑا ہے تو اسے مذکر باندھتا ہوں اور اگر کوئی چھوٹی موٹی فکر ہوتی ہے تو اسے مونث سمجھ کر استعمال کرتا ہوں۔

ایک صاحب مرزا صاحب کے پاس تشریف لائے اور انھوں نے اپنی کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کی۔ اس کے دو چار مضمون دیکھے پھس پھسے سے تھے۔ کہنے لگے میاں مقدمہ تم خود لکھ ڈالو اور میرے نام سے چھپوا دو۔ کہا آپ کا رنگ کیسے آئے گا۔ کہنے لگے میرے رنگ کی فکر مت کرو۔ تم ایسا رنگ اختیار کرو جس میں تمہارا رنگ جم جائے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب سر ہو گئے کہ فلاں عنوان پر ایک مزاحیہ مضمون لکھ دیجئے۔ کہنے لگے میاں تم خود لکھو۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے سوچتے کیا ہو۔ اس طرح شروع کرو، یہ لکھو اور یوں ختم کرو۔ کہا یہ آپ ہی لکھ دیجئے۔ کہنے لگے کہ میں تو اب خوش مذاق کا بوڑھا کمانڈر انچیف ہوں۔ لڑتا نہیں لڑاتا ہوں۔ تم جوان ہو دماغ لڑاؤ۔ مجھ سے اچھا لکھ سکو گے۔

ایک بار وحید الدین سلیم نے مرزا صاحب سے کہا کہ تم نے نذیر احمد کی کہانی لکھ کر انھیں ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید کر دیا۔ افسوس ہمارا ایسا کوئی شاگرد نہیں جو ہمارے مرنے کے بعد اس طرح زندہ کر دے۔ مرزا صاحب نے ہنس کر جواب دیا کہ آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کے کسی شاگرد نے یہ سعادت حاصل نہ کی تو میں اس کی تکمیل کر دوں گا۔ پوچھا سچ کہتے ہو کہنے لگے اگر یقین نہ آئے تو بسم اللہ ابھی مر کر دیکھئے۔ اگر مضمون نہ لکھوں تو فرحت نام نہیں۔

طنز کیا ہے؟

رفیع اللہ خاں عنائتی

ادب ہو یا اس کا کوئی شعبہ اس کا ایک سماجی کردار ہوتا ہے۔ جب تک اس "سماجی کردار" کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جائے گی اس وقت تک ہم اس کی حقیقت سے کما حقہٗ واقف نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ کام بھی کوہ کندن اور کاہ برآوردن کے مصداق ہے۔ دوسرے اور تیسرے درجہ اور کبھی کبھار اول درجہ کے فن کاروں نے بھی اس سماجی کردار کو نظر انداز کر کے اپنے کو گمراہی میں مبتلا کیا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی اس گمراہی کے دو اسباب رہے ہیں، ایک تاریخ کے صحیح علم کی کمی اور دوسرے زندگی سے فرار۔ اگر وہ زندگی کے صاف و شفاف اور حیات بخش سوتے کو منہ لگائے رہتے اور تاریخ کو سائنٹفک نقطۂ نگاہ سے پرکھتے تو وہ ہرگز اس گمراہی میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جب ہم اس تاریخی حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ سماج کی تاریخ طبقاتی کشمکش کی تاریخ ہے، طبقات کا وجود پیداوار کی ترقی میں مخصوص تاریخی ادوار میں محدود ہے اور اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ لے گا، تو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ ہر دور کا ادیب اپنے زمانہ کی بات کہتا ہے۔ اگر وہ غلام تہذیب کا ترقی پسند ادیب رہا ہے تو اس کے ادب پارے اس عہد کی سماجی کشمکش کے آئینہ دار ہوں گے۔ اس نے اس دور کی غلامی کے جوئے کو اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی ہوگی۔ اگر وہ جاگیردارانہ عہد کی پیداوار ہے تو اس نے اس زمانہ میں محکوم و مظلوم طبقات کو جاگیرداری سے نجات دلانے میں ایک اہم کام کیا ہوگا۔ لیکن اگر وہ سرمایہ داری اور سامراجی عہد کی مخلوق ہے تو اس کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ سرمایہ داری اور سامراجی زنجیروں کی جکڑ بند سے مزدوروں، کسانوں، متوسط طبقات وغیرہ کو نجات دلائے۔ اگر کسی نے اس حیثیت سے تاریخ و ادب کا مطالعہ کیا ہے تو اس کا ذہن و فکر صاف ہوگا۔ اور وہ سماج اور اس کی ترقی کو کما حقہٗ سمجھ سکے گا۔ اور اس کو آگے بڑھانے اور ترقی کی راہوں پر لگانے میں ایک کارِ نمایاں انجام دے گا۔ طنز بھی اپنا ایک سماجی کردار رکھتا ہے۔ میں اسی سماجی کردار کو ظاہر کرنے کی ان سطروں میں کوشش کروں گا۔

جب طنز کا نام، علم و ادب کے کسی شعبہ کی طرح، ہماری زبان پر آتا ہے، تو فوراً یہ بنیادی اور اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ طنز کیا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے کی انگریزی اور اردو ادیبوں نے کوشش کی ہے لیکن میں اس کو ناکافی سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اپنے انداز فکر کی مدد سے اس کا جواب دوں۔ طنز نگار میری نظر میں ایک سماجی مصلح ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا "مشعل" ہے جس سے وہ سماجی خس و خاشاک کو جلاتا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسی ننگی "شمشیر" ہے جس کی مدد سے وہ مظلوموں اور محنت کشوں کی صف سے آگے نکل کر ظالموں اور حملہ آوروں پر وار کرتا ہے۔ اور ان کو ہر آن پسپا کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ اس کے منہ میں ایک ایسی زبان ہے جس کی ترشی مخالفوں کے لئے سم قاتل کا کام کرتی ہے۔ اس کے تیر و نشتر کا وار کبھی خالی نہیں جاتا یعنی اس کا نشانہ تیر بہدف کے مصداق ہوتا ہے۔ ایک طنز نگار ایک طرف تو سماج کے ناکارہ اور بے روح اجزاء کو ایک مالی کی طرح بے دردی سے تراشتا ہے اور دوسری طرف ترقی پسند عناصر کو آگے بڑھانے کے لئے کمر ہمت باندھتا ہے یعنی اس کو ہم دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ وہ سماج میں ایک قسم کا توازن قائم کرنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ احتشام صاحب نے بڑی اچھی بات لکھی ہے "مفکرانہ ادب میں طنز کو کوئی معمولی جگہ نہیں ملنا چاہیئے کیونکہ اس میں اثر انگیزی کی وہ صلاحیت ہے جو شاعری کے سوا کسی اور صنفِ ادب

میں اتنی مقدار میں نہیں پائی جاتی۔ (ادب میں طنز کی جگہ، تنقید اور عملی تنقید، صفحہ ۴۳)

طنز و حقیقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ طنز اصل میں حقیقت ہی کے حیثیہ کا ایک سوت ہے۔ لیکن حقیقت ایک ایسا لفظ ہے جس کی ماہیت کے بارے میں کچھ کہنا یا اس کی حد بندی کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے ناپنے کا کوئی ایک پیمانہ نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ ہر زمانہ میں حقائق بدلتے ہیں۔ ان کی حیثیت محض اضافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے معیار بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ معیار ایک ایسا لباس ہے کہ جب بوسیدہ اور پرانا ہو جاتا ہے تو حقائق اس کے خول سے اس طرح باہر نکلتے ہیں کہ جیسے بیج ایک خول سے یا ایک بچہ انڈے سے باہر نکلتا ہے۔ اور اپنے ساری ارتقائی منازل طے کرتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ حقائق معیار کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور وہ ان کا جسم دیکھ کر بنائے جاتے ہیں۔ طنز بھی حقائق کا آئینہ دار ہے۔ اور چونکہ حقائق بدلتے رہتے ہیں اس لئے طنز بھی اپنے حربوں کو بدلتا رہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ چونکہ ماضی، حال اور مستقبل سب ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس لئے وہ حقائق اور معیار جو ماضی میں سماجی ضروریات کے تحت عالم وجود میں آئے تھے ان کو آج کی ضروریات و مسائل کا حل نہیں سمجھا جا سکتا لیکن ان کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ ہر وہ شخص جو سماجی تاریخ کا صحیح علم رکھتا ہے وہ اسی لازمی نتیجہ پر پہنچے گا۔ میرا کچھ ایسا یقین ہو چلا ہے کہ طنز اس وقت پھل پھول سکتا ہے جب طنز نگار اس سماجی حقیقت سے اپنا ناتا نہ توڑے گا اور اس کی مشعل کو اپنے ہاتھوں میں تھامے رہے گا۔ یعنی جب تک اس کا رشتہ بنیادی امر واقعی سے قائم رہے گا وہ کامیاب ہوگا۔ اس کی کوششیں ہمیشہ بار آور ہوں گی لیکن جب کبھی بھی وہ اس رشتہ کو منقطع کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ ظالموں کے ہاتھوں میں ایک خوفناک حربہ بن جائے گا۔ جس سے وہ عوام پر طرح طرح کے مظالم ڈھائیں گے۔ لیکن اگر وہ اس حقیقت کی اہمیت کو تسلیم کرتا رہا تو وہ نہ صرف جمہوری تحریکات میں ایک اہم حصہ ادا کرے گا بلکہ وہ طنز کو بھی تباہی سے بچا لیا جائے گا۔

اب میں ایک اہم مسئلہ کو اٹھا کر اس پر اظہار رائے کرنا چاہتا ہوں۔ جس طرف ابھی تک ہمارے ملک کے ادیبوں نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا ہے۔ اگرچہ وہ اس وقت کا بڑا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے اور اگر انھوں نے اسی طرح اس طرف بے توجہی برتی تو وہ سارے ادب کو انحطاط اور زوال کی طرف لے جائیں گے۔ اور وہ وقت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بجائے ان کی ترقی میں آڑے آئے گا۔

ہمارا ملک[1] آج سامراجی طاقتوں کے چنگل سے نجات پا چکا ہے۔ جاگیردارانہ نظام بھی خاتمے کی طرف جا رہا ہے اور اب وہ سوشلزم کی حدود میں داخل ہونے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہمارا ملک بورژوا انقلاب کی راہ سے نئی جمہوریت میں داخل ہو گیا۔ لیکن اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ طبقاتی شعور کو فروغ دینے کے بجائے "رواداری" کا پرچار کیا جائے۔ اور مختلف فرقوں میں باہم دوستی اور اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور طاقت کا استعمال کسی بھی فرقہ کے خلاف نہ ہو۔ ابھی تک ہمارے ملک میں سرمایہ دارانہ اثرات باقی ہیں۔ ہماری حکومت کا منشاء ان کو بھی ختم کرنے کا ہے۔ لیکن یہ کوئی منہ کا نوالہ نہیں۔ یہ ایک مشکل و اہم مرحلہ ہے۔ رفتہ رفتہ ہی ان کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے طنز نگاروں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی ہوشیاری سے ان کو اپنے تیر و نشتر کا نشانہ بنائیں۔ تاکہ حکومت کا قدم اس طرف تیز سے تیز تر ہو جائے۔

علاوہ ازیں ہمارے ملک میں مذہبی تعصب کے اثرات ابھی تک اپنا کام برابر کر رہے ہیں۔ یہ ہماری ملک کی راہ میں ایک سنگ گراں ہیں۔ ہمارے طنز نگاروں کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ ہمارا ملک ترقی کے اعلیٰ منازل طے کرے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ طنز

---

[1] ہمارا خیال ہے۔ اسی لئے پیراگراف میں جو سیاسی تجزیہ کیا گیا ہے اس پر کچھ ہنگامہ خیز قسم کی تیزی اور عجلت کی چھاپ ہے۔ سوال تو نہایت گمبھیر ہے۔ بالخصوص ترقی پسند حلقوں کے گہرے غور و فکر کا محتاج۔ ممکن ہے، رفیع صاحب کی یہ تیزی اور عجلت ہم سب کے ذہنوں میں کوئی سنجیدہ تحرک پیدا کرنے کا موجب بن سکے۔ ہم سب جن میں رفیع صاحب بھی شامل ہیں۔ (مرتب)

نگاروں کو "اخلاقی اقدار" کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ وہ محض کمیونزم کے الفاظ اور فقروں پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ اس کی روح تک رسائی حاصل کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں۔ کیونکہ جب ہی کام بنے گا محض رٹے رٹائے چند جملوں کی پیروی کام نہ آئے گی۔ بلکہ وہ نقصان دہ ثابت ہوگی اور نہ وہ روس اور چین کے مسائل کو سب کچھ سمجھ کر ان کی زلف پریشاں کو سنوارنے میں لگے ہیں کیونکہ ان کے ملک کے مسائل جدا ہیں اور یہ بات تو کسی بھی ہوشمند کی سمجھ میں نہیں آسکتی کہ سارے ممالک کے مسائل ایک سے ہیں اور ان کا حل بھی ایک ہی ہے۔ ان کو چاہیئے کہ وہ اپنے ملک کے مسائل کو نظر میں رکھیں اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہم روس اور چین کی طرح سوشلزم کی حدود میں داخل ہونا چاہتے ہیں لیکن کس راہ سے؟ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس پر ہمیں پورے انہماک کے ساتھ غور کرنا چاہیئے۔ روس پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ کی راہ سے اشتراکیت میں داخل ہوا۔ چین "نئی جمہوریت" کے ذریعے جس میں کسان، مزدور، بورژوائی، قومی اور متوسط طبقہ کے اور INTELLIGENTSIA شامل ہیں، اشتراکیت میں داخل ہونا چاہتا ہے تو ہمارے طنز نگاروں کو چاہیئے کہ وہ کسانوں، مزدوروں اور متوسط طبقات کے خلاف طنز کے حربوں کو استعمال نہ کریں بلکہ ان میں باہم محبت اور رواداری کی تعلیم دیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کے کسی ادیب اور طنز نگار نے ابھی تک ان چیزوں کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کی ہے۔

میری رائے میں طبقاتی سماج میں طنز کی حیثیت ایک دوسرے قسم کی ہوتی ہے جس کی طرف میں نے اوپر اشارے کئے ہیں لیکن جب طبقاتی امتیازات ختم ہو جاتے ہیں تو اس کا کام بہت ہلکا اور ختم سا ہو جاتا ہے۔ اس وقت طنز نگار کا صرف ایک ہی کام رہ جاتا ہے کہ وہ بیٹھا رہے اور جب کبھی کوئی چیز ایسی پیدا ہو جو سماج کو پھر پیچھے کی طرف لے جاتی ہو تو وہ اپنا حربہ استعمال کرے۔ طنز نگار کی مثال غیر طبقاتی سماج میں بالکل ایسی ہی ہے کہ جیسے لاک (LOCKE) کی مفروضہ ریاست کے افراد کی کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ حکومت نے ان کے فرائض کی انجام دہی سے بے توجہی برتی ہے جن کے لئے وہ عالم وجود میں آئی تھی اور جو اس کے سپرد کئے گئے تھے تو وہ بحالت مجبوری انقلاب پر مجبور ہو جاتے ہیں اور حکومت کو تبدیل کر دیتے ہیں۔

میرا ہرگز ایسا خیال نہیں کہ ہمارے طنز نگاروں کو صرف ہندوستان ہی پر نظر رکھنی ہے بلکہ ان کو چاہیئے کہ وہ ساری ایشیا کے مسائل کو بالخصوص اور ساری دنیا کے مسائل کو بالعموم اپنے مسائل سمجھیں۔ چونکہ جیسا کہ میں نے اوپر کہیں بیان کیا ہے کہ ہم بورژوا انقلاب سے گذر کر اشتراکی نظام کی حدود میں داخل ہونا چاہتے ہیں جو ہمارا آئیڈیل ہے لیکن چونکہ ساری دنیا کے پرولتاری اور بورژوا انقلابات کا ساتھ دینا ہے۔ ساری دنیا کو سرمایہ داری اور سامراجیت کی لعنت سے نجات دلانی ہے اس لئے اس مہم میں بھی بڑے ذوق و شوق سے حصہ لینا چاہیئے۔ وہ ممالک جو ابھی تک سرمایہ دار اور سامراجی طاقتوں کے ظلم و ستم سہہ رہے ہیں اور ان کے چنگل سے نکلنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں اور وہ ابھی تک کالونیل، نیم کالونیل اور نیم جاگیردارانہ ہیں ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ ہمارے طنز نگاروں کو ان طاقتوں کے خلاف اپنے وار اور حربے استعمال کرنا چاہیئے تو اسلئے ہماری مہم ایک عالمگیر مہم ہے۔ کیونکہ کوئی ریاست بھی چاہے وہ روس کی ہو یا چین و ہندوستان کی اس وقت تک پورے طور پر عہدہ برآ نہیں ہو سکتی جب تک کہ سامراجی طاقتوں کا اس پر کچھ بھی اثر باقی ہے۔ میں اسٹالن کی ۱۹۳۹ء کی رپورٹ کے اس اہم نکتہ سے قطعی طور پر اتفاق کرتا ہوں۔ "یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ ہم کو ساری دنیا کو سرمایہ داری اور سامراجیت سے پاک کرنا ہے میرا ایسا اندازہ ہے کہ دنیا آئندہ چالیس پچاس سال میں سامراجیت اور سرمایہ داری کی وبا سے بالکل ہو جائیگی" اس مقدس اور اہم کام میں ہندوستان ایک اہم رول ADOLE ادا کرے گا جس کو اس نے گذشتہ چند سال سے شروع بھی کر دیا ہے۔

●

مجاز نے کہا:۔ مجاز لکھنوی لکھنؤ میں امین آباد پارک سے چوک کی طرف جا رہے تھے۔ سامنے سے ایک جنٹلمین ہیٹ پہنے چلے آ رہے تھے۔ اتفاق سے انھوں نے ہیٹ اُلٹا پہن رکھا یعنی پچھلا حصہ اگلی طرف اور اگلا حصہ پچھلی طرف۔ مجاز نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ انھیں روکتے ہوئے پوچھا "صاحب! آپ آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں ــــ"

اودھ پنچ

— اُردو کا پہلا مزاحیہ اخبار —

وزیر آغا

انیسویں صدی کے آخر میں سیاسی بیداری نے دو بڑے ہنگاموں کی صورت میں اظہار پایا، پہلا ہنگامہ تھا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، دوسرا ہنگامہ تھا 'اودھ پنچ'۔ یہاں جنگ آزادی قلم سے لڑی گئی۔

اُردو صحافت میں طنز و مزاح کا رواج اودھ پنچ کے اجرا سے ہوتا ہے جو ۱۸۷۷ء کا واقعہ ہے۔ تاہم اس سے قبل بھی اردو اخبارات میں تنقیدی رائے زنی اور کہیں کہیں طنز کی جھلکیاں ضرور نظر آ جاتی ہیں مثلاً "اردو اخبار" کے بارے میں جسے ۱۸۳۶ء میں مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ بدر شعیب صاحب لکھتے ہیں:۔

"اس اخبار میں انگریزی عملداری پر سنجیدہ تنقید کی جاتی تھی جو بعض اوقات طنز کی صورت اختیار کر لیتی تھی جس سے اس زمانے کے حالات اور انگریز دشمنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"

اسی طرح مولانا عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں:۔ "۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی جتنے اخبارات نکلے قومی شکایات کے اظہار، حکومتی اقدامات کی تنقید، خبروں کی بہم رسانی اور پڑھنے والوں کی علمی اور ثقافتی خدمت میں برابر مصروف رہے"

لیکن بدر شعیب اور مولانا سالک کے ان بیانات سے قطع نظر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بحیثیت مجموعی اس زمانے کی اُردو صحافت میں طنز و مزاح کے ان شوخ رنگوں کا قطعی فقدان ہے جو بعد ازاں اودھ پنچ کے زمانے میں نمودار ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے اور اس کی دو ایک نمایاں وجوہ ہیں۔ ایک تو یہی کہ اس زمانے میں ابھی ہمارے ملک میں کوئی نمایاں سیاسی شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ اور واقعات اور تحریکات سے متعلق عام ہندوستانی کے ردعمل میں وہ شدت موجود تھی جو بعد ازاں مغربی تعلیم کے باعث اور انگریزی عملداری کے خلاف سرعت سے پھیلتی ہوئی سیاسی بے چینی کی وجہ سے پیدا ہوئی اور دوسری یہ کہ اس زمانے کی اُردو نثر پر تکلف و تصنع کا اس درجہ تسلط تھا کہ طنز و مزاح کے ابھرنے اور رواج پانے کے بہت کم امکانات تھے۔

اسی دور کے اردو اخبارات کے عام لہجے کے بارے میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اگرچہ ۱۸۵۷ء سے قبل اُردو پریس سیاسی اور سماجی امور میں کافی دلچسپی لیتا تھا اور اس ضمن میں بعض اوقات سخت اور تلخ ترش باتیں بھی کہہ جاتا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے فوراً بعد اس کا لہجہ یک لخت نرم پڑ گیا اور اخبارات عام سیاسی فضا کے بارے میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لینے لگے۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ یونہی جاری رہا تا آنکہ ہنگامی حالات کے خاتمہ پر ملکی پریس کی پریشانی کسی حد تک دور ہوئی اور اخبارات پھر سے ملکی مسائل پر رائے زنی کرنے لگے۔

غدر کے بعد "اودھ پنچ"

اٹھارہویں صدی کے نصف اول کو بظاہر تو ہندوستانیوں کے کسی سیاسی ردعمل کی داستان نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس دوران میں معاشرے کی پرسکون بالائی سطح کے نیچے سیاسی اور سماجی بیداری کا جو کوہ آتشیں سلگ رہا تھا وہ اس صدی کے نصف آخر میں دو بڑے ہنگاموں کی صورت میں نمودار ہوا ان میں سے ایک ہنگامہ تو ۱۸۵۷ء کے غدر کے نام سے مشہور ہے اور یہ ایک مٹتی ہوئی سلطنت کی آخری کروٹ کی حیثیت رکھتا ہے دوسرا ہنگامہ آزادی کی وہ جد و جہد ہے جو نمایاں سیاسی اور سماجی بیداری کی پیداوار تھی اور جس کا سب سے بڑا مظہر اخبار تھا جس نے اودھ پنچ کے نام سے نہ صرف اجنبی حکومت کو ہدف طنز بنانے کی سعی کا آغاز کیا بلکہ جس نے عام سوشل اور ملکی معاملات کے بارے میں بھی اپنی آواز کو بڑے بے باکانہ انداز سے الفاظ کا جامہ پہنایا۔

ادب میں ایک نیا ادارہ

لکھنؤ میں اودھ پنچ کے اجرا نے جو ۱۸۷۷ء کا واقعہ ہے۔ اردو ادب میں ایک نئے ادارہ کا دروازہ کھولا یعنی مزاح حسنہ اور مطائبات کو رواج دیا۔ اب تک لوگوں کا علم ہزلیات جعفر زٹلی تک محدود تھا جن کو وہ کوٹھری کا دروازہ بند کرکے پڑھتے تھے اور بدمذاقی کے مزے لوٹتے تھے یا احباب کی بے تکلف صحبتوں میں ان کی تاویل کرتے۔ لیکن اودھ پنچ نے واقعات حاضرہ اور سوشل و سیاسی معاملات کے متعلق مذاق کو چمک دی نہ صرف یہ کہ جس طرح اکبر مرحوم کو کانگریس اور لیگ سامنے کے موضوع مل گئے یعنی سجاد حسین کو سرسید احمد خاں اور علی گڑھ کی تحریک جدید ہاتھ آگئے۔ بلکہ منشی صاحب مرحوم کی غائر نظر سے کوئی واقعہ یا شخصیت جو مزاح کا عنصر رکھتی ہو یا جس کی کوئی کل ڈھیلی ہو بچ نہیں سکتی تھی۔ اس کے وار کو کوئی خالی نہ دے سکا۔ کارٹون کی ابتدا بھی اودھ پنچ ہی کی ذات سے ہوئی۔

اہمیت کی تین وجوہ

اردو صحافت میں اودھ پنچ کی اہمیت کی تین وجوہ ہیں۔ پہلی تو یہ کہ اودھ پنچ نہ صرف اُردو کا پہلا مزاحیہ اخبار تھا بلکہ اس نے پہلی بار اردو میں مغربی طنز و مزاح کے حربوں کو بھی استعمال کیا۔ دوسری یہ کہ سیاسی اور مجلسی مسائل پر بھرپور طنز کا آغاز اودھ پنچ ہی سے ہوا۔ اودھ پنچ سے قبل محض نکتہ چینی یا ایک حد تک تنقید ضرور موجود تھی لیکن ظرافت کے بیشتر عناصر کا افسوسناک حد تک فقدان تھا۔ تیسری یہ کہ اودھ پنچ وہ پہلا اُردو اخبار تھا جس نے کسی خاص واقعہ کے متعلق اپنی رائے دینے یا کسی چیز کے مضحک پہلو کو نمایاں کرکے پیش کرنے یا محض حریف کو ذلیل کرنے کے لئے کارٹون کا بھی استعمال کیا البتہ صحافتی مزاح کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو طعن و تشنیع کی وہ روش جسے اودھ پنچ نے خاص طور پر اپنایا اور جس کی مدد سے اس اخبار نے معاصرین کی پگڑیاں اچھالنے، انھیں ذلیل کرنے اور بعض اوقات دلائل کی بجائے محض ابتذال اور پھکڑ پن سے کام لینے کی کوشش کی، خاصی قابل اعتراض روش تھی اس طرح کہ آج بھی اودھ پنچ کی پیشانی پر ایک بدنما دھبے کی طرح نظر آتی ہے۔

چار معرکے

پنڈت برج نرائن چکبست نے گلدستہ پنچ" کے دیباچہ میں اس روش کے متعلق بعض دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اودھ پنچ نے چار بڑے معرکوں میں حصہ لیا۔ پہلا معرکہ فسانۂ آزاد" کے سلسلہ میں پیش آیا۔ اودھ پنچ کو اعتراض محض یہ تھا کہ فسانۂ آزاد میں بیگمات کی زبان در اصل بیگمات کی زبان نہیں بلکہ ماماؤں اور مغلانیوں کی زبان ہے۔ چنانچہ اودھ پنچ نے اس سلسلہ میں سرشار پر کہ وہ اودھ پنچ" کے حریف یعنی اودھ اخبار کے ایڈیٹر تھے اعتراضات کی بوچھار کردی۔ اودھ پنچ کا دوسرا معرکہ مولانا حالی کو سہنا پڑا۔ اودھ پنچ کو شکایت محض یہ تھی کہ مقدمہ شعر و شاعری میں مولانا حالی نے لکھنؤ کے شعرا کی توہین کی ہے۔

(باقی ۲۱۶ پر ملاحظہ کریں)

اُردو ادب میں طنز و مزاح

شجاعت علی سندیلوی

● ایک جائزہ

اُردو ادب میں ابتدا سے ہی کسی نہ کسی شکل میں طنز و مزاح کی چاشنی موجود رہی ہے ہر صنف سخن میں قریب قریب ہر شاعر اور ادیب نے گلہائے ظرافت کھلائے ہیں۔ اپنے زمانے اور ماحول کی خرابیوں کو وہ ناصح اور واعظ بن کر نہیں بلکہ ظریف و مزاح نگار بن کر دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ سودا کے زمانے سے طنز و مزاح کے تیر و نشتر باقاعدہ چلنے لگے تھے۔ یہ زمانہ بڑا پُر آشوب تھا۔ اخلاقی خرابیوں نے قوم و ملک کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ آزادی غلامی سے بدلتی جا رہی تھی۔ اچھائیاں دور اور خرابیاں جو ڈیگر تی جا رہی تھیں۔ سودا کب باز رہنے والے تھے۔ وہ فطرتاً شوخ تیز طرار اور ذہین تھے۔ علمی سرمایہ کی ان کے پاس کمی نہ تھی۔ انھوں نے ظرافت کے پردے میں خوب خوب چوٹیں کیں۔ جو بھی ان کی زد پر آ گیا۔ وہ بچا نہیں ان کے خاصا از تمسخر و ظرافت میں گلہائے طنز و مزاح بھی مہکتے ہیں۔ ان کی جدت ادا، ندرت بیان، شوخی و رنگینی نے پڑھنے والوں کو سیلاب تبسم میں غرق ہی نہیں کیا بلکہ اس کو معصیت سے پاک بھی کیا اور پند و نصائح کے بیش قیمت موتی بھی عطا کئے۔ ساتھ ساتھ میر ضاحک۔ نظیر اکبر آبادی۔ انشاء مصحفی اور رنگین کے کلام میں بھی یہ رنگ موجود ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے تو کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر انھوں نے نظر نہ ڈالی ہو۔ انشاء و مصحفی کے ادبی معرکے آج بھی گونج رہے ہیں اور یہ شعر تو اب تک زد زبان ہے

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

غالب نے نثر و نظم میں جو طنز و مزاح کے موتی بکھیرے ہیں۔ ان کی آب و تاب سب سے الگ ہے۔ وہ ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے۔ انھوں نے دشنہ و خنجر سے ناز و غمزہ کا مطلب لیا ہے۔ مایوسی و ناکامی موت و بیماری سب میں ان کی شوخی قائم رہتی ہے۔ تعزیت میں بھی طنز و مزاح سے نہیں چوکتے اپنے شاگرد امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کے انتقال پر لکھتے ہیں۔

"اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے"

ان کے کلام میں طنز و مزاح کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ تنخواہ نہ ملنے سے جو مصائب ہوتے ہیں ان کی شکایت اور تنخواہ مانگنے کا انداز ملاحظہ ہو۔

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ میں تہائی کا — ہو گیا ہے شریک ساہوکار

ادب میں یہ اسلوب بیان، یہ شوخی و رنگینی، یہ گلفشانی و عطر بیزی 'مرزا نوشہ' ہی کا حصہ ہے۔

اودھ پنچ اخبار نے طنز و مزاح کے رنگ میں اخلاقی سیاسی اور سماجی مسائل پر روشنی ڈالی اور سب پر بڑی سخت نکتہ چینی کی۔ سجاد حسین مرحوم کی ذات طنز و مزاح صفات تھی 'سونے پر سہاگہ' یہ کہ انھیں ایسے ساتھی بھی مل گئے جو اپنے زمانے میں یکتائے شہر تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ منشی جوالا پرشاد برق۔ منشی احمد علی شوق۔ نواب سید محمد آزاد۔ سید عبدالغفور شہباز اور امام مزاح نگاران اکبر الہ آبادی — پھر کیا تھا اُردو ادب پر بہار آ گئی۔ لکھنے والوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر طنز آمیز تبصرہ کیا۔ سیاسی، سماجی، تعلیمی، اخلاقی امراض پر تیر و نشتر چلے۔ لب و لہجہ میں تلخی بھی آئی اور خست بھی۔ لیکن دلکشی و رعنائی اور توانائی قائم رہی۔ نثر میں سرشار اور سجاد حسین مرحوم کا جواب نہ تھا نظم میں اکبر آبادی اپنے مستقبل کی دوربینی کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اکبر کے مزاح میں تنوع، وسعت، گہرائی اور گیرائی ہے۔ وہ زندگی کے قریب اور ماحول کو اپنے اندر جذب کئے ہوئے

ہیں ان کے طنز و مزاح کا نشانہ نئی تعلیم و تہذیب، سیاست، اخلاقیات، پردہ نسواں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ مغربیت ہے۔ وہ خود گورنمنٹ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گئے۔ انھوں نے ظرافت کا غلاف اوڑھ کر اصلاح اخلاق کا کام کیا۔ ان کی فن کاری نے اُردو ادب میں ہزاروں الفاظ ایسے شامل کر دیئے جن کو کوئی منہ بھی نہیں لگاتا تھا۔ سیکڑوں انگریزی کے الفاظ اس طرح استعمال کئے کہ وہ اُردو کے معلوم ہونے لگے۔ ان کا مزاح دائمی اور آفاقی اثر رکھتا ہے ان کی ظرافت میں ڈکنس کی طرح شدید کرب ہے۔ وہ تمام عمر دلِ آگاہ کے لئے شاعری کرتے رہے۔ خود کہتے ہیں۔

تنخواہ کیلئے ہے نہ ہے واہ کے لئے — ہے میری شاعری دلِ آگاہ کے لئے

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں۔ موجودہ تعلیم اور تعلیم نسواں کی خرابی کے نتائج اب آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن اکبر نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

لہٰذا تعلیم بدل جانے سے دل بدل جاتے ہیں:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مذہب سے بیزاری کا اظہار ملاحظہ ہو۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

عبادت میں یہ جدت قابلِ تحسین ہے۔

انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی — نکلتی ہیں دعائیں ان کے منہ سے ٹھمریاں ہوکر

لیڈروں کے کرم بے حساب کی حقیقت۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

اکبر کے زمانے سے مزاح نگاروں میں زندگی کا شعور بڑھتا گیا انھوں نے تاریخی اور ارتقائی حقیقتوں کا احساس کیا اور طنز و مزاح کو فنی اعتبار سے نکھارا۔ پریم چند، ظریف لکھنوی، سید محفوظ علی بدایونی، سلطان حیدر جوش، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبد الماجد دریا بادی، مُلّا رموزی، پطرس بخاری، عظیم بیگ چغتائی، مرزا فرحت اللہ، شوکت تھانوی، اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین سے اُردو ادب میں نئی روح اور نئی زندگی بخشی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اس دور کے ممتاز مزاح نگار ہیں۔ ان کے یہاں وزن ہے گہرائی ہے، نفاست ہے۔ ان کے یہاں آرٹ اور معیاری ادبی موجود ہے وہ ماہر فن مزاح نگار ہیں۔ ان کی نظر ہر معاملہ پر بڑی گہری ہے۔ وہ اپنے کرداروں کو بڑی آب و تاب اور شان و شوکت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں زندہ دلی اور مزاح کے ساتھ ساتھ شاداب شگفتہ دلی اور گہری طنز بھی پائی جاتی ہے۔

اکبر کی زبانی تعلیم کی خرابی سے شوہر پرست بی بی کا حال آپ سُن چکے۔ رشید صاحب سے بھی لطف اندوز ہو لیجئے۔

"گھریلو بیوی ہندوستانی بیوی ہے جس کو فریقین کے والدین بیاہتے ہیں اور ملک و ملت سراہتے ہیں تعلیم یافتہ روشن خیال بیوی وہ ہے جس کو فریقین کے احباب بیاہتے ہیں۔ احباب ہی نبھاتے ہیں اور سوسائٹی سراہتی ہے"

نئے سماج کی روشن خیالی کو کس قدر شگفتہ انداز میں پیش کیا ہے اور ناصح مشفق سے بڑھ کر اصلاح کے فرائض انجام دیئے ہیں۔

ترقی پسند ادیبوں نے بھی طنز و مزاح سے اُردو ادب میں اصلاح اور اضافہ کیا۔ اختر حسین رائے پوری، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک سب صحت مند ادب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ کپور کی طنز نئی روح اور نئی زندگی بخشتی ہے۔ وہ طنزیاتی روح صحت مند تصور اور ادبی شعور رکھتا ہے۔

موجودہ دور میں سماجی، سیاسی، اخلاقی، تعلیمی مسائل کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے اور اصلاح کرنے میں مزاحیہ ادب تریاق کا کام کر رہا ہے۔ انداز بیان کی دلکشی، جاذبیت، ندرت و جدت بڑھتی جا رہی ہے اور یہ شرف صرف طنز و مزاح ہی کو ہے کہ وہ نثر و نظم دونوں میں نئے رنگ اور نئے ڈھنگ سے درس اصلاح و اخلاق دے رہا ہے اور دیتا رہے گا۔

سومناتھ کا دربار

کچھ مت پوچھو کیا کیا دیکھا — نمک پاش

حشرِ عقیدت برپا دیکھا — دین و حرم کا چرچا دیکھا
اوم کا اونچا جھنڈا دیکھا — آہ! ترنگا نیچا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

جوناگڈھ کا میلہ دیکھا — نرناری کا ریلہ دیکھا
ست گرو کا چیلہ دیکھا — آگ چلم اور گانجھا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

حلوہ پوری چھنتے دیکھا — آٹا میدہ سنتے دیکھا
لڈو پیڑا بنتے دیکھا — پیٹ بھروں کا چلنا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

راجندر پرشاد کو دیکھا — سیکولر بنیاد کو دیکھا
ٹنڈن جی استاد کو دیکھا — دیدگ کال کا سپنا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

رندوں تک اک جام نہ آیا — روٹی کا پیغام نہ آیا
گاندھی جی کا نام نہ آیا — دور وہاں سے چرخا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

پنڈت اور جٹا دھاری بھی — اونچے اونچے بیوپاری بھی
دیکھے افسر سرکاری بھی — ہر ماتھے پر ٹیکا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

آگ لگی تھی روم میں جیدم — نیرو کو سونپی تھی چھم چھم
کہیں پہ دیکھا پیٹ کا ماتم — کہیں پہ لڈو بٹتا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

دولت کے دلال کو دیکھا — بھارت کے کنگال کو دیکھا
اور کنہیا لال کو دیکھا — الٹا دیکھا سیدھا دیکھا
اور بتائیں کیا کیا دیکھا؟

رجواڑوں کا جوبن دیکھا — دہن والوں کا درشن دیکھا
لاچاروں کا سمرن دیکھا — ہم نے بھارت بھوکا دیکھا
کچھ مت پوچھو کیا کیا دیکھا

دو المناک حادثے

گذشتہ ماہ اُردو کے دو اور ممتاز فن کار ہم سے جُدا ہوگئے۔ ایک مولانا چراغ حسن حسرت جو ایک بلند پایہ مزاح نگار تھے اور اُردو صحافت میں "سند باد جہازی" کے قلمی نام سے اپنے قلم کے جوہر دکھایا کرتے تھے۔ ہمارے ادیبوں کے ساتھ یہ کچھ ایسی دردناک روایت وابستہ ہو رہی ہے کہ وہ عسرت اور تنگ دستی کے عالم میں اپنی جانیں دے رہے ہیں۔ مولانا حسرت تین سال تک مختلف اخباروں اور رسالوں میں طنز و مزاح کے شگوفے کھلاتے رہے لیکن موت سے پہلے لاہور کے اخباروں میں اُن کی اقتصادی امداد کی اپیلیں شائع ہونے لگیں اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ ارباب اقتدار، مالکان اخبار اور ناشر حضرات اس دردناک صورتحال پر کب تک بدستور تبسم زیرِ لب رہیں گے۔

موت سے دو ہفتے پہلے انھوں نے مجھے ہسپتال سے ایک خط لکھا۔ میں نے طنز و مزاح نمبر کے لئے اُن سے کسی طنزیہ کا مطالبہ کیا تھا تو مولانا نے لکھا:۔

"مکرمی، تسلیم! ـــــ میں مدت سے ہسپتال میں پڑا ہوں۔ مضمون لکھنا تو درکنار خود خط بھی نہیں لکھ سکتا اس لئے میرا مضمون لکھنا ناممکن ہے۔ صحت یاب ہوگیا تو آپ کے لئے ضرور کچھ بھیجوں گا۔

نیاز مند۔ حسرت"

لیکن حسرت صاحب صحت یاب نہ ہو سکے اور دو ہفتوں بعد اُن کے انتقال کی خبر آگئی اور اُردو صحافت کا ایک ایسا مزاحیہ کالم نگار اُٹھ گیا۔ جس کی جگہ لینے والا فی الحال کوئی نہیں۔

دوسری المناک موت منشی پریم چند کے ساتھی افسانہ نگار حضرت اعظم کریوی کی ہے انھیں راہ چلتے کسی بدطینت نے چھرا گھونپ دیا اور وہ جاں بحق ہوگئے۔ جناب اعظم کریوی ہمارے اُن افسانہ نگاروں میں سے تھے جو سماج کے مخالفانہ دور سے چور چور ہو کر کہانیاں لکھتے ہیں۔ انھوں نے سینکڑوں افسانے لکھ کر فن اور ادب کی مسلسل خدمت کی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ کراچی چلے گئے اور سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ وہ افسانے لکھنا چھوڑ چکے تھے مگر ان کا تخلیقی مرتبہ مسلّم ہے۔ ادارہ شاہراہ اس سانحہ پر مرحوم کے لواحقین، احباب اور مداحوں کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

نوٹ :- نونہال بے بی شو ...

ہماری مطبوعات

مکتبہ شاہراہ اور اس کی مطبوعات کی بیشتر خصوصیات حُسنِ طباعت کے اعتبار سے روایت ہیں۔ اِس کی کتابیں زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کرتی ہیں۔ انسانیت کے تابناک مستقبل کی جھلک دکھاتی ہیں۔ منزل کو بے نقاب کرتی ہیں اور زندگی کو آگے بڑھاتی ہیں۔ کمزور، بیمار اور انحطاط پذیر رجحانات کا پردہ چاک کرتی ہیں:۔

سنہ ۱۹۵۰ء بہترین اَدَب :۔ مرتب سردار جعفری اور پرکاش پنڈت ۔:۔ قیمت:۔ 5/8/-

سنہ ۱۹۵۱ء 〃 〃 :۔ 〃 سردار جعفری، ممتاز حسین، جگن ناتھ آزاد، اور پرکاش پنڈت ۔ :۔ قیمت:۔ 5/8/

سُرخ آنچل :۔ تیرہ ممتاز افسانہ نگار خواتین کے افسانوں کا مجموعہ، معہ حالاتِ زندگی، اور تصاویر۔ مرتبہ پرکاش پنڈت ۔ :۔ قیمت:۔ 3/12/-

نقوشِ زنداں :۔ مرتبہ رضیہ سجاد ظہیر۔ سجاد ظہیر کے ان خطوط کا مجموعہ جو اُنھوں نے سنٹرل جیل لکھنؤ سے اپنی محبوب بیوی رضیہ کے نام لکھے ۔:۔ قیمت:۔ 3/12/-

بھوک (دوسرا ایڈیشن) :۔ ناروے کے نوبل پرائز یافتہ اور شہرۂ آفاق ناول نگار نٹ ہمسن کا شاہکار۔ مترجمہ مخمور جالندھری۔ .... قیمت:۔ 3/8/-

زُلفوں کے سائے میں :۔ مصنف شنیہین۔ مترجمہ ظ انصاری۔ ایک ناولٹ نئے چین کی، نئی داستان۔ - - - - - - - قیمت:۔ 1/4/-

آہ کیو کی سچی کہانی :۔ مصنف چین کا پریم چند لیسول۔ مترجمہ انساج زبیر۔ چین کے عظیم فنکار کا شاہکار، ناولٹ۔ قیمت:۔ 1/4/-

آدمی اور سکے :- مہندر ناتھ نے اس ناول میں آج کی سماج کی بڑی فنکاری کے ساتھ عکاسی کی ہے، اقتصادی اور معاشرتی حالات کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔ قیمت :- 2/12/-

میراث :- پرکاش پنڈت - مصنف کو اس کتاب پر انعام مل چکا ہے۔ یہ موصوف کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت :- 3/-/-

پتھر کی دیوار :- سردار جعفری نے جیل کی پتھر کی دیوار سے لے کر کشمیر وادی تک کیا دیکھا۔ اس پر کیا گزری اور اس نے کیا محسوس کیا؟ آپ کو اس مجموعہ میں ملے گا۔ قیمت :- 2/8/-

ایشیا جاگ اُٹھا :- سردار جعفری نے ایشیا کی عظمت، اس کے ماضی اور حال نیز درخشندہ مستقبل پر بہترین نظمیں ہیں۔ قیمت :- -/12/-

ستاروں سے ذرّوں تک :- جگناتھ آزاد کی شاعری میں ماضی کی بہترین روایات نئے اور خوبصورت سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہیں - - - - - - - - قیمت :- 2/12/-

بیکراں :- جگناتھ آزاد کے پہلے مجموعۂ کلام کا دوسرا ایڈیشن۔ قیمت :- 4/8/-

ماں :- میکسم گورکی کا شہرۂ آفاق ناول جو اب تک لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکا ہے۔ اردو ترجمہ۔ ۴۷۲ صفحات قیمت :- 4/8/-

چین کی بہترین کہانیاں :- یہ دنیا کے بہترین افسانوی ادب کی پہلی کڑی ہے۔ مولفہ مترجمہ ظ انصاری، صفحات ۱۸۰ قیمت :- 2/-/-

للکار :- دنیا کے آٹھ باغی شعراء کے کلام معہ سوانح حیات و تصاویر۔ مترجمہ نرش کمار شاد۔ قیمت :- 2/4/-

دیا بجھ گیا :- کرتار سنگھ دگل صاحب کا وطنی سے لبریز ڈرامہ جو ایک کشمیری ماں کی اپنی مثال آپ ہے۔ قیمت :- 1/4/-

ماؤ سی تنگ :- ایشیا کے سب سے بڑے انقلابی ہیرو اور سرخ چین کے رہنما کی زندگی کے مختصر حالات۔ فکر تونسوی نے تحریر فرمائے ہیں۔ تیسرا ایڈیشن۔ قیمت :- 1/4/-

طوفان کی کلیاں :- پھولوں کے دیس کشمیر کی سماجی گرنت سے متعلق کرشن چندر کا پھولوں اور انگاروں سے لبریز ناول۔ قیمت :- 4/4/-

میں انتظار کروں گا :- جب ملح افسردگی اور یاس کا شکار ہو جاتی ہے جب چاروں طرف اداسی کی فضا کے بادل مسلط ہو جاتے ہیں تب کرشن چندر ان شکستگی کی تصویروں میں زندگی کے رنگ بھرتا ہے۔ یہ موصوف کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت :- 2/8/-

ڈوبتے سائے :- از عادل رشید۔ قیمت :- 3/-/-

تشنگی :- از رشید اختر ندوی۔ قیمت 3/8/-

مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، دہلی

پسند اپنی اپنی

منشی پریم چند

گئو دان — ناول — ۶/۰
بازارِ حسن — 〃 — ۴/۸
نرملا — 〃 — ۲/۸
غبن — 〃 — ۵/۰
پردہ مجاز — 〃 — ۶/۰
روٹھی رانی — 〃 — ۱/۴
بیوہ — 〃 — ۲/۸
خاکِ پروانہ — 〃 — ۳/۴
زادِ راہ — افسانے — ۳/۱
واردات — 〃 — ۱/۶
دودھ کی قیمت — 〃 — ۲/۴
خواب و خیال — 〃 — ۲/۸
آخری تحفہ — 〃 — ۲/۱۲
وفا کی دیوی — 〃 — ۰/۱۲
قاتل — 〃 — ۰/۱۲
جبیل — 〃 — ۰/۱۲
فردوسِ خیال — 〃 — ۳/۰
رام چرچا — 〃 — ۲/۸

ٹیگور

طوفان — ناول — ۳/۰
جیون پربھات — 〃 — ۳/۰
کمودنی — 〃 — ۱/۸
ماندرلابو — افسانے — ۰/۱۲
بھولا ناتھ — 〃 — ۰/۱۲
شعلہ الفت — 〃 — ۰/۱۲
سنگتراش — 〃 — ۰/۱۲
شعلہ آب — افسانے — ۰/۱۲
نجات — 〃 — ۰/۱۲
آزادی کا دیوتا — 〃 — ۰/۱۲
وطن پرست — 〃 — ۰/۱۲
خونی سماج — 〃 — ۰/۱۲
شعلہ اجل — 〃 — ۰/۱۲
دنیا ایک کہانی ہے — 〃 — ۰/۱۲
ماسٹر جی — 〃 — ۰/۱۲
گارڈنر — 〃 — ۰/۱۲
راج رشی — 〃 — ۲/۸
ٹیگور کی کہانیاں — 〃 — ۱/۸
شجر کے سائے تلے — 〃 — ۱/۸
طوفانِ ہوس — 〃 — ۲/۰
گیتانجلی — نظم — ۱/۳
ٹیگور کے ڈرامے — ڈرامہ — ۲/۸
ڈاک گھر — 〃 — ۰/۱۲

میکسم گورکی

ماں — ناول — ۴/۸
کڑوی کہانی — 〃 — ۲/۸
مالوا — 〃 — ۱/۱۲
میں ادیب کیسے بنا — 〃 — ۱/۴

بنکم چندر چٹرجی

رادھا رانی — ناول — ۱/۰
لوک رہسیہ — 〃 — ۱/۴
چندر شیکھر — 〃 — ۳/۰
راج سنگھ — 〃 — ۲/۸
اندرا — 〃 — ۱/۸
زہر کا پودا — ناول — ۳/۰
آنند مٹھ — 〃 — ۲/۸
دو سال بعد — افسانے — ۲/۸

سرت چندر چٹرجی

چندر ناتھ — ناول — ۱/۸
دور ہے منزل ابھی — 〃 — ۳/۸
گھر کی آگ — 〃 — ۲/۰
حسرت — 〃 — ۲/۰
سماج کا ڈر — 〃 — ۲/۴

کرشن چندر

طوفان کی کلیاں — ناول — ۴/۸
الٹا درخت — 〃 — ۲/۱۲
جب کھیت جاگے — 〃 — ۲/۱۵
میں انتظار کروں گا — افسانے — ۲/۸
کشمیر کی کہانیاں — 〃 — ۳/۰
اجنتا سے آگے — 〃 — ۲/۱۲
نئے غلام — 〃 — ۲/۸
یوکلپٹس کی ڈالی — ۲/۱۲
ایک روپیہ ایک پھول — 〃 — ۲/۱۲
صبح ہوتی ہے — رپورتاژ — ۲/۴

عصمت چغتائی

ضدی — ناول — ۲/۰
چوٹیں — افسانے — ۳/۰
کلیاں — 〃 — ۳/۸
چھوئی موئی — 〃 — ۳/۱۲

خواجہ احمد عباس

زعفران کے پھول — افسانے — ۲/۰
کہتے ہیں جس کو عشق — افسانے — ۲/۰

منٹو

سڑک کے کنارے — افسانے — ۳/۰
نورجہاں — 〃 — ۱/۰/۰
یزید — 〃 — ۲/۸/۰
بادشاہت کا خاتمہ — 〃 — ۳/۰/۰
منٹو کے مختصر افسانے — 〃 — ۲/۸
ٹھنڈا گوشت — 〃 — ۳/۰
خالی بوتلیں خالی ڈبے — 〃 — ۳/۰
چغد — 〃 — ۳/۰
شیطان — 〃 — ۳/۸
دھواں — 〃 — ۳/۰
برقعے — 〃 — ۲/۴
شکاری عورتیں — 〃 — ۴/۰
پھندنے — 〃 — ۲/۰
اوپر نیچے درمیان — 〃 — ۴/۸
سیاہ حاشیے — 〃 — ۲/۰
سرکنڈوں کے پیچھے — 〃 — ۳/۰

تاجور سامری

دھرتی کے تیور — افسانے — ۲/۱۲
جب بندھن ٹوٹے — 〃 — ۳/۰
اکیلا — 〃 — ۲/۰
کھیت میں لہو — ناولٹ — ۱/۱۲
گرمی بازار — نظم — ۱/۱۲
امن کہانی — 〃 — ۰/۲

اے۔ آر خاتون

افشاں — ناول — ۷/۸

تصویر ناول ۴/۰

ایم اسلم

- رازونیاز ،، ۵/۰
- دیوانہ ،، ۶/۰
- خون شہیداں ،، ۴/۸
- بادہ گلرنگ ،، ۳/۰
- نغمہ تاتار ،، ۵/۸
- میری کہانی ،، ۴/۰
- فریاد خاموشی ،، ۵/۰
- رین نظارے ،، ۳/۸
- اشک ندامت ،، ۳/۸
- فاتح قسطنطنیہ ،، ۵/۰
- تیغ ابدالی ،، ۵/۸
- رقاصہ ،، ۱/۱۲
- تصورات ،، ۲/۴
- خون مزدور ،، ۴/۰
- چشم لیلیٰ ،، ۶/۸
- شفق ،، ۳/۸
- جوئے خون ،، ۴/۰
- ٹھکر ،، ۳/۰
- نرگس ،، ۲/۸

جمنا داس اختر

- بردہ فروش ناول ۱/۱۲
- آنسو ،، ۲/۱۲
- آگ ،، ۱/۱۲
- کرنیں ،، ۲/۰
- جلن ،، ۲/۰
- رادھا الزبتھ ،، ۲/۰
- سونا کا چھی ،، ۳/۸

خان محبوب طرزی

- سفر زہرہ ناول ۲/۰
- دیوانہ ،، ۳/۰
- رہبر اعظم ،، ۲/۸
- پیغام اجل ،، ۲/۸
- فولادی تیلے ،، ۲/۰
- شہزادی شب افروز ،، ۲/۰
- رسی جل گئی ،، ۳/۰
- شعلہ ،، ۵/۰
- انقلاب لہین ،، ۲/۰
- دروانہ ،، ۲/۰
- سیاہ کاریاں ،، ۱/۱۲
- کرُدی رقاصہ ،، ۲/۰
- سورج مکھی ،، ۲/۰
- طلسم حیات ،، ۳/۸
- برق پاش ،، ۲/۰
- اڑن طشتری ،، ۳/۸
- گورکھ دھندھا ،، ۱/۸
- سپیرا ،، ۱/۴
- ترپائی ،، ۱/۸
- سینگی ،، ۳/۰
- زبیدہ ،، ۳/۸
- بنت البحر ،، ۲/۰
- گلنار ،، ۲/۴
- عالم امکاں ،، ۲/۰
- صبح اندلس ،، ۴/۰

قیسی رامپوری

- انجم ناول ۳/۸
- خیانت ،، ۳/۰

شکار ناول ۲/۸
تحسین ،، ۲/۴
نیلام ،، ۲/۰
دوشیشے ،، ۲/۸
تنویر ،، ۳/۰
برہنہ ،، ۲/۰
جاوید ،، ۳/۰

دت بھارتی

- چوٹ پہلا حصہ ناول ۳/۰
- ،، دوسرا ،، ۳/۸
- گناہ ،، ۲/۴
- تڑپ ،، ۳/۰
- تھکن ،، ۲/۸
- موت سے پہلے ،، ۴/۰
- گناہ کے دھبے افسانے ۲/۰

شام سندر پرویز

- دھڑکن ناول ۲/۰
- دھند ،، ۲/۰
- بارہ آنے ،، ۱/۰
- گونگے معمار ،، ۱/۰

عادل رشید

- روپ ،، ۵/۰
- لرزتے آنسو ،، ۳/۰
- ڈوبتے ستارے ،، ۳/۰
- عشق پر زور نہیں ،، ۲/۰
- بے ننگ نام ،، ۴/۰
- میر صاحب ،، ۳/۸
- دو لاکھ روپے کا نوٹ افسانے ۲/۱۲

سب رنگ افسانے ۴/۰

صادق سردھنوی

- بہادر دوشیزہ ناول ۳/۰
- عربی دوشیزہ مکمل ۲ حصے ۶/۰
- خروش انتقام ،، ۳/۸
- فتح شوستر ،، ۴/۰
- آفتاب عالم مکمل ۲ حصے ۹/۰
- سسلی کی ساحرہ ،، ۴/۰
- افریقہ کی دلہن ،، ۴/۸
- اندلس کے دو چاند مکمل ۶/۰
- عروس بغداد ۴/۰
- جنگ اصفہان ،،
- سنگدل ملکہ مکمل ۴/۸
- نقاب پوش پیغمبر ،، ۴/۰
- شیر سوڈان ،، ۴/۰

نئی کتابیں

- آدمی اور انڈے موپساں ۱/۱۲
- ادبی اور قومی تذکرے کشن پرشاد کول ۴/۰
- اردو ساہتیہ کا اتہاس احتشام حسین ۶/۰
- دعمیدہ منور لکھنوی ۳/۰
- سریلے بول ڈاکٹر مسعود حسین ۱/۸
- گیت اور چیخ ہربنس سنگھ دوست ۱/۱۲
- ہم امن چاہتے ہیں ،، ۵/۱۲
- لطف شادی تیرتھ رام فیروزپوری ۲/۸
- لطف صحت ،، ۲/۸
- پراسرار قافلہ لال ٹینلے گارڈنر ۲/۰
- ہندوستانی سماجیات ڈاکٹر جعفر حسین ۶/۰
- ملک دیکھے شہزادے ڈاکٹر اعجاز حسین ۲/۸

مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی ۶

طنز و مزاح

عظیم بیگ چغتائی			قدرداں	افسانے	۰/۱۲/۰	سسرال	ناول	۲/۰/۰	جوڑ توڑ	ناول	۴/۰/۰
خانم	ناول	۴/۰/۰	**پطرس**			مونڈی کاٹے	〃	۱/۸/۰	**ابراہیم جلیس**		
جنت کا بھوت	〃	۰/۱۲/۰	مضامین پطرس		۲/۸/۰	برجیس	〃	۲/	دو ملک ایک کہانی	طنزیہ	۲/۸/۰
لفٹنٹ	〃	۱/۰/۰	**رتن ناتھ سرشار**			شیطان کی ڈائری	〃	۱/۸/۰	ذرا ایک منٹ	〃	۳/۰/۰
کھرپا بہادر	〃	۲/۴/۰	سیر کہسار		۶/۰	گرگٹ	〃	۱/۸/۰	جیل کے دن اور جیل کی راتیں	〃	۳/۸/۰
شریر بیوی	〃	۲/۰/۰	خوجی		۲/۸/۰	برق تبسم	〃	۳/۰/۰	کالا چور	〃	۱/۸/۰
روح ظرافت	افسانے	۲/۰/۰	**رشید احمد صدیقی**			محمد خاتون	〃	۱/۸/۰	پبلک سیفٹی ریزر	〃	۱/۸/۰
خطوط کی ستم ظریفی	〃	۰/۱۰/۰	ہیل کی سرگذشت		۳/۱۲/۰	مسکراہٹیں	〃	۲/۸/۰	**شفیق الرحمن**		
دانہ کی روحیں	〃	۰/۱۲/۰	ذاکر صاحب		۱/۰/۰	نورتن	〃	۲/۸/۰			
چینی کی انگوٹھی	〃	۱/۰/۰	**شوکت تھانوی**			انشاء اللہ	〃	۲/۱۲/۰	کرنیں	افسانے	۴/۰/۰
مرزا جنگی	〃	۰/۸/۰	بیوی	ناول	۳/۱۲/۰	خدانخواستہ	〃	۳/۰/۰	لہریں	〃	۴/۰/۰
فرزند سرحد	〃	۰/۶/۰	سانچ کو آنچ	〃	۴/۸/۰	بکواس	〃	۲/۸/۰	پرواز	〃	۴/۰/۰
قرض مقراض محبت	〃	۰/۶/۰	بقراط	〃	۲/۴/۰	سپنے	〃	۳/۰/۰	مزید حماقتیں	〃	۶/۰/۰

مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی

مکتبۂ شاہراہ دہلی

سے

آپ ہندوستان و پاکستان کی جملہ ادبی، سیاسی، مذہبی سماجی، افسانوی اور جاسوسی مطبوعات طلب فرما سکتے ہیں۔ مکتبہ بڑے فخر سے اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ نایاب اور زیر طبع کتب کے علاوہ جملہ کتب سپلائی کر سکتا ہے۔ اپنی لائبریریوں کی ایک بار پڑتال کر کے ہمیں یاد فرمائیے۔

کیا "شاہراہ" کا فائل مکمل ہے؟

اگر نہیں تو تکلیف فرمائیے۔ لکھئے کہ کن کن مہینوں کے اور کس سال کے پرچے آپ کے پاس نہیں۔ ہمارا "شاہراہ" کے دفتر سے فی الحال تو پرچے سپلائی کئے جا سکتے ہیں۔ چند پرچے اور رہ گئے ہیں۔ بعد میں ہم مجبور ہو جائیں گے اور آپ کا فائل نامکمل رہ جائے گا۔ پرانے پرچے پوری قیمت پر مہیا کئے جائیں گے۔

منیجر شاہراہ اُردو بازار۔ دہلی

ادبی اور علمی کتابیں

تاریخ مثنویات اُردو :- از مولوی جلال الدین احمد جعفری، اُردو مثنوی کی تاریخ و تنقید مع انتخاب مثنویات - قیمت :- ۳/۰

تاریخ قصائدِ اُردو :- از مولوی جلال احمد جعفری - اردو قصیدہ کی تاریخ و تنقید مع انتخابِ قصائد - قیمت :- ۳/۰

تاریخ ریختی :- از مولوی محمد مبین - ریختی کی تاریخ و تنقید مع دیوان جان صاحب - قیمت :- ۲/۰

انتخاب کُلیاتِ نظیر اکبر آبادی :- از مولوی جلال الدین احمد جعفری - نظیر اکبر آبادی کے کلام کا بہترین انتخاب - جو تقریباً ۴۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے - اور جس میں ۸۶ صفحات کا مفید مقدمہ بھی شامل ہے - قیمت ۳/۰

اکبر الہ آبادی :- از طالب الہ آبادی - اکبر الہ آبادی کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تبصرہ جس میں ان کے کلام کا بہترین انتخاب بھی شامل ہے - حجم ۲۰/۸ × ۲۶ تقطیع کے تقریباً ۴۰۰ صفحات - قیمت ۵/۰

نظم لطیف :- از مولوی جلال الدین احمد جعفری - جدید طرز کے عنوانات پر شاعروں کے کلام کا بہترین انتخاب قیمت :- ۴/۰

تحقیقات :- ڈاکٹر عندلیب شادانی کے تنقیدی مضامین، آزاد نظم مختصر افسانہ میر صاحب کا ایک خاص رنگ - جوش کی دولسانی غلطیاں - خواجہ حافظ اور شرابِ شاہد - پاکدامن رضیہ اور مورخین التمش کی لغوی تحقیق وغیرہ کا مجموعہ - قیمت :- ۴/۴ (چار روپے چار آنے)

مُلکِ اَدب کے شہزادے :- ڈاکٹر اعجاز حسین - اِس کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اردو کے چالیس ممتاز شعراء کے خدّ و خال حرکات و سکنات کو مد نظر رکھ کر رائے زنی کی گئی ہے - اور ان کے کلام پر تنقید کی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ شاعر بحیثیت فن کا اور انسان کے خدا واضح طور پر سامنے آجائے - قیمت مجلد معہ گرد پوش ۲/۴

اُردو شاعروں کا البم :- مرتبہ زیدی - دہلوی - اس میں اُردو سب سے پہلے شاعر امیر خسرو دہلوی سے لے کر عصرِ جدید تک کے نامی گرامی شعراء کی تصاویر - عکسِ تحریر - حالات اور کلام کا انتخاب - یہ مصوّر تذکرہ شعرائے اُردو اور البم آرٹ پیپر پر بلاک چھاپا گیا ہے - قیمت :- ۲/۸

میر تقی میر :-	خواجہ احمد فاروقی -	قیمت :-	۱۲/۰
باپو کے قدموں میں :-	راجندر پرشاد	"	۱۵/۰
مشترکہ زبان :-	مہاتما گاندھی	"	۴/۰
مذہب اور دھرم :-	"	"	۴/۸
پرچھائیں :-	آصف علی	"	۴/۰
یادگارِ حالی :-	صالحہ عابد حسین	"	۴/۸
حیاتِ اجمل :-	قاضی عبد الغفار	"	۸/۰
حیاتِ سر سیّد :-	نور الرحمٰن	"	۳/۸
کچھ زر کی بابت :-	ابو سالم	"	۴/۸
ادبی اور قومی تذکرے :-	کشن پرشاد کول	"	۶/۸
احوالِ غالب :-	مختار الدین احمد	"	۹/۰
کاروانِ معیشت :-	نجم الدین شکیب	"	۶/۸
مرقعِ افغان :-	ابرار حسین	"	۳/۶
محاسنِ کلامِ غالب :-	ڈاکٹر عبد الرحمٰن	"	۱/۶

فلسفہ کلامِ غالب :- پروفیسر سید شوکت سبزواری نے اس کتاب میں غالب کی فلسفیانہ اور شاعرانہ حیثیت پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دراصل ایک ہی چیز ہے اور اس سلسلہ میں غالب کے نظریۂ حیات، تصورات، اخلاقی موضوعات اور جمالیاتی تصورات کے متعلق بحث کی ہے اور گفتگو میں اس بالغ نظری سے کام لیا ہے جو شاید ایوانِ غالب میں شاید ہی کسی طرف سے اس وقت تک ظاہر ہوئی ہے - قیمت ۳/۴ نیاز فتحپوری

مکتبہ "شاہراہ" اردو بازار - دھلی

MÍRZÁ FARHATULLÁH BÉG
IN HIS YOUTH AND MIDDLE AGE

Regd. No. D—164